Registered No. A-1104.

(فہرست مضامین آخری صفحہ پر درج ہے)

نگار

قیمت فی کاپی دو روپیہ

نرخنامۂ اجرت اشتہار

	ایکسال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۷۵ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۹ روپیہ
آدھا صفحہ	۵۰ ”	۲۵ ”	۱۳ ”	۷ ”
چوتھائی صفحہ	۲۵ ”	۱۳ ”	۷ ”	۳ ”

(۱) اجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔ وی پی یا دی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں۔

(۲) جتنی مدت کیلئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اسکی رقم پیشگی یکمشت لی جائیگی۔

ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا

(۳) اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

مینیجر

نگار کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ ششماہی ہندوستان کے اندر تین روپیہ

” بیرون ہند آٹھ روپے ” بیرون ہند پانچ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۵۔ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے۔ ۲۵۔ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ بعد کو ۸ ر فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی

مینیجر

حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

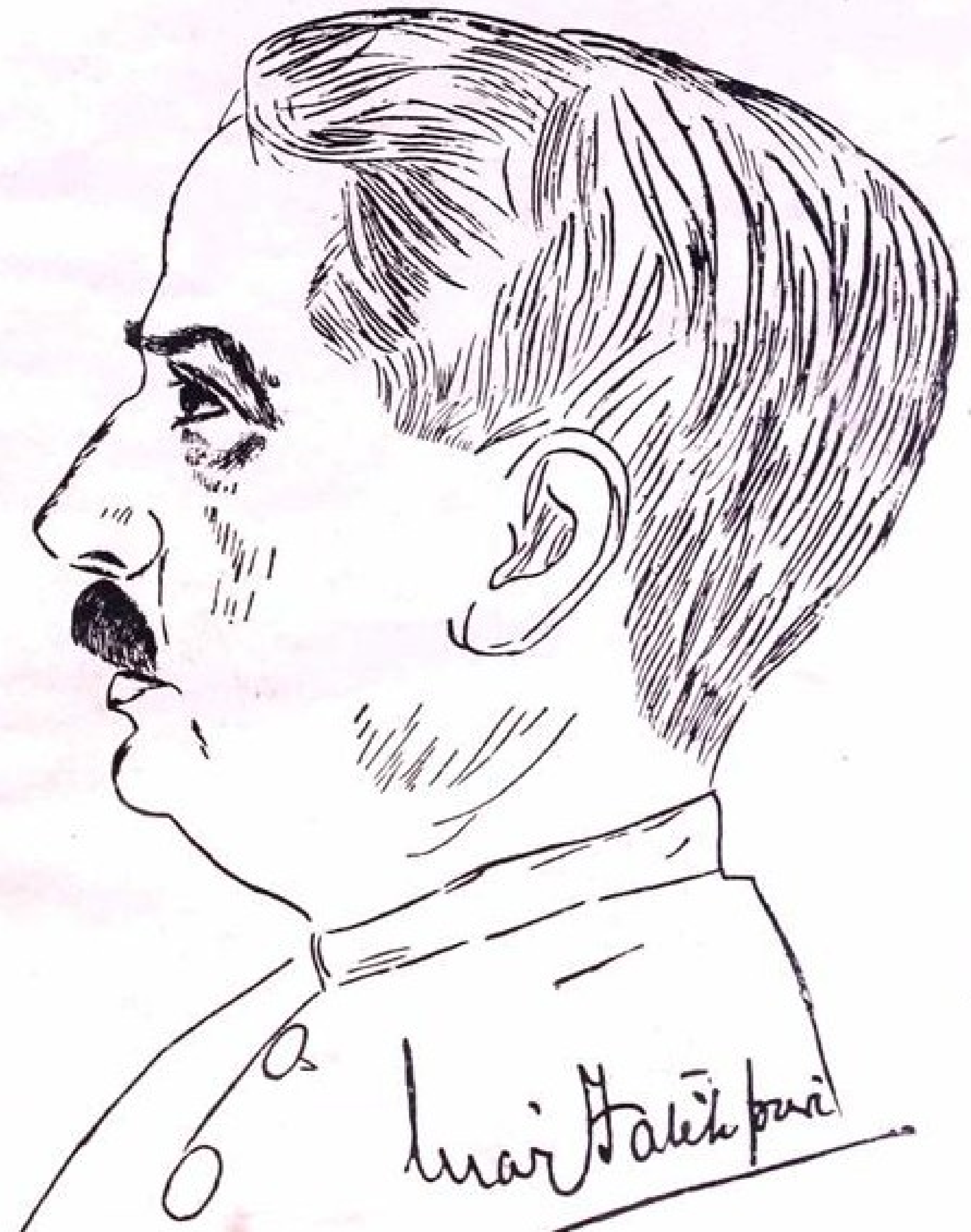

اردو شاعری

نگار

اڈیٹر - نیاز فتحپوری

جلد ۲۷	جنوری ۱۹۳۵ء	شمارہ ۱

اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ

اس مقالہ کا موضوع صرف تاریخی تبصرہ ہے یعنی صرف یہ بتانا کہ کس عہد میں کون کون سے شاعر پیدا ہوئے۔ ہر چند تنقید اس موضوع سے بالکل علحدہ ہے اور اصولاً اس مضمون میں اس کی جستجو نکرنا چاہیے، تاہم سلسلۂ کلام میں اپنی رائے بھی ظاہر کرتا گیا ہوں۔

میاں نظام شاہ رام پوری، افسوس، ہوس اور سوز پر چونکہ اس سے قبل نگار میں تفصیلی مضامین تنقید و انتخاب سے متعلق شایع ہو چکے ہیں اور مومن، غالب، وظفر پر مستقل نمبر نکل چکے ہیں اسلئے انکا کلام صرف تبرکاً اس مضمون میں درج کر دیا گیا ہے

اسی طرح متاخرین میں بعض نہایت مشہور شعراء کے صرف چند شعر بغیر کسی خاص خیال کو سامنے رکھے ہوئے جو یاد آگئے درج کردیے گئے ہیں اور شعرائے حال کا کلام بالکل پیش نہیں کیا گیا، اس مضمون کی تیاری میں علاوہ تاریخ ہند تاریخ دکن اور تمام مشہور و متداول تذکروں کی خصوصیت کے ساتھ میں نے جلوۂ خضر، نکات الشعراء، تذکرۂ میر حسن، گل رعنا شعر الہند، آب حیات، اور تاریخ ادب اردو سے زیادہ مدد لی ہے۔

اس مقالہ سے مدعا اُردو شاعری کی تاریخ کو مختصر سے مختصر الفاظ میں نوری حوالہ کے طور پر اس طرح پیش کرنا ہے کہ لوگوں کو تذکرے نہ دیکھنا پڑیں اور طلبہ کو استفادہ میں آسانیاں پیدا ہو جائیں، عام طور پر تذکروں میں شعراء کے سنین پیدائش و وفات کا پتہ نہیں چلتا کیونکہ متقدمین اس کا ذکر ضروری نہ سمجھتے تھے، تاہم جہاں تک ممکن ہو سکا ہے پوری جستجو کرکے ان کا زمانہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (نیاز)

فرض کیجیے آپ کے باغ میں ایک تناور درخت کھڑا ہے اور کوئی شخص سوال کرے کہ اس درخت کی تاریخ پر روشنی ڈالیے تو آپ کو یقیناً اُس کے تین حصے کرنے پڑیں گے، ایک وہ زمانہ جب اس کا تخم ڈالا گیا تھا دوسرا وہ جب زمین سے اس تخم نے سر نکالا اور کونپلیں پھوٹیں، تیسرا وہ جب اس میں پھول پھل آئے،

اسی طرح اگر کوئی شخص زبان اُردو کی تاریخ سے بحث کرے گا تو اس کو بتانا پڑے گا کہ اس کی بنیاد اول اول کب پڑی اس کے بعد اس کی جداگانہ ہیئت کس وقت نمایاں ہوئی اور پھر یہ کہ اس کا مستقل وجود کب قائم ہوا، بالکل یہی صورت اُردو شاعری سے بحث کرنے کی ہوگی، لیکن چونکہ کسی زبان کی شاعری حقیقتاً ارتقائی منزل کی چیز ہے اس لیے لامحالہ اس کو تاریخ زبان کے دوسرے دور سے متعلق کرنا پڑے گا اور اس طرح گویا زبان اور شاعری میں پورے ایک دور کا فرق پڑ جائے گا،

اس جگہ یہ بحث ہمارے موضوع سے علٰحدہ ہے کہ اُردو زبان کی بنیاد کس زمانے میں پڑی، لیکن اگر اصولاً یہ صحیح ہے کہ دو مختلف قوموں کا باہمی اختلاط ایک ملک کی زبان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا تو اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں کہ زبان اُردو کی بُنیاد سب سے پہلے وہ حملہ تھا جو شاہان اسلام نے ہندوستان پر کیا، ہر چند ان حملوں کی صورت ایک زمانے تک صرف قزاقانہ رہی اور لوٹ مار کرکے چلے جانے کی حد سے گزر کر حملہ آوروں نے کسی سلطنت کی بنیاد یہاں قائم نہیں کی، لیکن یہ ناممکن ہے کہ ان حملوں کے دوران میں وہ اپنی ترکی و تازی کے کچھ الفاظ یہاں چھوڑ نہ گئے ہوں اور میرے نزدیک یہی وہ اولین تخم ریزی تھی، جو عرصہ تک عدم آبیاری کی وجہ سے کوئی نتیجہ نہ پیدا کر سکی، لیکن بعد کو جب رفتہ رفتہ شاہان اسلام نے یہاں قیام کرکے مستقل سلطنتیں بنائیں اور باہمی میل جول بڑھنے لگا تو اس تخم کی نشو و نما کے آثار شروع ہوئے اور برج بھاشا میں (جو خود آرین اقوام کی اصل زبان سنسکرت اور ہندوستان کے

اصلی باشندوں کی زبان سے مل کر تیار ہوئی تھی) فارسی و ترکی الفاظ کی آمیزش اس حد تک ہوگئی کہ آخر کار خلجیوں کے عہد میں اس درخت کی سب سے پہلی کلی امیر خسروؒ کی صورت میں نمودار ہوئی) ہم نے امیر خسرو کا نام خصوصیت کے ساتھ اس لیے لیا کہ انھوں ہی نے سب سے پہلے فارسی آمیز برج بھاشا میں انشا و شاعری کی ابتدا کی ورنہ یوں تو جہاں تک صرف فارسی و ادبی الفاظ کا تعلق ہے غوریوں ہی کے عہد میں وہ برج بھاشا میں دخیل ہوگئے تھے اور اس کا ثبوت چند کوئی ہندی شاعر کی اس تصنیف سے ملتا ہے جو شہاب الدین غوری کے حملہ کے بعد پرتھی راج رائے کے نام سے اس نے لکھی تھی آزاد نے آب حیات میں اس کا ایک کبت لکھ کر بتایا ہے کہ الفاظ محل، پروردگار، کریم، سلطان، پیغام، بادشاہ، زمان، سلام، حضرت وغیرہ کس آزادی سے استعمال کیے ہیں اس کے بعد لودیوں کے زمانے تک کوئی خاص پتہ اس امر کا نہیں چلتا کہ فارسی کا رواج کس حد تک وسیع ہوا (البتہ سکندر لودی کے زمانے (۱۴۸۹ء - ۱۵۱۰ء) میں ہندوؤں اور خاص کر کائستھوں نے فارسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور دکھاتر وغیرہ میں ملازمتیں اختیار کیں، ظاہر ہے کہ اس کے بعد فارسی الفاظ اور زیادہ بھاشا میں ملے ہوں گے، چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کو کبیر کے دوہوں، گرو نانک کی تصانیف، تلسی داس کی رامائن، سور داس کے کلام اور ملک محمد جائسی کی پدماوت میں بکثرت الفاظ فارسی و عربی کے نظر آتے ہیں)

(لودیوں کے بعد دور مغلیہ شروع ہوا تو یقیناً ہندوستان کی عام زبان برج بھاشا سے بدل کر بہت کچھ نئی چیز ہوگئی اور جس طرح ہندو عربی فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرنے لگے تھے مسلمانوں نے بھی ہندی الفاظ کو اختیار کر لیا تھا) چنانچہ حد یہ ہے کہ بابر جو تازہ تازہ ہندوستان آتا ہے وہ بھی اس سے نہیں بچ سکتا اور اپنے ایک شعر میں پانی، روتی، (رُوٹی) موتی، رچ (کچھ) اور مجکا (مجھکو) کے الفاظ استعمال کرتا ہے

---

۵ امیر خسرو کے فارسی ہندی آمیز کلام میں علاوہ عاشقانہ اشعار کے پہیلیاں، کہ مکرنیاں، دو سخنیاں وغیرہ بہت سی چیزیں ظاہر کیجاتی ہیں اور بعض بعض تو اتنی صاف اردو میں ہیں کہ تعجب آتا ہے مثلاً ان کی دو سخنی ہے

گوشت کیوں نہ کھایا، ڈوم کیوں نہ گایا ؟ ——— گلا نہ تھا

مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے کہ یہ امیر خسرو کے زمانہ کی اردو ہو سکتی ہے، البتہ اُن کی بتیاں، چھتیاں والی مشہور غزل بیشک اس وقت کی زبان ہو سکتی ہے، یا پھر پہیلیاں کہ اُن کی زبان بھی تقریباً ہندی بھاشا ہے، اُن کی غزل کے بعض اشعار یہ ہیں، —

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں | کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر | نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آئے نہ بھیجے بتیاں

ہمایوں کے عہد میں ملک محمد جائسی کی پدماوت کافی شہادت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں میں برج بھاشا کا رواج کس حد تک ہوگیا تھا اور اس میں فارسی کے کتنے الفاظ شامل ہوگئے تھے، اس کے بعد جب (اکبر[1] کا عہد آیا تو یہ اختلاط بڑھنا ہی تھا کیونکہ وہ تو ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر خود بھی آدھا ہندو ہوگیا تھا اور سیکڑوں الفاظ برج بھاشا کے، فارسی رقعات و فارسی فرامین اور روز کی گفتگو میں استعمال ہونے لگے تھے۔)

(اس کے بعد عہدِ جہانگیر[2]، شاہجہاں، اورنگ زیب[3] میں اور زیادہ ترقی ہوئی) چنانچہ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں دو شاعروں فوری اور غواصی کا ذکر کیا ہے جو جہانگیر کے عہد میں پائے جاتے تھے (شاہجہاں کے زمانے میں لشکری زبان کا نام ہی اردو ہوگیا، اور اورنگ زیب کے رقعات دیکھو تو تم کو سیکڑوں الفاظ برج بھاشا کے ملیں گے) تذکرۂ آب حیات و گل رعنا میں اس عہد کے بہت سے ہندی الفاظ اقتباس کر کے لکھ دیے ہیں اور ہر شخص ان کو دیکھ سکتا ہے،

---

[1] تذکرۂ جلوۂ خضر میں اکبر کی ایک رُباعی بھی نقل کی ہے، جہانگیر نے جب ابوالفضل کو قتل کرا دیا تو اکبر کو بہت رنج ہوا اور جہانگیر سے خفا ہوگیا اس کے بعد آخر کار باپ بیٹے میں جب صلح ہوئی اور اکبر نے جہانگیر کو بلایا تو اس نے لکھا کہ کوئی اچھی ساعت دکھلا کے اطلاع دیں تاکہ میں پاس آن حاضر ہوں اس پر اکبر نے یہ رباعی لکھ بھیجی :۔

بو چھی جو گھڑی مجھ سے براہ عادت — تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت — ساعت کا بہانا نہیں، خوش ہر ساعت

لیکن میرے نزدیک اس کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور ممکن نہیں کہ اکبر اتنی صاف اردو لکھ سکتا ہو اور وہ بھی شعر کی صورت میں!

[2] صاحب تذکرۂ جلوۂ خضر کو جہانگیر کی مشہور بیوی نور جہاں بیگم کے دو شعر کسی بیاض میں ملے ہیں چنانچہ ایک شعر یہ ہے :۔

دیں جگہ زخم جفا کو دلِ صد چاک میں ہم — دیکھیں گر کچھ بھی وفا اُس بُتِ بیباک میں ہم

اس کے معنی یہ ہیں کہ نور جہاں داغ کی شاگرد تھی!

[3]

تذکرۂ جلوۂ خضر میں کسی پُرانی بیاض کے حوالے سے زیب النسا بیگم دختر عالمگیر کے بھی چند اشعار نقل کیے گئے ہیں، دو شعر یہ ہیں :۔

جس طرح لگی دل کو مرے چاہ کسو کی — اس طرح نہ لگیو مرے اللہ کسو کی
ہر ایک پہ تم جور جو کرتے ہو پیارے — دھڑکے ہے مرا دل، نہ لگے آہ کسو کی

مجھے اس کی صحت میں بھی تامل ہے

عہد مغلیہ کے فارسی شعرا بھی اپنے کلام میں اکثر الفاظ ہندی کے مثلاً ہار، چنبیلی، راگ، دھوبی، تنبولی، اگر بل، مولسری، پٹھان وغیرہ استعمال کرنے لگے تھے (الغرض سنہ ۱۰۰۱ء سے لے کر (جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر پہلا حملہ کیا) عہد اکبری (سنہ ۱۵۵۶ء) تک، آہستہ آہستہ فارسی اور برج بھاشا ایک دوسرے کے ساتھ مانوس ہوتی گئیں، یہاں تک کہ دور مغلیہ میں یہ انس تقریباً معانقہ کی حد تک پہنچ گیا اور محمد شاہ کے زمانہ (سنہ ۱۷۱۹ء سے سنہ ۱۷۴۸ء) تک تو ایک نومولود (ریختہ) بھی اس مواصلت سے ظہور میں آگیا جس نے شاہ عالم کے عہد میں نشو و نما پائی، بہادر شاہ ظفر کے عہد (سنہ ۱۷۵۰ء سے سنہ ۱۷۷۰ء) تک جوان ہوا اور پھر لکھنؤ پہنچ کر پورے نکھار پر آیا) اس میں شک نہیں کہ ترقی کی یہ رفتار کوئی قابل فخر بات نہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مسلمانوں کے اولین حملہ کے بعد پانچ چھ سو سال کا طویل زمانہ اسی حالت میں گزر جانا کہ سوائے چند الفاظ کے اختلاط کے کوئی اور نمایاں فرق تشکیل زبان کے باب میں نظر نہ آئے حیرتناک امر ہے، لیکن اس کا سبب وہی تھا جو ہمیں آج بھی عہد برطانیہ میں نظر آتا ہے اور غالباً ہر جگہ جہاں غیر ملکی حکومتیں قائم ہوئیں یہی صورت پیدا ہوئی ہوگی،

اول تو ابتدا میں مسلمانوں نے یہاں کوئی مستقل حکومت قائم نہیں کی، حملہ کیا اور لوٹ مار کر چلے گئے، لیکن جب بعد کو سلطنت قائم ہوئی بھی تو حالت یہ تھی کہ پے درپے حکمران خاندان بدلتے گئے اور کسی نئی قائم ہونے والی حکومت کو اپنی پیشرو حکومت سے کوئی ہمدردی نہ پیدا ہوسکی، چنانچہ سنہ ۱۰۰۱ء (حملۂ محمود غزنوی) کے بعد سنہ ۱۵۲۶ء تک جب بابر نے لودیوں کو شکست دے کر سلطنت مغلیہ کی بنیاد قائم کی، پورے سات خاندان (غزنوی، غوری، غلام، خلجی، تغلق، سید، لودی) علحدہ علحدہ یہاں حکمرانی کر چکے تھے اور سب کے سب غیر ملکی تھے، پھر ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت جبکہ جم کر کسی ایک خاندان کو حکومت قائم کرنے کا موقع نہ ملا ہو اور ہر خاندان نے اپنے آپ کو فاتح و برتر سمجھ کر ملک کے لوگوں اور ان کے اوضاع و اطوار معیشت و معاشرت سے علحدہ رہنا ہی مناسب سمجھا ہو، زبان میں کیا تغیر پیدا ہوسکتا تھا، البتہ جب عہد مغلیہ شروع ہوا تو سب سے پہلے اکبر نے اس الگ تھلگ رہنے کی بدعت کو توڑا لیکن حکومت کی زبان بدستور فارسی ہی رہی اور ایسا ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس وقت تک اردو نے اپنی کوئی جداگانہ حیثیت قائم ہی نہ کی تھی کہ وہ اس کی جگہ لے لیتی، انگریزی حکومت پر نگاہ ڈالیے تو وہاں بھی آپ کو یہی بات نظر آئے گی، وہی اہل ملک سے بیگانہ وار زندگی بسر کرنا، اپنے آپ کو بلند و برتر جان کر ہندوستانیوں سے اختلاط پیدا کرنے کو معیوب سمجھنا اپنی وضع و قطع کو بالکل علحدہ رکھنا اور ہمیشہ اپنی ہی زبان میں لکھنا پڑھنا آج بھی ہمیں نظر آتا ہے؛ الغرض ہندوستان میں مسلمانوں کی مرکزی حکومت (دہلی) تو اس عصبیت یا سیاسی مصلحت کی وجہ سے کوئی خدمت زبان کی نہ کر سکی، لیکن اطراف میں چونکہ حالات مختلف تھے اس لیے وہاں ہم کو یہ بات نظر نہیں آتی،

تاریخ ہندوستان کے مطالعہ سے واضح ہے کہ نقل و حرکت کے ذرائع وسیع و عام نہ ہونے کی وجہ سے مرکزی حکومت دور دراز

صوبوں کو کبھی اپنے اقتدار میں نہ رکھ سکی اور رفتہ رفتہ وہاں مستقل حکومتیں بنگال، جونپور، مالوہ، گجرات میں قائم ہو گئیں[لہ] لیکن زبان کا جہاں تک تعلق ہے دکن کی عادل شاہی اور قطب شاہی خاص طور پر قابل ذکر ہیں

لہ (بنگال) یہ صوبہ محمد غوری کے زمانے (۱۱۹۷ء) میں فتح ہو گیا تھا لیکن چونکہ مرکزی حکومت سے بہت دور واقع تھا اسلیے مغلوں کے زمانہ میں بعہد بلبن یہاں کے حاکم طغرل بیگ نے بغاوت کی اور خود مختار ہو گیا، بلبن نے اسکو شکست دیکر اپنے لڑکے بغرا خاں کو وہاں کا حاکم مقرر کیا اور اسکی اولاد نے عرصے تک یہاں حکومت کی، عہد محمد شاہ تغلق میں بنگال بالکل خود مختار ہو گیا (۱۳۳۸ء) ہر چند بعد کو فیروز تغلق نے پھر اسکے فتح کرنیکی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا اسکے بعد سیدوں اور لودیوں کے زمانے میں کسی نے بنگال کی طرف توجہ نہ کی، بعد کو بابر نے بھی حملہ کیا لیکن صلح ہو گئی، اسکے بعد شیر شاہ نے یہاں کی حکومت کو اپنے اختیار میں لے لیا اور اکبر نے ۱۵۷۵ء میں پھر اس کو مسخر کر لیا، اس کے بعد سے یہ صوبہ برابر مغلیہ سلطنت کا ایک جزو رہا لیکن جب ۱۶۹۶ء میں ہندو زمینداروں نے بلوہ کیا تو مغلی صوبیدار نے انگریز، فرانسیسی اور ڈچ تاجروں کو اجازت دیدی کہ اپنی نوآبادیاں محفوظ رکھنے کے لیے انکے گرد فصیلیں اور مورچے بنا لیں، چنانچہ انگریزوں نے قلعہ فورٹ ولیم تیار کر لیا ہے ۱۷۴۲ء میں جب مرہٹوں نے بنگال پر حملہ کیا تو انگریزوں نے نواب علی وردی خاں کی اجازت سے اپنی حفاظت کیلیے قلعہ کے گرد خندق کھودڈالی اسکے بعد جنگ پلاسی میں بالکل انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔

(جونپور) اس شہر کی بنیاد فیروز تغلق نے ۱۳۶۰ء میں قائم کی ہے ۱۳۹۴ء میں محمود تغلق نے ایک خواجہ سرا کو مشرقی حصہ کا انتظام کرنے کیلیے یہاں روانہ کیا بعد اسکو خواجہ جہاں کا خطاب ملا، اس نے رفتہ رفتہ قنوج، کڑا، بہرائچ، بہار و ترہٹ وغیرہ فتح کرکے اڑیسہ اور لکھنوتی کے راجاؤں سے خراج وصول کیا اور تیمور کے حملہ کے بعد خود مختار ہو گیا، اسکے بعد اسکا بھائی ابراہیم تخت نشین ہوا (۱۴۰۱ء تا ۱۴۴۰ء) اور اسکے عہد میں سلطنت جونپور کو بڑی ترقی حاصل ہوئی، یہاں کا آخری خود مختار بادشاہ حسین شرقی تھا ۱۴۷۶ء میں بہلول لودی نے اسکو شکست دیکر اپنے بیٹے باربک شاہ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا لیکن بعد کو سکندر لودی نے باربک شاہ کو نکال کر پھر سلطنت دہلی کی سرحد میں شامل کر دیا، پندرھویں صدی میں جونپور علوم و فنون کا مرکز تھا، شاہ حسین شرقی خود بھی بڑا فاضل شخص تھا اور علماء و فضلاء کی بڑی قدر کرتا تھا، وہ شعر بھی کہتا تھا اور موسیقی کا [illegible]

(مالوہ) سب سے پہلے علاؤالدین خلجی نے ۱۳۱۰ء میں اس کو فتح کیا اور دہلی کا ماتحت صوبہ بنالیا، تیمور کے حملہ کے بعد دھار کا جاگیردار دلاور خاں خود مختار بن گیا اور اس نے مالوہ کو بھی اپنے قلمرو میں شامل کر لیا، اسکے بیٹے ہوشنگ نے دارالخلافت اُجین سے مانڈو کر دیا ۱۴۳۵ء میں محمود خلجی نے اس خاندان کا استیصال کرکے قبضہ کر لیا ۱۵۳۱ء میں گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ نے مالوہ فتح کرکے گجرات میں شامل کر لیا، جب اکبر نے دکن پر فوج کشی کی تو اسی سلسلہ میں مالوہ اور خاندیس کو بھی مسخر کرکے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا (۱۶۰۱ء)

(گجرات) سب سے پہلے ۱۱۹۶ء میں قطب الدین ایبک نے گجرات پر فوج کشی کی اور اس وقت سے یہ صوبہ برابر دہلی کا ماتحت رہا لیکن تیموری حملہ کے وقت یہاں کا حاکم ظفر خاں خود مختار ہو گیا اور مظفر شاہ کا لقب اختیار کیا، اسکا پوتا احمد شاہ (۱۴۱۱ء - ۱۴۴۱ء) بڑا زبردست شخص تھا اسلیے مالوہ اور اسیر گڑھ وغیرہ قرب و جوار کے ممالک کو فتح کرکے اپنی سلطنت کو بہت وسیع کر لیا اور شہر احمد آباد بسایا، اس خاندان میں سلطان محمود خاص شہرت کا مالک ہوا (۱۴۵۹ء تا ۱۵۱۱ء) گجرات کا آخری حکمراں بہادر شاہ (۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۷ء) تھا جس نے چتوڑ کا قلعہ سر کیا، آخر اکبر نے ۱۵۷۳ء میں گجرات فتح کرکے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

مسلمانوں کے حملہ سے قبل دکن میں کئی ہندو ریاستیں پائی جاتی تھیں، مشرق میں جسے تلنگانہ کہتے تھے اندھرا خاندان حکمراں تھا، اور ورنگل اس کا پایۂ تخت تھا، مہاراشٹر میں یادو راجپوت حکمراں تھے اور کرناٹک میں بلال راجپوت کی حکومت تھی، دوار سمدر اُن کا صدر مقام تھا، انکے علاوہ اور بھی کئی ریاستیں تھیں،

سب سے پہلے علاؤالدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا اور دیوگیر کے راجہ رام دیو کو مغلوب کرکے بڑی کثیر دولت اپنے ساتھ لے گیا، اس کے بعد اس کے سپہ سالار کافور نے دکن پر فوج کشی کی اور ورنگل، دوار سمدر اور مدورا وغیرہ فتح کرکے ان سب سے خراج وصول کیا، ۱۳۱۸ء میں دیوگیر کا راجہ باغی ہو گیا تو قطب الدین مبارک شاہ نے پھر اس کو مغلوب کرکے سخت سزا دی،

جب سلطنت دہلی کمزور ہوئی تو یہاں سے خراج جانا بند ہو گیا، لیکن محمد تغلق نے جو ۱۳۲۵ء میں تخت نشین ہوا تھا دو سال کے اندر پھر سارے دکن کو مطیع کر لیا، ۱۳۳۴ء کے بعد مرکزی حکومت میں بدنظمی شروع ہوئی تو ایک طرف ۱۳۳۶ء میں ریاست وجیانگر قائم ہوئی اور دوسری طرف حسن کانگو افغان سردار خود مختار بادشاہ بن بیٹھا، اور گلبرگہ کو اپنا صدر مقام بنایا، اس نے اپنا لقب بہمنی اسلیے اختیار کیا کہ وہ اپنا سلسلۂ نسب فارس کے بادشاہ بہمن سے ملاتا تھا، فرشتہ نے یہ بالکل غلط لکھا ہے کہ وہ کانگو نامی برہمن کے یہاں نوکر تھا اور پھر اس نے بادشاہ ہو کر کانگو کے احسانات کے اعتراف میں بہمنی لقب اختیار کیا، قلعۂ گلبرگہ میں ایک کتبہ ملا ہے جس میں اس کا نام "حسن کانگو بہمن شاہ" درج ہے

اس وقت دکن میں وجیانگر اور بہمنی دو حکومتیں برابر کی تھیں ایک ہندوؤں کی دوسری مسلمانوں کی، لیکن وجیانگر نے آہستہ آہستہ بڑی ترقی کر لی اور دونوں ریاستوں میں عرصہ تک جنگ جاری رہی، محمد شاہ سوم (۱۴۶۳ء تا ۱۴۸۲ء) کے زمانے میں بہمنی خاندان کا زوال شروع ہو گیا لیکن اس کے وزیر محمود گاواں نے اپنی غیر معمولی قابلیت سے سنبھالے رکھا جب سازش کرکے اس کو قتل کرا دیا گیا تو سلطنت بھی ختم ہو گئی اور بہمنی سلطنت پانچ خود مختار ریاستوں میں تبدیل ہو گئی،

(۱) بیدر میں بریدشاہی ریاست (+2 (1

(۲) بیجاپور میں عادل شاہی (1489 – 1686)

(۳) احمد نگر میں نظام شاہی (+5

(۴) گولکنڈہ میں قطب شاہی (1618 – 87)

(۵) برار میں عماد شاہی

ان میں سے عماد شاہی حکومت (برار) کی ۱۵۷۴ء میں احمد نگر میں شامل ہو گئی اور احمد نگر کی حکومت پر چاند سلطانہ کی انتہائی کوشش کے باوجود اکبر نے قبضہ کر لیا، اسی طرح بیدر کی ریاست کو بیجاپور کے فرمانروا نے اپنے قلمرو میں شامل کر لیا تھا، اور اب گویا صرف دو قابل ذکر حکومتیں دکن میں رہ گئی تھیں ایک بیجاپور کی عادل شاہی اور دوسری گولکنڈہ کی قطب شاہی جنکو اورنگزیب نے آکر درہم برہم کیا (قطب شاہی حکومت ۱۶۱۸ء سے ۱۶۸۷ء تک قائم رہی اور عادل شاہی حکومت ۱۴۸۹ء سے ۱۶۸۶ء تک، گویا ایک سال

آگے پیچھے دونوں کو اورنگ زیب نے ختم کر دیا۔ یہ دونوں حکومتیں علم و فضل کی بہت قدر دان تھیں اور فنون کی ترقی میں کافی حصہ لیتی تھیں عادل شاہی حکومت کا پانچواں فرمانروا (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۶ء) ابراہیم عادل شاہ ثانی چونکہ نو سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور تمام انتظام دکنی امرا کے ہاتھ میں تھا اس لیے اس کی فطرت بہت کچھ ہندوستانی رہی اور موسیقی کا اتنا شوق اس کو ہوا کہ تمام اکناف ہند سے ہزار وں کی تعداد میں گویے بیجاپور میں جمع کر لیے اس نے بیجاپور کے قریب نورس پور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا اور نورس نامہ ایک کتاب موسیقی میں تصنیف کی جس کا مقدمہ سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے، یہ خود گیت بھی تصنیف کرتا تھا اور گاتا بھی تھا، چونکہ اس کو ہندی موسیقی سے عشق تھا اس لیے لامحالہ اس کے گیت میں فارسی الفاظ کے ساتھ بہت کچھ آمیزش ہندوستانی دکنی الفاظ کی ہوتی ہوگی اور رفتہ رفتہ یہی گیت، فارسی بحروں میں آ کر اردو کی اولین شاعری قرار پائے ہوں گے،

بالکل اسی کا ہمعصر سلطان محمد قلی (قطب شاہی حکومت کا پانچواں فرمانروا) گولکنڈہ میں حکمراں تھا (۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۱۲ء) یہ بھی بڑا رنگیں مزاج اور علم و فضل کا قدر دان تھا، اس نے ایک عورت بھاگ متی کے عشق میں گولکنڈہ سے قریب ایک شہر بھاگ نگر آباد کیا لیکن جب بھاگ متی مر گئی تو اس کو حیدرآباد کے نام سے موسوم کیا جو دولت آصفیہ کا پایۂ تخت ہے، یہ خود بھی اچھا شاعر تھا اور فارسی کے علاوہ ملکی زبان میں بھی شعر کہتا تھا افسوس ہے کہ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کے گیت یا اشعار کہیں سے دستیاب نہیں ہوئے اور اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ان کی زبان کس قسم کی تھی، لیکن محمد قلی کا ضخیم کلیات جو تمام اصناف سخن پر حاوی ہے موجود ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت عہد اکبری میں صرف فارسی و بھاشا کی آمیزش سے زیادہ زبان نے کوئی شکل اختیار نہ کی تھی ٹھیک اسی وقت یعنی اب سے تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل دکن میں سلطان محمد قلی اس نو زائیدہ زبان میں شاعری بھی کرتا تھا اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا　　که اس بن نہیں ہمیں یک دل قرارا

پیا ہوں حضرت کے ہت آب کوثر　　تو شاہاں اپر مجھ کلس کر بنایا

خورشید کہ اُپر سے ابرو ہلال عید　　اس ابرواں کو سجدہ کیا ہے وصال عید

مو مناں خوشیاں کرو ہے آج دن مولود کا　　مرتضےٰ بارہ اماماں عید ہے معبود کا

اس کے بعد تین فرمانروا اور ہوئے، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، اور ابوالحسن تانا شاہ اور یہ تینوں شاعر تھے چنانچہ سلطان محمد قطب شاہ کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:۔

پیا سانولا من ہمارا بھلایا نزاکت عجب سبز رنگ میں دکھایا

ساقیا آ شراب ناب کہاں چندر کی پیالی میں آفتاب کہاں

عبداللہ قطب شاہ کی شاعری کا نمونہ یہ ہے:۔

اے پری پیکر ترا مکھ آفتاب دیکھتا ہوں نور ہے نا مجھ میں تاب

اور تانا شاہ کا یہ شعر تو میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے

کس در کہوں کاں جاؤں مجھ دل پہ بھل بجھر اٹے اک بات کئے ہونگے سجن یاں جی ہی بارہ باٹے

(چونکہ بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں جگہ کے فرمانرواؤں کو شاعری کا ذوق تھا اس لئے یہاں اور شاعر بھی پیدا ہوئے، بیجاپور کے بعض شعراء کا ذکر بحوالہ بساطین السلاطین، تذکرہ گل رعنا میں کیا گیا ہے اور اسی سلسلہ میں مولانا نصرتی، ملا ہاشمی اور میران مرثیہ گو کا نام لیا جاتا ہے، نصرتی کے کچھ اشعار بھی نقل کیے ہیں)

نصرتی محمد عادل شاہ کے اخیر زمانہ یعنی ۱۰۶۶ھ تک زندہ رہا، اس کی تصانیف میں ایک مثنوی گلشن عشق ہے جس میں منوہر کنور اور مدھ مالتی کے واقعۂ محبت کو اردو میں نظم کیا ہے، دوسری علی نامہ ہے، اس میں علی عادل شاہ کے فتوحات بیان کیے ہیں ایک مجموعۂ قصائد اور ایک دیوان غزلوں کا ہے،

مصنف نے تذکرۂ گل رعنا نے لکھا ہے کہ:۔

ایک پرانی بیاض میری نظر سے گزری ہے جس میں نصرتی کا معراج نامہ پورا نقل کیا ہے تاریخ کتابت ۲۲ محرم ۱۰۷۳ھ ہجری اس میں درج ہے اور اکبر آباد میں لکھا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نصرتی کا کلام انھیں کی زندگی میں اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ اس کی نقلیں بیجاپور سے اکبر آباد دہوپخ گئیں"

ہاشمی اندھے پیدا ہوئے تھے مگر بلا کے ذہین تھے، انھوں نے یوسف زلیخا کے نام سے ایک مثنوی دکنی زبان میں لکھی ہے شمس اللہ صاحب قادری کا بیان ہے کہ ان کا ایک دیوان بھی تھا لیکن زیادہ تر ریختی میں، ہاشمی نے ۱۱۰۵ھ ہجری میں انتقال کیا، ان کے علاوہ بیجاپور کے اور شاعروں کا بھی نام لیا جاتا ہے جن میں ایک شاہ ملک ہیں جنھوں نے بعض مسائل مذہبی

دکنی زبان میں نظم کیے اور دوسرے شاہ امین جو ایک صوفی شخص تھے اور تصوف ہی کے متعلق اشعار کہتے تھے،

گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت میں علاوہ اُن فرمانرواؤں کے جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے ایک شاعر ابن نشاطی تھے، یہ گولکنڈہ کے رہنے والے تھے اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھے، انھوں نے ایک مثنوی پھول بن ۱۰۶۶ھ لکھی، اس دربار کا دوسرا شاعر غواصی تھا، اس نے ایک مثنوی سیف الملوک کے نام سے رکھی تانا شاہ کے زمانے میں ایک شاعر طبعی تخلص کرتے تھے اور فائز دشاہی بھی اسی زمانے میں ہوئے ہیں لیکن ان سب نے مثنوی کی طرف زیادہ توجہ کی اور غزل کی طرف صحیح معنی میں توجہ اس وقت ہوئی جب اورنگ زیب نے عادل شاہی اور قطب شاہی دونوں حکومتوں کا خاتمہ کرکے اورنگ آباد کو اپنا مرکز قرار دیا،

چونکہ مغلیہ سلطنت کی قدر دانیاں تمام اکناف ہند میں مشہور تھیں اس لیے دکن کے وہ تمام شاعر جو یہاں کی حکومتوں سے وابستہ تھے مغلیہ تسلط کے بعد اورنگ آباد پہونچے اور اس میں شک نہیں کہ ان کی قدر دانی کی گئی اس دور کے شعرا میں میر عبدالولی عزلت، مرزا داؤد، میر عاشق علی خاں ایما، میر غلام علی ارشد، مرزا علی نقی خاں ایجاد، میر عبدالحی خاں صارم، عارف الدین خاں عاجز، میر اولاد محمد ذکا، قاضی محمود بحری، فقیر اللہ آزاد، میر سراج الدین سراج، محمد امین امین وجدی اور شمس الدین ولی ہیں جن کو آزاد نے آب حیات میں غزل کا ابوالآبا، ظاہر کیا ہے

اس دور کے تمام شاعروں میں جسے شعرائے متقدمین کا دور ثانی کہنا چاہیے ولی سے زیادہ شہرت کسی نے حاصل نہیں کی، اور اس کے بعد سراج داؤد، عزلت اور عاجز کا نام لیا جاتا ہے، فقیر اللہ آزاد کو بھی میر نے اپنے تذکرہ میں اچھے الفاظ سے یاد کیا ہے لیکن ان کا کلام دستیاب نہیں ہوا،

ان شعراء میں سب سے پہلے ولی کا انتقال ہوا (۱۱۵۵ھ)، اس کے بعد داؤد کا (۱۱۶۸ھ) پھر سراج کا (۱۱۷۷ھ) اور پھر عاجز کا (۱۱۷۰ھ) عزلت نے سب کے بعد ۱۱۸۹ھ میں وفات پائی، ولی کا سنہ پیدائش ۱۰۷۹ھ بتایا جاتا ہے اور ۷۶ سال کی عمر پاکر ۱۱۵۵ھ میں انتقال کیا، اس لیے سلطان عبداللہ قلی (قطب شاہیوں کے آٹھویں فرمانروا) کے زمانہ میں پیدا ہوئے ہوں گے اور اورنگ زیب سے لے کر محمد شاہ تک کا زمانہ دیکھا ہوگا، ان کا نام ولی اللہ، لقب شمس الدین اور تخلص ولی تھا، اورنگ آباد کے رہنے والے تھے لیکن چونکہ ان کی تعلیم و تربیت گجرات میں ہوئی اور وہیں بیعت بھی کی اسلیے بعض نے ان کو گجرات کا باشندہ سمجھ لیا، ولی دو مرتبہ دہلی گئے پہلی بار اورنگ زیب کے عہد یعنی (۱۷۰۰ء) میں اور اسی وقت شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی جو نقشبندیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے اور شاعر بھی تھے، تذکروں میں لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے ان کے شعر سُن کر کہا کہ "مضامین فارسی کیوں نہیں ریختہ میں استعمال کرتے" دوسرا سفر دہلی کا انھوں نے ۱۷۲۲ء میں بعہد محمد شاہ کیا اور اپنا کلام ریختہ بھی ساتھ لیگئے جسکی وہاں بہت شہرت ہوئی اس کے دلی سے پھر اورنگ آباد میں آئے اور یہیں انتقال کیا،

ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ابتدائی اور آخری رنگ میں بہت فرق پایا جاتا ہے اول اول ان کی غزلوں کی زبان یہ تھی

ترے بن مجھ کو اے ساجن تو گھر اور بار کرنا کیا — اگر تو نا اچھے مجھ کن تو یہ سنسار کیا کرنا

دکنی زبان اور محاورہ غالب ہے

اس کے بعد غالباً شاہ سعد اللہ سے ملنے کے بعد انھوں نے فارسی ترکیبوں کا بھی استعمال شروع کیا مثلاً

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن — باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

خوئی اعجازِ حسنِ یار اگر انشا کروں — بے تکلف صفحۂ کاغذ یدِ بیضا کروں

لیکن دوبارہ دلی سے واپس جانے کے بعد ان کے کلام میں بہت زیادہ سلاست پیدا ہوگئی اور زبان اتنی بدل گئی کہ اس وقت بھی اس میں کسی حذف و اضافہ کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی مثلاً :-

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو — کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانہ ساقی — کہ دل سوں تاب جی سے صبر سر سوں ہوش لیجاوے

ذیل کے اشعار سے ان کی شاعری کے مختلف ادوار کا حال واضح ہو سکتا ہے :-

(۱) جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہو گا — ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہو گا
مجھ کو ہوا ہے معلوم اے مستِ جام خوبیں — تجھ انکھڑیاں کے دیکھے عالم خراب ہو گا

---

(۲) مت تصور کرو مجھ دل کو کہ ہر جائی ہے — چمنِ حسن پری رو کا تماشائی ہے
اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق — کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

---

(۳) زندگی جام عیش ہے لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں

(یوں تو سراج اور داؤد وغیرہ سب ہمعصر ولی ہی کے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ولی کا تتبع کیا اور زبان و خیال کے لحاظ سے ولی کے نقش قدم پر چلے، ذیل کے اشعار سراج کے ملاحظہ ہوں)

✓ شکر صد ان دنوں تیرا کرم ہونے لگا　　شیوۂ جور و ستم فی الجملہ کم ہونے لگا

مدت سے گم ہوا دل بیگانہ اے سراج　　شاید کہ جا لگا ہے کسی آشنا کے ہاتھ

نہیں ہے تاب مجھے تیرے سامنے جاناں　　کہاں سراج کہاں آفتاب عالمتاب

سراج[1] اورنگ آبادی کی مشہور غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی　　نہ تو میں رہا نہ تو تو رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی　　نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا　　مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں　　کہ شراب حسرت و آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

مرزا داؤد[2] کا رنگ سخن یہ تھا:-

✓ مرا احوال چشم یار سے پوچھ　　حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ

اے زاہداں اٹھاؤ جبیں کو زمین سے　　جو سرنوشت ہے اسے کاں تک مٹاؤ گے (کہاں)

---

[1] سراج الدین سراج اورنگ آباد کے سیدوں میں تھے وہیں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما ہوا، بعض اہل تذکرہ نے انھیں سید حمزہ دکنی کا شاگرد بتایا ہے عنفوان شباب میں صوفیانہ مستی و خود رفتگی میں بسر ہوا، اس کے بعد سید عبد الرحمن چشتی سے بیعت کی، ان کے پیر بھائی عبد الرسول خاں نے انکا دیوان ... ۵ شعروں کا مرتب کیا تھا، شعرائے اورنگ آباد میں ان کا خاص مرتبہ تھا اور فارسی کے اشعار بھی اچھے کہتے تھے، ۱۱۷۷ھ ہجری میں انتقال کیا

[2] مرزا داؤد، داؤد بھی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پایا یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب اورنگ آباد علم و فضل کا مرکز تھا، اور شعرا کی مجلسیں ہر ہفتہ گرم رہا کرتی تھیں، اسی صحبت نے انھیں بھی شعر کی طرف متوجہ کیا، اور ولی کا تتبع انھوں نے بھی اختیار کیا ۱۱۶۶ھ میں انتقال ہوا،

عزلت[۱] سنہ ۱۱۶۴ھ میں دلی آئے تھے اور میر تقی میر سے بھی ملے تھے یہ بھی ولی کے متبع تھے جیسا کہ ذیل کے اشعار سے واضح ہو گا

بجز رفاقتِ تنہائی آسرا نہ رہا		سوائے بیکسی اب اور آشنا نہ رہا

صدائے گل کہاں، سونے پڑے ہیں گلستاں اپنے		گئی ہیں بلبلیں کیدھر، جلا کر آشیاں اپنا

عارف الدین عاجز کے والد عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے، عاجز کمسنی میں یتیم ہو گئے تھے لیکن نواب لشکر خاں (رکن الدولہ نصیر جنگ) نے ان کی پرورش کی اور بعد کو رسالہ کی بخشی گری کا منصب ان کو عطا کیا، اورنگ آباد پہنچکر شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا، فارسی، اُردو دُونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے، سنہ ۱۱۸۰ھ میں انتقال ہوا، کلام کا رنگ یہ ہے (جیسے ولی اور سراج دونوں کے کلام سے کوئی نسبت نہیں)

دیکھ دامنگیر محشر میں ترے ہوئیں گے ہم		خوں ہمارا اپنے دامن سے نہ لے قاتل چھڑا

ہمارے اشک خونیں یاد ہیں گر دیکھے بہ بہ کر		نگہ کو رشتۂ تسبیح یاقوتی بناتا ہے

(ولی کے دہلی پہونچنے کے بعد وہاں کے لوگوں میں خاص تحریک غزل گوئی کی پیدا ہوئی) اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے شاہ مبارک آبرو کا نام سامنے آتا ہے، شاہ مبارک لقب تھا اور نجم الدین نام، محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے اور عنفوانِ شباب میں دہلی آگئے تھے اور آخر عمر تک یہیں رہے، اس زمانے میں سراج الدین علی خاں آرزو دہلی کے مشہور فارسی گو شاعر تھے اور شاید دو چار شعر اردو کے بھی کہے تھے یہ خان آرزو کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور میرزا مظہر سے اکثر ان کی چوٹیں چلتی رہتی تھیں جنکا ذکر آبِ حیات میں کیا گیا ہے، شاہ مبارک کے کلام اور ولی دکنی کے کلام میں زیادہ فرق نہیں ہے البتہ ایہام و تشبیہ ان کے یہاں زیادہ ہے لیکن کیفیت و جذبہ بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے

---

[۱] نام میر عبدالولی تھا اور سید سعد اللہ ان کے باپ کا نام تھا جو سلون ضلع رائے بریلی (اودھ) کے رہنے والے تھے، سید سعد اللہ ایک فاضل شخص تھے سفرِ حج سے واپس ہوتے ہوئے سورت میں رہ پڑے تھے، یہیں ان کے بیٹے کا نشو و نما ہوا اور یہیں تعلیم و تربیت ہوئی، فارسی، بھاشا اور اُردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور موسیقی و نقاشی کا بھی بہت شوق تھا، جب وقت سنہ ۱۱۶۴ھ میں دہلی پہنچے تو خان آرزو اور میر دونوں سے ملے، یہاں سے مرشد آباد گئے اور نواب علی وردی خان نے ان کی بہت عزت کی اس کے بعد اورنگ آباد چلے گئے اور وہیں سنہ ۱۱۸۹ء میں وفات پائی۔

نکلے تم آ، صبا کی طرح جب چمن میں بھول　　گلشن کے دیکھ تجھ کو گئے ہاتھ پاؤں پھول

کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد　　روح پتھر سے سر پٹکتی ہے

قول آرزو کا تھا کہ نچاؤں گا اس گلی　　ہو کر کے بیقرار دیکھو آج پھر گیا

پھرتے تھے دشت دشت دوانہ کدھر گئے　　وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

انھیں کے ہمعصر شیخ شرف الدین مضمون تھے، صوفی آدمی تھے اور زینت المساجد میں رہا کرتے، یہ بھی خان آرزو کے شاگرد تھے، ان کے بعض بعض اشعار میں تغزل کی وہ کیفیت پیدا ہو چلی تھی جس کی تکمیل بعد کو میر اور درد نے کی مثلاً

هم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا　　صبرِ ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

مرا پیغام وصل اے قاصدا　　کہیو سب سے اُسے جدا کر کے

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے　　کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے

(سودا نے ان کا زمانہ دیکھا تھا، چنانچہ مضمون کے انتقال کے بعد سودا نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہے

بنائیں اُٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی　　گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو مستانہ)

ایک اور شاعر شاکر ناجی[1] تھے جنھوں نے نادر شاہی لوٹ کا تماشہ دلی میں دیکھا تھا، ان کے اشعار میں کوئی خاص کیفیت تغزل کی نہیں پائی جاتی، طبیعت ہزل کی طرف زیادہ مائل تھی، زبان بھی چنداں صاف نہیں ہے اور دلی کے وقت کے الفاظ بھی ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔

---

[1] ان کا نام میر محمد تھا اور تخلص ناجی، شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے اور عمدۃ الملک امیر خاں محمد شاہی کے یہاں باورچی خانہ کے داروغہ تھے بہت شوخ مزاج اور تیز طبع آدمی تھے، بات بات میں ہر شخص سے اُلجھ پڑنا معمولی بات تھی، عنفوان شباب میں ان کا انتقال ہوا، رنگ سخن یہ تھا

نہ سیر باغ، نہ ملنا، نہ میٹھی باتیں ہیں　　یہ دن بہار کے اے جان مفت جاتے ہیں

آج تو ناجی سجن سے کر لے اپنا عرض حال　　مرنے جینے کا نہ کر دسواس ہونا ہو سو ہو

مصطفٰے خاں یکرنگ بھی اسی عہد کے کہنہ مشق شاعر تھے اور میرزا مظہر سے مشورہ لیتے تھے چنانچہ ایک شعر میں اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت ولے
مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں

بجائے (سے) کے (سیتی) اور سجن وغیرہ کے الفاظ دکنی شعراء کی طرح انھوں نے بھی استعمال کیے ہیں لیکن بعض بعض اشعار بے انتہا صاف ہیں مثلاً ؎

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے،
میرا صبر و قرار جاتا ہے،

اس قدر کیا ہے حمایت غیر کی
ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

سنتا ہی نہیں ہے بات کسی کی تو اے سجن
تجھ کو ترا غرور نہ جانوں کرے گا کیا

خلق یکرنگ کی ہوئی دشمن
جب سے وہ تیرا دوستدار ہوا

میر محمد حسین کلیم بھی اسی عہد کے مشہور شاعر تھے جو بقول میر بیدل کے رنگ میں شعر کہتے تھے اور اسی لئے زیادہ قبولیت حاصل نہ کر سکے

اس عہد کے نہایت مشہور شاعر شاہ ظہور الدین حاتم تھے، پہلے رمز تخلص کرتے تھے بعد کو حاتم ہو گئے ان کا دیوان قدیم نادر شاہی حملہ کے وقت ضایع ہو گیا اس لیے بعد کو ایک اور مجموعہ دیوان زادہ کے نام سے مرتب کیا، اس کے دیباچہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے زبان کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور بہت سے قدیم الفاظ اور محاورہ جو دکنی شعراء اور ان کے تبعین کے کلام میں پائے جاتے تھے انھوں نے ترک تو خیر کیا کیے البتہ ان کے ترک کی طرف لوگوں کو متوجہ ضرور کیا

لہ یہ بھی دہلی کے رہنے والے تھے اور میر تقی میر کے عزیزوں میں تھے شاید بہنوئی تھے نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل تھی، نمونہ کلام اردو یہ ہے ؎

لگتی ہے اب تو قلقل و مینا سے دل کو ٹھیس
وہ دن گئے کلیم کہ پر شیشہ سنگ تھا

عمر رفتہ کا نہ پایا کھوج ہرگز اے کلیم
آپ کو جوں شمع میں ہر انجمن میں گم کیا

غرور حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہنچے
غرض تم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے

آزاد نے ان کا سنہ ولادت ۱۱۱۱ھ لکھا ہے۔ وفات ۱۲۰۷ھ یا بقول مصحفی ۱۱۹۶ھ میں ہوئی ۹۶ سال کی طویل عمر پائی زبان کی صفائی ان کے کلام سے ظاہر ہے۔

جب سے تیری نظر پڑی ہی جھلک　　تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک

ہجر کی زندگی سے موت بھلی　　کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

اول اول ان کے کلام میں ایہام زیادہ پایا جاتا تھا لیکن بعد کو ترک کر دیا۔

لیکن میرے نزدیک اس دور میں بہ لحاظ تغزل جو مرتبہ اشرف علی خاں فغاں کا تھا وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا، یہ احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے اور علی قلی ندیم کے شاگرد تھے، شعر و سخن کے علاوہ بذلہ سنجی میں بھی ماہر تھے اور اسی لیے بادشاہ نے انھیں ظریف الملک کا خطاب دیا تھا، یہ دہلی کی شورش انگیز حالت سے گھبرا کر پہلے اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشد آباد گئے اور پھر نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد آئے، نواب نے ان کی بڑی قدر کی لیکن کسی بات پر خفا ہو کر یہاں سے عظیم آباد چلے گئے جہاں راجہ شتاب رائے شاعروں کا بڑا مشہور قدر شناس تھا اور ۱۲۰۸ھ میں یہیں انتقال کیا۔

ان کے کلام میں سوز و گداز کی خاص کیفیت پائی جاتی ہے جو ان کے دوسرے ہمعصر شعراء کے یہاں بہت کم ہے، مثالاً چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

خط و بجو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں　　لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

باور تجھے اگر نہیں آتا تو دیکھ لے　　آنسو ڈھلک گئے کہیں، لخت جگر کہیں

ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک روا نہیں　　ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے بھی ڈر کہیں

کیا حال پوچھتے ہو فغاں کا سنا نہیں　　خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا

مجھ سے جو پوچھیے تو بحال تنگ ہے　　یوں بھی گزر گئی مری یوں بھی گزر گئی

تیرے ہی دل سے پوچھیے اس غم کو اں فغاں　　الفت بری بلا ہے کسی کو خدا نہ دے

اس دور میں خان آرزو اور میرزا مظہر دو شاعر فارسی کے ایسے ہوئے ہیں جن کا ذکر اردو شاعروں کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے خیر خان آرزو کو

تو اس زمرہ میں شامل کرنا درست نہیں کیونکہ انھوں نے صرف چند اشعار اُردو کے کہے ہیں لیکن میرزا مظہر کو یقیناً اس دور کے نہ صرف بہترین بلکہ مصلح شعرائے اُردو کی صف میں جگہ دینی چاہیے۔ یہ اورنگ زیب کے بالکل آخری زمانے میں پیدا ہوئے اور ریختہ فرما نروا عہد مغلیہ کے دیکھ کر عالمگیر ثانی کے زمانے میں انتقال کر گئے

نام شمس الدین تھا اور تخلص مظہر سنہ ولادت ۱۱۱۱ھ ہے ان کے والد کا نام مرزا جان تھا، اسی لیے جب عالمگیر کو ان کی ولادت کی خبر ہوئی تو اُس نے "جانِ جاں" نام رکھا۔

میرزا مظہر فاضل شخص تھے اور نقشبندی خاندان سے تعلق درویشی رکھتے تھے محمد شاہ اور نواب آصف جاہ نے بہت کچھ ان کی مالی مدد کرنا چاہی لیکن کبھی قبول نہ کی، فارسی کلام ان کا جس پایہ کا ہے وہ بقول میر سلیم و کلیم سے ٹکر کھاتا ہے لیکن چونکہ ان کا اُردو کلام نایاب ہے اس لیے تذکرہ نویسوں نے اردو شعراء کے سلسلہ میں بہت کم ان کا ذکر کیا ہے دراں حالیکہ حسب بیان مولوی قدرت اللہ صدیقی سب سے پہلے یہی شاعر ہیں جنھوں نے ایہام گوئی کو ترک کر کے شاہجہاں آباد کی اُردوئے معلیٰ میں ریختہ کو رواج دیا، ساتویں محرم ۱۱۹۵ھ کی رات میں ایک شخص نے قرابین سے حملہ کیا اور ۱۰ محرم کو انتقال کیا، صاحب تذکرۂ گلِ رعنا نے ان کا اُردو کلام بہت کوشش سے فراہم کر کے ۳، ۴ صفحات میں درج کیا ہے، ہم منتخب اشعار پیش کرتے ہیں جن سے اُن کے رنگ تغزل کی پاکیزگی واضح ہو سکتی ہے۔

چلے اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا — نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزہ سے زندگی کرتے — اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

* * *

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا — لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بیکس افسوس — کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

* * *

اتنی فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم — مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

* * *

الٰہی مت کسو کے پیش رنج و انتظار آوے — ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جبتک بہار آوے

* * *

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو — یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

تذکرہ گل رعنائے میرزا مظہر کا شمار طبقۂ متوسطین کے دور اول میں کیا ہے، دراں حالیکہ وہ شاعر جو عہد اورنگ زیب میں پیدا ہوا ہو اور ولی دکنی و حاتم کا ہمعصر رہا ہو اس کا شعرائے متقدمین میں شمار ہونا چاہیے۔

میرے نزدیک اردو شاعری تاریخی حیثیت سے تین طبقوں میں منقسم ہے اور ہر طبقہ کے دو دو دور ہوئے ہیں طبقۂ متقدمین طبقۂ متوسطین، طبقۂ آخرین، اس وقت تک ہم نے طبقۂ متقدمین کا ذکر کیا ہے اور دوسرے دور حسب تفصیل ذیل ہونے چاہییں۔

(دور اول :- شاہان قطبیہ و شاہان عادل شاہی اور اس زمانہ کے دوسرے شعرا جو صرف گولکنڈہ تک پائے جاتے تھے جن کو دہلی جانا نصیب نہیں ہوا)

دور دوم :- وہ شعرا جو اورنگ آباد میں بزمانۂ اورنگ زیب پائے جاتے تھے ---- خواہ وہ دہلی گئے ہوں یا نہ گئے ہوں

اس لحاظ سے دور اول کے خاص خاص شعرا محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، نصرتی، ہاشمی، نشاطی غواصی، طبعی، نوری، فائز دشاہی تھے اور (دور ثانی میں ولی دکنی، سراج، داؤد، عزلت، عاجز، فقیر اللہ آزاد، آبرو، مضمون یکرنگ، کلیم، حاتم، فغاں اور مرزا مظہر تھے)

دہلی آنے والے یا یہاں سے تعلق رکھنے والے شعرا میں بہ لحاظ پیدائش سب سے پہلے ولی دکنی کا نمبر ہے، کیونکہ یہ اورنگزیب کے ابتدائی عہد حکومت میں پیدا ہوئے اور محمد شاہی حکومت کے زمانۂ شباب میں انتقال کیا، گویا انھوں نے سلطنت مغلیہ کی ۵ حکومتوں کو دیکھا ان کے بعد شاہ حاتم کا نمبر ہے جو اورنگ زیب کے بالکل آخر زمانے میں پیدا ہوئے اور شاہ عالم کے زمانہ تک زندہ رہے گویا انھوں نے آٹھ فرمانرواؤں کا زمانہ دیکھا، پھر مرزا مظہر ہیں جو اورنگ زیب کے انتقال کے آٹھ سال قبل پیدا ہوئے اور عالمگیر ثانی کے زمانے تک زندہ رہے یعنی انھوں نے بھی سات بادشاہ عہد مغلیہ کے دیکھے، سراج، داؤد، اور عاجز وغیرہ کا دہلی جانا پایا نہیں جاتا، عزلت البتہ احمد شاہ کے زمانہ میں دہلی آئے اور شاہ عالم کے زمانے میں انھوں نے وفات پائی۔

اس لحاظ سے عہد مغلیہ میں محمد شاہ کا زمانہ خاص مرکزی دور ہے کیونکہ اس نے ۳۰ سال تک حکومت کی اور متقدمین شعرا میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے اس بادشاہ کا زمانہ نہ دیکھا ہو، بلکہ عہد وسطیٰ کے مشہور شعرا سودا، میر، درد اور سوز بھی اسی کے عہد میں پیدا ہوئے اس لیے یوں بھی اصولاً محمد شاہ کے عہد تک کے شعرا کو علٰحدہ کر دینا چاہیے، محمد شاہ کے بعد احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کی حکومتیں صرف بارہ سال تک رہیں اور پھر شاہ عالم کا عہد آیا جو ہر چند نہایت ہی اضطراب کا وقت تھا لیکن اس نے بھی تقریباً ۵۰ سال تک حکومت کی اور یہ وہ زمانہ تھا جب میر و سودا، درد و سوز کی شاعری کا زور تھا اسی لیے ہم طبقۂ متقدمین کے دوسرے دور کو محمد شاہ کے عہد کے شعرا تک ختم سمجھتے ہیں۔

(طبقۂ متوسطین کے دونوں دور اردو شاعری کی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتے ہیں اور اگر انھیں انتہائی عروج کا زمانہ قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔)

(پہلے دور یعنی شاہ عالم کے زمانے میں سودا، میر، درد، سوز ایسے زبردست شاعر ہوئے کہ زمانہ پھر ان کا مثل پیدا کر سکا اور دوسرے دور یعنی بہادر شاہ ظفر کے عہد میں مومن، غالب، ذوق اور مصحفی نے جو مرتبہ حاصل کیا وہ انھیں کا حصہ ہو کر رہ گیا)

میرزا سودا کے والد مرزا محمد شفیع کابل سے ہندوستان آئے تھے لیکن میرزا سودا دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں کے ہو رہے اول اول سلیمان قلی خاں واؤد کے شاگرد ہوئے اور پھر شاہ حاتم کے۔ شاہ عالم بادشاہ بالکل ان کے ہمعصر تھے اور انھیں کو اپنا کلام دکھاتے تھے بعد کو کسی بات پر خفا ہو کر بیٹھ گئے یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی اجڑ رہا تھا اور اودھ کی سلطنت عروج پر آ رہی تھی۔ آخر کار یہ بھی وطن سے گھبرا کر پہلے فرخ آباد پہنچے جہاں نواب احمد خاں غالب جنگ برسرِ حکومت تھے اور مہربان خاں رند ان کے دیوان شعرا کے بڑے قدردان تھے جب ۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں کا انتقال ہو گیا تو فیض آباد آئے، یہ زمانہ نواب شجاع الدولہ کی حکومت کا تھا، ان کی بڑی قدر ہوئی جب شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ حکمراں ہوئے تو پایۂ تخت لکھنؤ ہو گیا اور سودا بھی یہیں چلے آئے، ستر سال کی عمر تک پہونچ کر ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا[1]

---

[1] سودا اپنے قصائد و ہجویات کے لحاظ سے بہت مشہور ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اپنی ذہانت و ہمہ گیری کے لحاظ سے جواب نہ رکھتے تھے تغزل میں ان کے یہاں وہ سوز و گداز نہیں ہے جو میر، درد یا سوز کے یہاں پایا جاتا ہے، انھوں نے وارداتِ عالم اور اعتبارات سے زیادہ کام لیا ہے۔ ان کا کلیات تمام اصنافِ سخن سے بھرا ہوا ہے اور بہت عام چیز ہے۔ بعض مشہور اشعار ان کے یہ ہیں ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجیو کہ چلا میں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ
تو کہے گبر مجھے، اگر مسلماں مجھ کو

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

میر تقی میر کا اصلی وطن اکبر آباد ہے، لیکن اپنے والد میر عبد اللہ کی وفات کے بعد عنفوان شباب میں دہلی چلے آئے اور خان آرزو سے مشورہ لینے لگے جو شاید ان کے عزیز بھی تھے، رفتہ رفتہ ان کی شاعری نے بہت شہرت حاصل کی لیکن جب شاہ عالم کے زمانے میں دہلی اجڑی تو یہ بھی بقول آزاد ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ کی طرف چل دیے میرزا لطف نے ۱۱۹۶ھ تحریر کیا ہے اور عمر ۶۰ سال

اگر تاریخ اول صحیح مانی جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ لکھنؤ میں پانچ سال تک سودا اور میر کا اجتماع رہا لیکن تذکروں سے اس کا ثبوت نہیں ملتا، میرزا لطف میر صاحب کے ہمعصر ہیں اس لیے ان کا بیان صحیح ہونا چاہیے اور میر کا سودا کے انتقال کے دو سال بعد لکھنؤ پہنچنا درست معلوم ہوتا ہے ہر چند آب حیات کے ایک لطیفے سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا اور میر دونوں کا اجتماع لکھنؤ میں پایا جاتا ہے لیکن آزاد لطائف و ظرائف کے بیان کرنے میں ہمیشہ تحقیق تاریخی سے ہٹ جاتے ہیں۔

جس وقت میر لکھنؤ پہنچے ہیں نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا، انھوں نے میر کی تنخواہ ۳۰۰ روپیہ ماہوار جاری کر دی جو آخیر عمر تک انھیں ملتی رہی۔ ۱۲۲۵ھ میں ان کا انتقال ہوا[لے]۔

لے میر صاحب کی غزل گوئی کے متعلق اظہار خیال بیکار ہے کیونکہ یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ میر کا سا غزل گو نہ اس وقت تک پیدا ہوا اور نہ آگے اس کی توقع کی جاتی ہے میر صاحب کے کلام کا انتخاب متعدد لوگوں نے کیا ہے اور مضامین کی صورت میں تو خدا جانے کتنی بار ان کے رنگ تغزل پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خود میر نے جو انتخاب اپنے کلام کا پیش کیا ہے وہ نہایت معمولی بلکہ بعض جگہ بہت پست ہے ان کے چند مشہور شعر یہ ہیں

✓ ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

✓ یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان اپھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

✓ سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

✓ اب تو جاتے ہیں بتکدہ سے میر
پھر ملیں گے، اگر خدا لایا

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی، جہنم میں

✓ ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

(اس صف کے تیسرے شاعر سوز تھے جن کا نام سید محمد میر تھا۔ پہلے یہ میر تخلص کرتے تھے لیکن بعد کو سوز اختیار کیا، آب حیات میں لکھا ہے کہ میر انھیں باؤ شاعر مانتے تھے لیکن میر نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر نہایت اچھے الفاظ میں کیا ہے، یہ میر ضیار الدین کے بیٹے اور قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں نشوونما ہوا، تقریباً سنہ ۱۱۶۷ھ میں جب عمر ۴۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی یہ بھی دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور سب سے پہلے فرخ آباد جاکر نواب مہربان خاں رند کی سرکار میں زندگی بسر کی وہاں سے ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ ہوتے ہوئے مرشد آباد چلے گئے وہاں سے ۱۲۱۲ھ میں پھر لکھنؤ آئے اور آصف الدولہ کے استاد ہوئے انھوں نے ۱۲۱۳ھ میں انتقال کیا[1]

(خواجہ میر درد، خواجہ محمد ناصر عندلیب کے بیٹے تھے دہلی میں پیدا ہوئے، یہیں پرورش پائی اور ۲۲ سال کے سن میں علائق دنیا کم کرکے اپنے والد کی خانقاہ میں سجادہ نشین ہو گئے اور آخر عمر تک یہیں رہے، صاحب باطن شخص تھے اور فن موسیقی میں اچھی مہارت رکھتے تھے، ان کے یہاں مہینے میں دو بار محفل سماع منعقد ہوتی تھی اور کبھی کبھی شاہ عالم بادشاہ بھی اس میں شریک ہوتے تھے ۱۱۹۹ھ میں ۶۰ سال کی عمر پاکر وفات پائی[2])

---

[1] نومبر ۱۹۳۴ء کے نگار میں ایک مستقل مضمون ان کے حالات و کلام کے متعلق شایع ہو چکا ہے ان کے چند شعر بطور نمونہ یہاں درج کیے جاتے ہیں:۔

لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص ہے عاشق کہیں   عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہے

مجھ کو دھوکا دیا کہا کہ شراب   اے ان آنکھوں کا ہوئے خانہ خراب

اشکِ خوں آنکھوں میں آکر جم گئے   دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

سر زانو پہ ہو اس کے اور جان نکل جائے   مرنا تو مسلّم ہے ارمان نکل جائے

[2] درد کے بعض مشہور اشعار یہ ہیں:

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا   بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا   پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک   اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

مدت تک جہاں میں ہنستے پھرا کئے   جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھ کر کہیں

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ساقیا! اب لگ رہا ہے چل چلاؤ   جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

یہ تھا مختصر سا حال اُن چار شاعروں کا جن پر سرزمین دہلی ہمیشہ فخر کرے گی اور جن میں سے تین حضرات کی تشریف آوری کی عزت لکھنؤ نے بھی حاصل کی — شعرائے دہلی میں سب سے پہلے اشرف علی فغاں بعہد نواب شجاع الدولہ فیض آباد آئے اس کے بعد سودا لکھنؤ آئے، پھر سوز، اور سب سے اخیر میں میر تقی میر،

میر، سودا اور درد، دُنیائے شاعری میں اتنی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور ان کے کلام کے مطالعہ کا موقع ہر شخص کو اتنی بار مل چکا ہے کہ اس کا انتخاب یا اقتباس کوئی معنی نہیں رکھتا تاہم فٹ نوٹ میں کہیں کہیں اس کمی کو بھی پورا کر دیا گیا ہے۔ سوز کو نسبتاً لوگوں نے کم یاد رکھا لیکن ان کے متعلق ہمارا ایک مفصل مضمون حال ہی میں مع اقتباس کلام کے نومبر ۱۹۳۴ء کے رسالۂ نگار میں شایع ہو چکا ہے، علاوہ اس کے چونکہ مضمون زیر بحث میں صرف تاریخی تبصرہ مقصود ہے اس لیے یوں بھی کسی تفصیلی تنقید کا موقع نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سودا کا مرتبۂ شاعری ان کی ہمہ گیری کے لحاظ سے بہت بلند نظر آتا ہے، مثنوی، قصیدہ، غزل، ہجو، مرثیہ ترجیع بند، مخمس، رُباعی، قطعہ وغیرہ سبھی کچھ انھوں نے لکھا ہے اور ہر صنف میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شیر صحرا ہے جو نیستان کو چیرتا پھاڑتا چلا آرہا ہے لیکن چونکہ ان کی یہی تنہا صفت غزل گوئی کے منافی تھی اس لیے وہ اس صنف میں تو زیادہ کامیاب ہوئے نہیں البتہ قصیدہ اور ہجو میں وہ اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ مثنویوں میں بھی چونکہ سادگی جذبات وحلاوت زبان کی ضرورت ہے اس لیے میر کے مقابلہ میں یہاں بھی ان کو زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

غزلوں میں بعض بعض جگہ سودا نے بھی جذبات عاشقانہ سے کام لیا ہے اور سوز و گداز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ ان کی فطرت اس کیفیت کے مناسب نہ تھی اس لیے وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے

میر کی غزل گوئی کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، دوست دشمن سب نے ان کو اس صنف کا خدا تسلیم کر لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری کتنی ہی جدید فتوحات حاصل کرلے لیکن وہ اس مملکت میں کوئی فاتحانہ قدم نہیں رکھ سکتی جو میر کے قبضہ میں آچکی ہے زبان کی حلاوت، عاشقانہ فتادگی، والہانہ ربودگی، خستگی و برشتگی کون سی ایسی چیز ہے جو ان کی غزلوں میں نہیں پائی جاتی اور اب کس میں ہمت ہے کہ ان میں کوئی اضافہ کر سکے، کہا جاتا ہے کہ اُردو میں واسوخت کے بھی موجد یہی تھے، قصیدہ بھی لکھا ہے لیکن سودا کو نہیں پہونچے

خواجہ میر درد کا اُردو دیوان بہت مختصر ہے لیکن جتنا بھی ہے "جانِ محبت" ہے، یہ ایک صاحبدل درویش تھے اور اسی لیے انکی غزلوں میں ایک کیفیت میر سے کچھ علیحدہ پائی جاتی ہے، ان کے یہاں بھی وہی جذبات وکیفیات ہیں لیکن ایک خاص غلو لیے ہوئے ہیں جن کا پتہ الفاظ سے تو نہیں چلتا لیکن دماغ ضرور محسوس کرتا ہے۔

میر سوز کی غزل گوئی کی خصوصیت صرف باتیں کرنا ہے، ان کا کلام پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص نہایت بے تکلفی سے محبت کی گفتگو کر رہا ہے اور سہل سے سہل الفاظ میں بغیر کسی تصنع و آورد، بلا کسی تشبیہ واستعارہ کے، دل کا حال دُہرا رہا ہے، افسوس ہے

کہ ان کا کلام ضایع ہو گیا، گزشتہ نومبر کے نگار میں ایک قلمی نسخہ سے انتخاب کرکے میں نے ان کا کلام پیش کیا ہے ناظرین نگار کے مطالعہ میں آیا ہو گا۔

(خدمتِ زبان کے لحاظ سے بھی یہ دور قابل ذکر ہے کیونکہ بہت سے وہ نامانوس الفاظ ہندی کے جو محمد شاہی عہد میں رائج تھے اس زمانے میں ترک کر دیے گئے اور زبان بہت صاف ہو گئی۔)

اس عہد میں علاوہ ان چار مشاہیر کے بعض اور شعراء بھی استادانہ حیثیت کے گزرے ہیں، ان میں سے ایک شیخ قیام الدین قائم تھے جو چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے لیکن بسلسلۂ ملازمت دہلی میں رہ پڑے تھے، اول اول خواجہ میر درد کی شاگردی اختیار کی در پھر سودا کی دہلی کی تباہی کے بعد وطن واپس آکر نواب محمد یار خاں کے پاس ٹانڈہ (آنولہ کے قریب) چلے گئے، پھر رام پور گئے اور [1]۱۲۱۰ھ میں میں انتقال کیا ان کے کلام میں سودا کا رنگ غالب ہے لیکن نہ اتنا کہ حد تغزل سے گزر جائیں معاملات محبت کے شعر انھوں نے نہایت پاکیزہ کہے ہیں۔ مثلاً

غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے　　پر سنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر　　روٹھا تھا آپ تجھ سے میں اور آپ من گیا

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا　　آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائم　　مرا کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

ضیا، الدین ضیا بھی مرزا سودا کے ہمعصر تھے، دہلی کے رہنے والے تھے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس کے شاگرد تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد ہی یہ فیض آباد چلے آئے، اور پھر لکھنؤ آ گئے، چند دن بعد عظیم آباد چلے گئے، یہاں راجہ شتاب رائے کے بیٹے نے ان کی قدر کی اور یہیں ان کا انتقال ہوا مگر کب؟ یہ معلوم نہیں، یہ زیادہ تر غزل گوئی کی طرف مائل تھے اور خوب کہتے تھے، اشعار ملاحظہ ہوں

کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی اے ننگِ خلق　　اس کے کوچے میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

میں نے کل پوچھا ضیا سے دل کو کیدھر کھو دیا　　اُس نے کوچے کو ترے بتلا کے ٹپ دے رو دیا

برس اے ابر جتنا چاہے تو اب تیری باری ہے　　کبھی دل تھا تو میں رو رو کے اک دریا بہاتا تھا

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا　　آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

انعام اللہ خاں یقین میرزا مظہر کے شاگرد تھے اور ۲۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے، افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی ورنہ مصحفی کی رائے یہ تھی کہ شاید میر و میرزا کا دعویٰ یکتائی باقی نہ رہتا۔ یہ نواب اظہر الدین خاں کے بیٹے اور شیخ عبد الاحد سرہندی کے پرپوتے تھے۔ ان کا رنگ تغزل یہ تھا۔

مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے　　جی ہی لے کر چھوڑے گی آخر یہ بیماری مجھے

یقیں کے واقعہ کی سن خبر وہ بدگماں بولا　　یہ دیوانہ تو ایسا تو نہ تھا بیمار کیا کیجے

میرزا مظہر کے ایک شاگرد خواجہ احسن اللہ بیان تھے جو آخر عمر میں دہلی سے حیدر آباد چلے گئے تھے اصل وطن اکبر آباد تھا۔ حیدر آباد میں ۱۲۱۳ھ میں انتقال کیا، ان کا کلام کمیاب ہے لیکن تذکروں میں جس قدر درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام ازحد رنگین تھا اور جو سلاست و سادگی غزل کے لیے ضروری ہے اس کی ان کی غزلوں میں کمی نہ تھی، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مصلحت ترک عشق ہے ناصح　　لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

رسوا ابھی سے کرتی ہے اے چشم تر مجھے　　آنا ہے اس کی بزم میں بار دگر مجھے

میر محمد باقر حزیں بھی میرزا مظہر کے شاگردوں میں تھے اور خوب کہتے تھے یہ بھی دہلی چھوڑ کر عظیم آباد نواب صولت جنگ کے پاس چلے گئے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے

حال اے قاصد مرا جو کچھ کہ تو جاتا ہے دیکھ　　اس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو

میر کے شاگردوں میں میاں عبد الرسول نثار، میاں گلشن، محمد محسن، مجنوں، مشتاق، نزار، بندرابن راقم شکیبا وغیرہ کا نام تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے، لیکن ان میں کوئی اس قابل نہ ہوا کہ میر کی شاگردی اس کو زیب دیتی۔

سودا کے شاگردوں میں میاں مبتلا، آثم، ماہر امیر امانی اسد وغیرہ بہت سے شاعروں کا نام لیا جاتا ہے، لیکن عبد الحی تاباں نے واقعی سودا کا نام روشن کیا اگر وہ واقعی سودا کے شاگرد تھے، تاباں نہایت خوبصورت شخص تھے میرزا مظہر کے بہت محبوب عقیدتمند تھے نمونۂ کلام یہ ہے

عجب احوال ہے تاباں کا تیرے　　کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو ہوا سو ہوا — تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا

غیر کے ہاتھ میں اُس شوخ کا داماں ہے آج — میں ہوں اور ہاتھ ہے اور میرا گریباں ہے آج

خواجہ میر درد کے شاگردوں میں اچھے اچھے کہنے والے ہوئے ہیں ایک تو ان کے چھوٹے بھائی میر محمد اثر ہی تھے اور اس میں شک نہیں کہ خوب کہتے تھے، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اثر کیجیے کیا کدھر جائیے — مگر آپ ہی سے گزر جائیے

وہ ہی میں ہوں اثر وہی دل ہے — اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

بے وفائی پہ تیری جی ہے فدا — قہر ہوتا جو باوفا ہوتا

پہلے سو بار ادھر اُدھر دیکھا — جب تجھے ڈر کے اک نظر دیکھا

ہدایت اللہ خاں ہدایت بھی خواجہ میر درد کے شاگرد تھے، بعض بعض شعر ان کے نہایت پاکیزہ ہیں مثلاً ؎

جی تو کرتا نہیں کوچے سے ترے جانے کو — گر تری اس میں خوشی ہے تو بھلا جاتا ہوں

بھلا بتا تو مری جان کچھ ہدایت نے — تمہارے جور سے شکوہ کبھی کیا ہو گا

مگر یہی نا کہ بے اختیار ہو کے کبھی — کچھ اور بس نہ چلا ہو گا رو دیا ہو گا

حکیم ثناء اللہ فراق بھی خواجہ میر درد کے شاگرد تھے اور بقول مولوی محمد حسین آزاد نہایت مشہور شاگرد تھے، ان کا ایک شعر مجھے بہت پسند آیا ؎

دل تھا منا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ — ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

خواجہ صاحب کے ایک صاحب دیوان شاگرد میر محمدی بیدار بھی تھے لیکن کوئی خاص بات ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی آخر عمر میں دلی سے آگرہ چلے گئے، صاحبدل درویش تھے ۱۲۰۹ھ میں انتقال ہوا

(اس دور کا ذکر نامکمل رہے گا اگر حسنؔ کو چھوڑ دیا جائے) یہ وہی حسن ہیں جن کی مثنوی سحرالبیان اردو زبان کی بہترین مثنوی خیال کی جاتی ہے، یہ میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے، دہلی میں پیدا ہوئے لیکن صغرسنی میں فیض آباد چلے گئے اور پھر لکھنؤ میں آکر قیام کیا۔ یہ میر ضیاء کے شاگرد تھے لیکن اتباع کرتے تھے میر، سودا اور درد کا۔ ۱۲۰۱ھ میں ان کی وفات ہوئی، ان کا سخن دیوان بھی ریختہ کا تھا اور تغزل میں ان کا ذوق نہایت پاکیزہ تھا، مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اُس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

دل کو کھویا ہے کل جہاں جاکر جی میں ہے آج جی بھی کھو آؤں

اُس بُت کی زندگی سے نہ آزردہ ہو حسنؔ یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بُری لگے

کیا جانے اس کے جی پر کیا کچھ خیال گزرا کچھ آپ ہی آپ اپنے دل پر ملال گزرا

اظہارِ خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

نہ رہتی تھیں آہیں، نہ تھمتے تھے آنسو حسنؔ تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

تیرے ہم نام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں جی دھڑک جاتا ہے میرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو

جان و دل ہیں اُداس سے میرے اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا کھڑا اُس پہ میں جان وارا کیا
ابھی دل کو لے کر گیا میرے آہ! وہ چلتا رہا میں پکارا کیا
قمارِ محبت میں بازی سدا وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا
کیا قتل اور جان بخشی بھی کی حسنؔ اُس نے احساں دوبارا کیا

اس دور میں افسوس اور میرزا علی لطف کو بھی شامل کرنا چاہیے

افسوس[1] کا نام میر شیر علی تھا، ان کے والد سید علی مظفر خاں اپنی آخری عمر میں نواب شجاع الدولہ کی سرکار سے متوسل ہو گئے تھے افسوس کا نشو و نما یہیں اودھ میں ہوا، شاعری میں میر حیدر علی حیران اور سوز سے مشورہ کیا، بعد کو کلکتہ چلے گئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں اردو تراجم کا کام کرنے لگے، میرزا علی لطف بھی اس وقت وہیں تھے اور ان دونوں کی ملاقات ہوتی رہتی تھی چنانچہ شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور ۱۲۱۵ھ تک دونوں وہیں موجود تھے، افسوس اپنی غزل گوئی کے لحاظ سے بڑے پایہ کے شخص تھے لیکن افسوس ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی ان کا انتقال ۱۸۰۹ء میں ہوا، آخر عمر میں یہ حیدرآباد چلے گئے تھے۔

لطف کے والد کاظم بیگ خاں ۱۱۵۴ھ میں نادر شاہ کے ساتھ استرآباد سے دہلی آگئے تھے اور بعد کو دربار شاہی سے وابستہ ہو گئے

شاعری افسوس کا مرتبہ لطف سے زیادہ بلند ہے کیونکہ ان کے یہاں وہی میر و درد کا سوز و گداز پایا جاتا ہے، لطف کے کلام میں یہ رنگ ہے اور آورد زیادہ ہے مثلاً ؎

پاس ناموس محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع ساں سوز شب ہجراں زباں پر لائیں کیا

غبار بیکسی سے کیا ضرر پاکیزہ جوہر کو
کہ بخشے ہے جلا گرد یتیمی آب گوہر کو

لطف نے ریختہ میں کسی سے مشورہ نہیں لیا لیکن کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سودا کا تتبع کرنا زیادہ پسند کرتے تھے کہیں کہیں جذبات کی بھی شاعری کی ہے لیکن کم

اسی دور کے ایک اور شاعر لکھنؤ میں میرزا جعفر علی حسرت بھی تھے، انھوں نے رائے سرب سنگھ دیوانہ سے مشورۂ سخن کیا تھا امرا کی صحبت میں خوش باشانہ زندگی بسر کرتے تھے، ان کے والد کا نام ابوالخیر تھا اور اکبری دروازہ میں عطاری کی دکان کرتے تھے جب ان کا انتقال ہو گیا تو حسرت دکان پر بیٹھنے لگے اور پھر ترک دنیا کر کے لباس فقر اختیار کر لیا، ۱۲۱۷ھ میں انتقال ہوا۔

---

[1] اکتوبر ۱۹۳۲ء کے نگار میں ان کے حالات اور انتخاب کلام ایک قلمی نسخہ سے شائع ہو چکا ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیا فائدہ جو یوں چھپے احوال دل افسوس سے
منہ دیکھ رو دیتا ہے وہ پر بات کچھ کہتا نہیں

بیتاب بہت ہوں آج یارو!
ٹک لے چلو اس کے پاس مجھ کو

کیا جانے یہ آہ ہے کہ کیا ہے،
کچھ آگ سی آئی ہے زباں پر

منزل عشق تک نہ پہنچا آہ!
میں تو چلتے ہی چلتے ہار گیا

پاس سے اس کے سب گئے خورسند
ایک افسوس سوگوار گیا

اِنھوں نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور غزلوں کے دو دیوان اپنے بعد چھوڑے، جُرأت اور خواجہ حسن انھیں کے شاگرد تھے، ان کا کلام پاکیزہ ہوتا تھا اور زبان کی صفائی و موزونی ترکیب کے لحاظ سے خاص پایہ کا تھا، غزل گوئی ان کے جذبات پر مبنی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ میر نے لکھنؤ پہونچ کر جو رنگ پیدا کر دیا تھا وہ ایک ربع صدی بعد تک بھی قائم رہا، ذیل کے اشعار سے حسرت کا ذوقِ سخن ظاہر ہوگا۔ ؎

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا
تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا

بہاریں ہم کو بھولیں، یاد ہے اتنا کہ گلشن میں
گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

روتے ہی اس کو گذرے ہے ہجر میں تیرے رات دن
حال میں کیا بیاں کروں حسرتِ بے قرار کا

یہ بھی اک ستم تھا کہ خواب میں مجھے شکل اپنی دکھا گئے
کبھی نیند برسوں میں آئی تھی، سو وہ اس طرح سے جگا گئے

ذیل کا شعر ان کا ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ؎

تمہیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کم خالی
چلو! بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی نہ ہم خالی

(طبقۂ متوسطین کے دوسرے دور میں جُرأت، مصحفی و انشا نے جتنی شہرت پائی وہ کسی کو نصیب نہیں ہو انشاء اللہ خاں انشا، اس میں کلام نہیں کہ بلا کے ذہین شخص تھے اور دنیا کی کوئی حرکت ایسی نہیں جسے نہ کہہ سکتے ہوں لیکن جس چیز کا نام تغزل ہے وہ ان کے حصہ میں نہ آسکی) قسمت بے شک بہت اچھی تھی کہ نواب سعادت علی مزاج میں درخورِ حاصل ہوگیا اور مصحفی ایسے باکمال شخص کی کچھ نہ چل سکی۔

مصحفی کا نام غلام ہمدانی تھا اور شیخ ولی محمد ان کے باپ کا نام تھا، اصل وطن امروہہ تھا لیکن اوائل عمر میں دہلی آگئے تھے اور یہیں درسیات کی کتابیں ختم کیں یہ زمانہ وہ تھا جب دہلی میں ہر طرف شعر و شاعری کے چرچے تھے اور چونکہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی موزونیت اس فن کی رکھتے تھے اسلیے اُنھی صحبت میں رہنے لگے ان کا سنہ ولادت غالباً ۱۱۶۴ھ ہے۔ جب احمد شاہ بادشاہ دہلی میں حکمراں تھے لیکن دہلی پہونچے یہ شاہ عالم کے زمانے میں، جب دہلی اُجڑنے لگا تو یہ بھی وہاں سے نکلے اور سیدھے کٹیھر (ٹانڈہ) پہونچے، یہاں قائم نواب محمد یار خاں کی سرکار سے متوسل تھے ان کی وساطت سے

رسائی ہوگئی اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔ جب نواب پر زوال آیا تو فیض آباد آگئے۔ یہ زمانہ شجاع الدولہ کا تھا لیکن چونکہ شجاع الدولہ مرہٹوں کے خلاف جنگ کررہا تھا اس لیے یہ پھر دہلی واپس گئے اور چند دن رہ کر وہاں سے پھر لکھنؤ آئے۔ او[ر] مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوگئے لیکن افسوس ہے کہ ان کی خاطر خواہ قدر نہ ہوئی، انشاؔ نے ہمیشہ اور ہر جگہ ا[ن] کو زک دی اور چونکہ مسخرہ پن میں یہ اس کے مقابل نہ تھے اس لیے جیت اس کی رہتی تھی، آب حیات میں ان دونوں کی [نو]ک جھونک کے بہت سے واقعات درج ہیں۔

مصحفی اپنی ہمہ گیر طبیعت کے لحاظ سے بالکل سوداؔ تھے اور کسی صنف سخن میں عاری نہ تھے لیکن اگر محض تغزل کو سامنے [رکھا] جائے تو وہ یقیناً سوداؔ سے بلند تر مرتبہ رکھتے تھے، مشکل زمینوں میں بغیر کسی تکلف کے بہترین اشعار نکالنا ان کی خصوصیت تھی [پ]ر گوئی کا یہ عالم تھا کہ باوجود ہزاروں غزلیں فروخت کردینے کے آٹھ دیوان اپنے بعد چھوڑ گئے جو اب کمیاب ہیں۔

اِس میں شک نہیں کہ حکومت وقت نے ان کی قدر نہ کی لیکن لکھنؤ کی شاعری ہمیشہ ان کی زیر بار احسان رہیگی کیونکہ بعد کو [جت]نے نامور شاعر وہاں پیدا ہوئے وہ سب مصحفی کے شاگرد یا ان کے شاگردوں کے شاگرد تھے، ناسخؔ انھیں سے مستفید ہوئے [آ]تشؔ نے ان سے فائدہ اُٹھایا، متاخرین میں امیرؔ انھیں کے شاگرد تھے اور انیسؔ و دبیرؔ جن کی زباں دانی کو دنیا نے تسلیم کیا [ا]نھیں کے ارادتمند تھے۔

آزاد اپنی آب حیات میں انشاؔ، کا ذکر مصحفی کے مقابلے میں بہت بڑھا چڑھا کے کرتے ہیں، حالانکہ جس حد تک شاعری کا [تع]لق ہے انشاؔ، کو مصحفی سے کوئی نسبت نہ تھی، یہ اور بات ہے کہ قسمت نے یاوری نہ کی اور انشاؔ کی طرح امیرانہ زندگی نہ بسر کرسکے انھوں نے ۹۰ سال کی عمر میں سنہ ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا، غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا یہیں مدفون ہوئے[1]۔

---

[1] بعض مشہور اشعار مصحفی کے یہ ہیں۔

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم　　تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا　　کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

یار کا صبح تک ہے وعدۂ وصل　　ایک شب اور بھی جیے ہے ہے

جب اس نے اٹھائی تیغ ہم پر　　ہاتھوں کی پناہ ہم نے کرلی

تلوار کو کھینچ ہنس پڑے وہ　　ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے　　دل ہے گویا چراغ مفلس کا

(میر انشاء اللہ خاں انشا، مرشد آباد میں پیدا ہوئے اور شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں دہلی پہونچے اپنی ذہانت و بذلہ سنجی سے یہاں چھا گئے، درباری شاعروں میں دوسرے شعراء سے بڑی نوک جھونک رہی، جب دیکھا کہ شاہ عالم کے پاس کچھ نہیں رہا تو آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ آئے اور مرزا سلیماں شکوہ (شاہ عالم بادشاہ کے بیٹے) کے دربار میں پہونچے یہاں بھی اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے اقتدار قائم کر لیا اس وقت مصحفی بھی اس دربار سے مستفید تھے لیکن انشا نے انھیں نیچا دکھا کے خود ان کی جگہ حاصل کر لی اور پھر رفتہ رفتہ نواب سعادت علی خاں کے دربار میں پہونچ گئے اور بڑا عروج حاصل کیا، لیکن سنہ ۱۲۲۵ھ میں دربار سے نکالے گئے کیونکہ نواب سعادت علی خاں بہت سنجیدہ شخص تھا اور وہ ان کے مسخرہ پن کو زیادہ برداشت نہ کر سکا، سعادت علی خاں کے بعد نواب وزیر نے اپنی چند ماہ کی حکومت میں ان کو لکھنؤ سے نکال دیا لیکن چند دن بعد پھر بلا لیے گئے اور سنہ ۱۲۳۳ھ میں انتقال کیا)

(اس میں شک نہیں کہ انشا، بڑا فاضل شخص تھا اور ذہانت تو اس کا حصہ تھا لیکن افسوس ہے کہ اس نے اس فطری ودیعت سے صحیح کام نہ لیا اور ساری عمر مسخرہ پن میں بسر ہو گئی)[۱]

شیخ قلندر بخش جرأت دہلی کے باشندے تھے لیکن ان کا نشو و نما فیض آباد میں ہوا، عنفوان شباب میں بینائی جاتی رہی اور موسیقی کا شوق پیدا ہوا، ستار اچھا بجاتے تھے، مشق سخن جعفر علی حسرت سے کی، اول اول محبت خاں کے سرکار میں ملازم ہوئے اور بعد کو مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے، انشا سے ان کی بھی خوب چوٹیں چلیں اور سنہ ۱۲۲۵ھ میں بعہد نواب سعادت علی خاں انتقال کیا، آب حیات میں انکی زندگی کے واقعات اور ان کے لطائف تفصیل کے ساتھ درج ہیں

---

[۱] انشا کے بعض مشہور شعر یہ ہیں :-

✓ نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

✓ گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے — زاہد نہیں، میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

✓ عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے — کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

✓ غصے میں ترے ہم نے بڑا لطف اٹھایا — اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

یہ صرف غزل گو شاعر تھے اور سادگی کے لحاظ سے میر کے تبع کہلائے جاتے ہیں لیکن انھوں نے معاملاتِ حسن و عشق کو زیادہ ادنیٰ سطح پر آکر بیان کیا اور اسی لیے یہ ایک خاص طرز کے موجد سمجھے جاتے ہیں جس میں شوخی و بیباکی بلکہ عریانی کا عنصر غالب ہے۔

انھیں کے ہم عصر شیخ غلام علی راسخ بھی تھے ان کا وطن عظیم آباد تھا لیکن عمر کا زیادہ حصہ لکھنؤ میں بسر ہوا، میر کے شاگرد تھے اور ایسے شاگرد تھے کہ کبھی اپنے استاد کے رنگ سے تجاوز نہ کیا، ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۰ سال کی عمر پاکر ۱۲۳۲ھ میں بعہد غازی الدین حیدر انتقال ہوا، کلام کا رنگ یہ تھا:

ضبطِ گریہ تو ہے پر دل پہ جو اک چوٹ سی ہے　　قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

تھا جی میں کہ دشواری ہجر اس سے کہیں گے　　پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا

مرزا سعادت یار خاں رنگین بھی اسی دور کے شاعر تھے اور ریختی کے ایجاد کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے تھے رنگین سرہند میں پیدا ہوئے لیکن نشو و نما دہلی میں ہوا، سپاہی زادہ تھے اور یہی اُن کی زندگی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ شعر و سخن کا بھی شوق تھا، شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے، آدمی بہت ذہین بذلہ سنج اور بیباک تھے، انھوں نے اردو کے چار دیوان اپنے بعد چھوڑے جن کے نام ریختہ، بیختہ، آمیختہ، اور انگیختہ ہیں، تیسرا دیوان ہزلیات کا ہے۔ انشا کے بڑے دوست تھے اور دونوں میں بہت بنتی تھی، ان کی ایک مثنوی دلپذیر بہت مشہور ہے اور چند کتابیں اور بھی لکھی ہیں، ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۵۱ھ میں اسّی سال کی عمر پاکر انتقال کیا

جرأت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا　　چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

آئے جو مرے پاس تو منہ پھیر کے بیٹھے　　یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا

خدا جانے کرے گا چاک کس کس کے گریباں کو　　ادا سے ان کا چلنے میں اُٹھا لینا یہ داماں کا

ناصح میں اور ہم میں ہیں یہ طرفہ صحبتیں　　ہم کچھ نہیں سمجھتے وہ سمجھائے جاتے ہیں

باوجود فحاشی و ہزل گوئی کے ریختہ میں اسی جذباتی رنگ کی جھلک نمایاں ہے جو اس عہد کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً ؎

جو نامہ رات کو لب سے نہ ہٹ گیا ہوتا
تو ساتھ آہ کے سینہ بھی پھٹ گیا ہوتا

تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے
مجھ کو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے

جو ترے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں یہی
کیوں جی! کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

اس دور کا ذکر نا تمام رہے گا اگر مصحفی کے شاگرد نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس کا ذکر نہ کیا جائے، یہ اصل میں فیض آباد کے رہنے والے تھے لیکن نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، ان کے کلام میں بالکل میر کا لطف آتا ہے اور ان کے کلام کا اقتباس ایک قلمی نسخہ سے نگار اپریل ۱۹۳۳ء میں شایع ہو چکا ہے[1]، مصحفی کے شاگردوں میں شہیدی بھی خاص چیز تھے، لیکن افسوس ہے کہ دنیا نے ان کی طرف توجہ نہ کی ان کا نام کرامت علی تھا، عبدالرسول خاں کے بیٹے تھے، وطن بانس بریلی تھا لیکن نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، پہلے مصحفی کی شاگردی اختیار کی اور ان کے انتقال پر شاہ نصیر کی، چھاؤنی نیمچ میں ملازم ہو گئے تھے، لیکن حساب میں خود برد ہونے کی وجہ سے علحدہ کر دیے گئے ۱۲۵۶ھ میں حج کی غرض سے روانہ ہوے لیکن مدینہ منورہ کے قریب پہونچ کر انتقال ہو گیا، سوز و گداز ان کے کلام میں بہت پایا جاتا ہے، نعت میں ان کی غزلیں بہت مقبول ہوئیں لیکن عاشقانہ رنگ کا کلام بھی خوب ہوتا تھا، چند اشعار ذیل میں ملاحظہ ہوں،

عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی سب پے
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

اندوہ دائمی میں کٹے کس خوشی سے غم
گر مجھ کو غم نہ ہو طرب گاہ گاہ کا

---

[1] چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

شغل شب تنہائی کس سے کہیں ہم اپنا
دو چار گھڑی رو کر بہلاتے ہیں غم اپنا

عاشق تو تھا ہوس کہو دیوانہ کب ہوا
لو اٹھ گیا حجاب بڑا ہی غضب ہوا

آ چکا تھا صاف میرے سامنے وہ بے حجاب
کچھ یونہی اک شرم کا پردہ سا حائل ہو گیا

کیا جانے دل ہی دل میں وہ کرتا تھا کس کا ذکر
ہر دم زبان یار پہ یادش بخیر تھا

گذشتگان زمانہ کا تم نہ وصف کرو
یہی غم و الم اُس روزگار میں بھی تھا

جس سے کل خون میں ڈوبا قفس اے مرغ اسیر
تو نے پھر آج وہی زمزمہ بنیاد کیا

✓ کرچکے نیم نگہ پر مرے دل کا سودا — نہ خرید یہ ابھی اور بھی ارزاں ہوگا

رحم آتا ہے مجھے اس نوجوانی پر تری — اے شہیدی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

وہ وقت تو آنے دے بتا دینگے شہیدی — بن آئے کسی شخص پہ مرجاتے ہیں کیسے؟

دل کے جانے کا شہیدی واقعہ ایسا نہیں — کچھ نہ رُوے آہ گر ہم عمر بھر رو دیا کیے

(متاخرین کے اول دور میں شاہ نصیر، ناسخ، آتش، ذوق، مومن و غالب بڑے مشہور شاعر ہوئے ہیں، سنہ وفات کے لحاظ سے ان کی ترتیب یوں ہوتی ہے:- ناسخ، شاہ نصیر، آتش، مومن، ذوق و غالب) لیکن چونکہ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کا زمانہ دیکھا تھا اس لیے ان سب کا ذکر دور متاخرین میں ہونا چاہیے۔

شاہ نصیر الدین دہلی کے رہنے والے تھے اور شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے، شاہ عالم کے دربار میں انکی بھی رسائی ہوگئی۔ لیکن انھوں نے بھی دوسرے شعرا کی طرح ہجرت کی اور لکھنؤ آئے، یہ زمانہ مصحفی و انشاء کا تھا اس لیے یہ سمجھ کر کہ ان کے آگے انھیں کون پوچھے گا واپس آئے، دوبارہ جب گئے تو ناسخ و آتش کی دھوم تھی، مجبوراً حیدرآباد کا رُخ کیا، یہاں مہاراجہ چندولال وزیر تھے بڑی قدر ہوئی، اس کے بعد یہ تین بار دہلی واپس آئے اور پھر حیدرآباد پہونچے آخری مرتبہ مہاراجہ چندولال نے سات ہزار روپیہ بھیج کر ان کو دعوت دی اور پچیس روپیہ روزانہ مقرر کردیا، چنانچہ یہیں رہ گئے اور ۱۲۵۴ھ میں انتقال کیا، ان کے کلام میں سوائے شوکت الفاظ کے اور کچھ نہیں ہے، نئی نئی تشبیہیں نئے نئے استعارے ڈھونڈھنا ان کا خاص ذوق تھا زمینیں بھی انھوں نے نئی نئی اور مشکل پیدا کیں، کچھ پُرانے الفاظ بھی انھوں نے متروک کیے اور زبان کی صفائی کا بھی کافی لحاظ رکھا،

ان کے کلام کا بہتر نمونہ ملاحظہ ہو:-

✓ خیال زلف بتاں میں نصیر پیٹا کر — گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

✓ دیکھ لیتی جو اُٹھا کر تو ترے ٹوٹتے ہاتھ — لیلیٰ اتنا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

آج کچھ ہم کو نہ تھی فرصت یکدم کی خبر — نے جواب لب جو تو نے یہ عقدہ کھولا

✓ ہر تیغ کو الٹ منھ سے جو کرتا ہی تو باتیں — اب میں ہمہ تن گوش ہوں یا ہمہ تن چشم

وجہ معلوم تو ہو چیں بجبیں ہونے کی — سچ کہو جی میں ہے کیا کس سے لڑا چاہتے ہو

(شیخ امام بخش ناسخ لکھنؤ کے بہت مشہور شاعر ہوئے ہیں اور اس لحاظ سے کہ لکھنؤ کی شاعری میں آورد و تصنع سب سے پہلے انہوں نے پیدا کیا تاریخ میں ہمیشہ خصوصیت کے ساتھ یاد رکھے جائیں گے

فیض آباد میں پنجاب کا کوئی خیمہ دوز خدا بخش نامی تھا اسی کے بیٹے تھے یا یہ کہ اس نے متبنّی کر لیا تھا، بچپن فیض آباد میں بسر ہوا اور شروع سے پہلوانی و ورزش میں لگ گئے، نواب محمد تقی فیض آباد کے ایک امیر کے ساتھ لکھنؤ آئے، یہ زمانہ مصحفی و انشا کے ہنگاموں کا تھا، ان کو بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا، ابتدا میں مصحفی سے اصلاح لیتے رہے اور شاید مصحفی کے شاگرد محمد عیسیٰ تنہا سے بھی۔

اس زمانے میں لکھنؤ کے ایک رئیس میر کاظم علی تھے انہوں نے ناسخ کو متبنّیٰ کر لیا تھا جب وہ مرے تو اچھی خاصی دولت ان کے ہاتھ آئی اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگے، رفتہ رفتہ ان کی رسائی ایک امیرزادے مرزا حاجی کے دربار تک ہو گئی جو خود بھی ذی علم تھے اور اہل علم کا مجمع بھی ان کے یہاں رہتا تھا اس صحبت نے ناسخ کے دل میں نیا جوش و ولولہ پیدا کر دیا اور ان کی شاعری چمک گئی،

یہ زمانہ غازی الدین حیدر کا تھا اور وزراء کا تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا، ناسخ بھی چونکہ امراء و وزراء کے آدمیوں میں سے تھے اسلیے ان پر بھی عروج و زوال کی بہت سی ساعتیں آئیں اور بار بار بھاگ کر الہ آباد گئے جہاں دائرہ شاہ اجمل میں قیام ہوتا تھا، آخرکار محمد علی شاہ کے زمانے میں ان کو چین نصیب ہوا اور سو روپیہ ماہوار گھر بیٹھے ان کا مقرر ہو گیا[1] ۱۲۰۲ھ میں ان کی ولادت ہوئی اور ۱۲۵۴ھ میں وفات

انہوں نے اپنے بعد دو دیوان چھوڑے جن میں غزلوں کے علاوہ رباعیاں، قطعات اور تاریخیں بھی ہیں، قصائد کی طرف توجہ نہیں کی حالانکہ اس صنف میں یہ بہت زیادہ کامیاب ہوتے، غزل میں ان کا انداز یکسر تصنع تھا اور سوائے رعایت لفظی، شوکت الفاظ مبالغہ اور بیجا بلند پروازی کے جذبات سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے مگر زبان کی صفائی و صحت کی طرف بیشک توجہ کی اور بہت سے نامانوس الفاظ انہوں نے ترک کر دیے[2]۔)

---

[1] تذکرہ گل رعنا میں لکھا ہے کہ امجد علی شاہ کے زمانے میں ان کی تنخواہ بند ہو گئی تھی لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ناسخ کی وفات ۱۲۵۴ھ ہے اور امجد علی شاہ ۱۲۵۸ھ میں تخت نشیں ہوئے تھے

[2] ناسخ کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:-

سیکڑوں آہیں کر اُن پر دخل کیا آواز کا ~ تیر جو آواز دے ہے نقص تیر انداز کا

مانع صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں ~ دل دکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے ~ کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

فرقت قبول رشک کے صدمے نہیں قبول ~ کیا آئیں ہم رقیب تری انجمن میں ہے

کہیں کہیں اس رنگ کے بھی اشعار ہیں:-

تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو ~ ٹکڑے ہوتے ہیں جگر ناسخ تری فریاد سے

خواب ہی میں نظر آتا وہ شب ہجر کہیں ~ سو مجھے حسرت دیدار نے سونے نہ دیا

میں خوب سمجھتا ہوں مگر دل سے ہوں ناچار ~ اے ناصحو! بے فائدہ سمجھاتے ہو مجھکو

خواجہ حیدر علی آتش کا اصلی وطن دہلی تھا، نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں ان کے والد خواجہ علی بخش دلی سے فیض آباد آئے اور آتش یہیں پیدا ہوئے اوائل عمر میں یتیم ہو گئے اور بُری صحبت میں بانکے بن بیٹھے نواب محمد تقی کے ساتھ لکھنؤ آئے تو جرأت، انشاء و مصحفی کی دھوم مچی ہوئی تھی ان کو بھی شوق پیدا ہوا اور مصحفی کے شاگرد ہو گئے استعداد علمی کم تھی لیکن آدمی ذہین تھے اس لیے مصحفی کی صحبت نے ان کو چمکا دیا اور غزل گوئی میں بڑی شہرت حاصل کی بادشاہ نے پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا، لیکن آدمی رند منش اور دوست پرست تھے اس لیے ہمیشہ عسرت میں بسر ہوئی، آخر عمر میں معالی خاں کی سرائے میں اٹھ آئے تھے اور یہیں سنہ ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا، جو وضع شروع میں اختیار کر لی تھی اسے اخیر دم تک نباہا، اپنے بعد ایک دیوان چھوڑ گئے جس میں صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں زبان کی صحت و صفائی میں ناسخ سے کسی طرح کم نہیں ہیں اور سوز و گداز کے لحاظ سے ان سے کہیں برتر و فائق ہیں[1] ان کے شاگردوں میں میر دوست علی خلیل، میر وزیر علی صبا، نواب محمد علی خاں رند، آغا حجو شرف، نواب مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنؤ اسکول کے مشہور شعراء میں تھے، شوق اور نسیم نے اپنی مثنویوں کی وجہ سے خاص شہرت حاصل کی اور خلیل، صبا، اور رند نے اپنی غزلوں کی وجہ سے جن میں گل و بلبل، رعایت لفظی اور ناموزوں بلند پروازی کے سوا اصل تغزل بہت کم ہے۔

ناسخ کے شاگردوں میں خواجہ محمد وزیر وزیر نے خاص شہرت حاصل کی، یہ خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے اور وطن کے اعتبار سے لکھنوی تھے، استعداد علمی اچھی تھی اور ہمیشہ گوشہ نشین رہے، واجد علی شاہ نے طلب کیا بھی تو نہیں گئے سنہ ۱۲۷۰ھ میں انتقال ہوا رنگ شاعری بالکل وہی تھا جس کی بنیاد ناسخ نے ڈالی تھی اس لیے غزلوں میں ان کی کیفیت نہیں پائی جاتی اور رعایت لفظی پر عبارت کی عمارت کھڑی کر دینا ان کا خاص ذوق تھا[2]

---

[1] آتش کے بعض مشہور شعر یہ ہیں:-

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر	دل سے دشمن کی شکایت کا گلہ جاتا رہا
آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے	میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا	جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے	ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
موت مانگوں تو رہے آرزوِ خواب مجھے	ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

[2] وزیر کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شاد ماں ہو کر	زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر
کیا قتل اس نے غیروں کو مرے ہم رشک کے مارے	اجل بھی دوستو آئی نصیبِ دشمناں ہو کر
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو	کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو
ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے	فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

ناسخ کے دو شاگرد اور بھی مشہور ہوئے، مرزا محمد رضا برق اور میر علی اوسط رشک

برق، واجد علی شاہ کے مصاحب مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے تھے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ناسخ کے شاگرد ہو کر مشق سخن کی، فنون سپہ گری سے بھی واقف تھے، واجد علی شاہ کے زمانے میں بہت ترقی کی اور ان کے کلام میں اصلاح بھی دی، بادشاہ کے ساتھ مٹیابرج بھی گئے تھے، اور وہیں ۱۲۷ھ میں انتقال کیا، آدمی بہت پُر گو تھے لیکن رنگ وہی تھا جو اس زمانے میں ناسخ کی وجہ سے مقبول عام ہو چکا تھا، اپنے بعد ایک دیوان چھوڑ گئے جس میں غزلوں کے علاوہ رباعیاں، قطعات اور مسدس وغیرہ بھی نظر آتے ہیں[1]

میر اوسط علی رشک فیض آباد کے رہنے والے تھے لیکن ان کا نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، صاحب استعداد آدمی تھے، شاعری میں ناسخ کے شاگرد تھے اور تصحیح زبان و تحقیق لغات میں خصوصیت کے ساتھ مشہور تھے، تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا، انھوں نے ناسخ والنس سے بھی زیادہ زبان کی طرف توجہ کی اور بہت سے ایسے الفاظ جو بول چال میں استعمال ہوتے تھے انھیں بھی شعر میں داخل کیا، ان کی شاعری کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ الفاظ کے استعمال کی راہیں بتائیں، انھوں نے ۱۲۵۵ھ میں ایک لغت بھی "نفس اللغت" کے نام سے مرتب کیا تھا آخر عمر میں کربلائے معلی چلے گئے تھے اور وہیں ۱۲۸۴ھ میں وفات پائی، انھوں نے اپنے بعد تین دیوان چھوڑے، دو خود انھوں نے چھپوائے ایک ضایع ہو گیا[2]

ناسخ کے ایک اور شاگرد شیخ امداد علی بحر بھی کافی مشہور ہوئے ہیں، الفاظ کی تحقیق و صحت اور فن عروض کے لحاظ سے رشک کے بعد ناسخ کے شاگردوں میں انھیں کا مرتبہ ہے۔

تقریباً ۱۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے لکھنؤ وطن تھا اور یہیں نشو و نما ہوا، تذکرۂ گل رعنا میں لکھا ہے کہ چھوٹی شہزادی کی سرکار سے کچھ وظیفہ مقرر تھا، انھیں کی ڈیوڑھی پر پھاٹک کی بغل میں ایک کمرہ تھا وہیں افیون گھلا کرتی تھی ایک بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے رہتے

---

[1] برق کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

قیس کا نام نہ لو، ذکر جنوں جانے دو — دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

اٹھ کے آئینہ دکھلا دیا اسے میں نے — نہ سوجھی عارض گلگوں کی جب مثال مجھے

اذاں دی کعبے میں ناقوس دیر میں پھونکا — کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

[2] رشک کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

محفل میں شمع، چاند فلک پر، چمن میں پھول — تصویر روے انور جاناں کہاں نہیں

کہاں یہ لطف چیتے نے اگر پائی کمر پتلی — تمھارے ہونٹ پتلے، انگلیاں پتلی، کمر پتلی

فقط تجھ میں عناصر نے عجب ترکیب پائی ہے — بدن شفاف، شانے گول، قد موزوں، کمر پتلی

اسی جگہ لوگ دور دور سے تحقیق الفاظ کے لیے آتے، توپ دروازے میں کچا سا مکان تھا، شام کو وہاں آجاتے، بیوی تھیں اور آپ، بعض کا بیان ہے کہ ایک لڑکا بھی تھا اور ایک لڑکی بھی، اخیر عمر میں نواب کلب علی خاں نے طلب کیا اور تنخواہ مقرر کردی لیکن وہاں جی نہ لگا اور پھر لکھنؤ واپس آئے، نہایت وارفتہ مزاج آدمی تھے اس لیے دیوان مرتب نہیں کیا، ان کے دوستوں نے بعض غزلیں جمع کرکے چھپوا دیں، سنہ ۱۳۰۱ھ میں انتقال ہوا، کلام بہت صاف ہوتا تھا اور فی الجملہ دلکشی بھی اس میں پائی جاتی تھی، چند اشعار درج ذیل ہیں:

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا
میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ
اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

گئی برسات، گذرا سال یہ بھی آہ و شیون میں
خبر ہم کو نہیں بادل کدھر آیا کدھر برسا

آتش کے شاگردوں میں بہ لحاظ اصلاح زبان آغا حجو شرف کا مرتبہ بہت بلند ہے، انھوں نے فارسی کے بہت سے الفاظ جو رندی و ہوسناکی کا اظہار کرنے والے تھے ترک کر دیے اور اس لیے ان کے کلام میں ایک حد تک تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے، یہ واجد علیشاہ کے سمدھی تھے اور انھیں کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے تھے[1]

میر دوست علی خلیل بھی آتش کے مشہور شاگردوں میں تھے، باپ کا نام سید جمال علی تھا اور بڑولی کے رہنے والے تھے نواب نادر مرزا کے ساتھ یہ بھی کلکتہ چلے گئے تھے، ان کے کلام میں سوائے رعایت لفظی کے اور کچھ نہیں[2] ہے

---

[1] آغا حجو شرف کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں

ٹھیرا گیا ہے لاکے جو منزل میں عشق کی
کیا جانے رہنما تھا، کہ رہزن تھا، کون تھا؟

نکل کے جاؤں کدھر تیری انجمن کے سوا
چمن کی بو ہوں بسوں پھر کہاں چمن کے سوا

در دِل بھی انھیں صیاد نے کھلنے نہ دیا
رہ گئے مرغ قفس کھول کے منقاروں کو

[2] خلیل کا نمونۂ کلام یہ ہے

بزم سے یار نے یہ کہہ کے نکالا ہم کو
اُٹھیے، گھر جائیے، دم لے چکے، ستائے بہت

مسافر رہ نا آشنائے منزل ہیں
مثال ریگ رواں جائیں گے کہاں دیکھیں

جنوں میں بھی یہی دھن ہے کوئی ادھر لے جائے
جدھر وہ دشمن ہوش و حواس رہتا ہے

میر وزیر علی صبا بھی آتش کے مشہور شاگرد تھے، باپ کا نام میر بندہ علی تھا اور وطن لکھنؤ، ادبیات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ شاعری کا بھی شوق ہوا ۱۲۷۱ھ میں رحلت کی، ان کا دیوان، غنچۂ آرزو کے نام سے شایع ہو چکا ہے، ان کو بھی صحت و صفائی کا بہت لحاظ تھا [1]

آتش کے شاگردوں میں رند کو خاص شہرت حاصل ہوئی، ان کا نام سید محمد خاں تھا اور نواب غیاث الدین نیشاپوری کے بیٹے تھے جو برہان الملک کے بھانجے تھے ۱۲۱۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے اور نواب بہو بیگم کے انتقال کے بعد لکھنؤ چلے آئے (۱۲۳۰ھ) فیض آباد میں میر مستحسن خلیق سے مشق سخن کی اور لکھنؤ میں آتش سے پہلے دفا تخلص اختیار کیا بعد کو رند ان کے کلام میں نہ خیال کی نزاکت ہے نہ مضمون آفرینی لیکن فی الجملہ سادگی نے ہلکی سی تاثیر ضرور پیدا کر دی ہے، اخیر عمر میں دربار اودھ کی سازشوں سے گھبرا کر عتبات عالیات کی طرف ہجرت کے خیال سے لکھنؤ چھوڑا لیکن بمبئی پہونچ کر انتقال کر گئے [2]

اس زمانہ میں ہر چند دلی بالکل تباہ ہو چکی تھی اور بہادر شاہ ظفر صرف قلم کے بادشاہ رہ گئے تھے لیکن پھر بھی وہاں کی خاک سے جو شاعر اٹھا، بہر دوام ثبت کر کے گیا، کون ہے؟ جو ذوق، غالب و مومن کو نہیں جانتا اور ان کے کمال کا قائل نہیں، ذوق ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۱ھ میں انتقال ہوا، ان کی پیدائش سے ۸ سال بعد غالب عالم وجود میں آئے (۱۲۱۲ھ) اور ۱۲۸۵ھ تک زندہ رہے مومن ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۸ھ تک زندہ رہے، مومن و غالب کے متعلق نگار میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس کے اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں، ذوق کے حالات سے بھی دنیا ناواقف نہیں، ذوق و غالب کی چھیڑ چھاڑ کا حال تذکروں میں موجود ہے اور مومن کے استغنا سے بھی ہر شخص واقف ہے، ذوق فن شعر کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، بڑے پرگو، نہایت مشاق اور فن عروض کے بڑے ماہر تھے، ان کا کلام اغلاط سے پاک نظر آتا ہے، سودا کے بعد قصائد میں ذوق ہی کا نام سامنے آتا ہے لیکن تغزل میں غالب و مومن کو

---

[1] صبا کے بعض مشہور اشعار یہ ہیں

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے — خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

[2] رند کا رنگ سخن ملاحظہ ہو

پھینک دوں دل کو، ابھی چیر کے پہلو اپنا — تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد — میں ماجرائے چمن کیا بیاں کروں صیاد

دکھایا کنج قفس مجھکو آب و دانے نے — دگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

وعدے پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے — کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

پہ نہیں پہونچتے، غالب کا اردو کلام ہر چند بہت مختصر ہے لیکن ہر رنگ کے پھولوں کا نہایت دلکش گلدستہ ہے، مومن کا رنگ تغزل اتنا لطیف اتنا دلکش اس درجہ موثر ہے کہ ان کا مثل پھر پیدا نہ ہو سکا، انداز بیان کا تنوع ان کا حصہ تھا اور بات میں بات پیدا کرنا ان کی خصوصیت تھی ہر چند ان کی شاعری درد و میر کی طرح اُن جذبات عالیہ کا نتیجہ نہیں جنھیں تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ صرف جنسی محبت سے بحث کرتی ہے لیکن کمال یہی ہے کہ مومن نے بلندی جذبات کو یہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اور جو کچھ کہہ گئے اس میں اضافہ کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔

ذوق کا تغزل اشعار ذیل سے واضح ہو گا

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

رکھے ہے خنجر قاتل سے یوں گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پیے لہو میرا

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا اسے کیا اضطراب میں

دیکھا دم نزع دل آرام کو
عید ہوئی ذوق ترے شام کو

رُخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھُجلائے ہے

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

مومن کا مخصوص رنگ ملاحظہ ہو۔

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہمنفس نزاکت آواز دیکھنا

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

کسی نے گر کہا مرتا ہے مومن
کہا میں کیا کروں، مرضی خدا کی

غالب کے چند مشہور اشعار یہ ہیں:-

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

اک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

مومن، غالب و ذوق کے علاوہ، میر نظام الدین ممنون بھی اس زمانے کے اچھے شاعر تھے، یہ میر قمر الدین منت کے بیٹے تھے جن کا وطن سونی پت تھا، لیکن مولانا شاہ عبد العزیز سے قرابت قریبہ رکھنے کی وجہ سے دہلی آ گئے تھے، ممنون یہیں پیدا ہوئے اور اسی جگہ اپنے والد سے مشق سخن کی، اکبر شاہ کا زمانہ تھا، بہت سے لوگ ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور کہا جاتا ہے کہ مفتی صدر الدین آزردہ بھی انھیں سے مشورہ لیتے تھے، یہ لکھنؤ بھی آئے تھے اور سرکار اودھ نے ان کی بڑی قدر کی، بعد کو انگریزی حکومت نے ان کو اجمیر کا صدر الصدور بنا دیا، ضعیفی میں دلی چلے آئے اور سنہ ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا، انکا ایک ضخیم دیوان تھا جس میں زبان کی شیرینی و صفائی اور چستی بندش کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مثالاً چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

الٰہی وہ جو وعدے ہیں وفا کس طرح ہو دیں گے نہ واں خو یاد آنے کی نہ یاں شیوہ تقاضے کا

یہ نہ جانا تھا کہ اس محفل میں دل رہ جائے گا ہم یہ سمجھے تھے چلے آئیں گے دم بھر دیکھ کر

کون آئے ہے کہ سینے میں بیدار ہو گئیں صد آرزوئے خفتہ صدائے قدم کے ساتھ

تفاوت قامت یار و قیامت میں ہے کیا ممنوں وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

ممنوں مباد آئے کوئی ہجر ناگہاں ناکامیوں سے وصل ہی میں آؤ خو کریں

غالب کے شاگردوں میں زکریا خاں ذکی، میر مہدی حسن مجروح، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، خواجہ الطاف حسین حالی اور انور بڑے پایہ کے شاعر گزرے ہیں لیکن ان کا شمار متاخرین کے دوسرے دور میں ہے۔

مومن کے شاگردوں میں سالک اور نسیم استادانہ رنگ رکھتے تھے لیکن نسیم نے بہت شہرت حاصل کی، نسیم کے شاگرد تسلیم تھے اور تسلیم کے حسرت موہانی جن کو اس دور کا امام المتغزلین کہنا چاہیے۔

ذوق کے شاگردوں میں سید ظہیر الدین ظہیر نہایت اچھا کہنے والے تھے

(متاخرین کے دوسرے دور میں نسیم، تسلیم، اسیر، منیر، امیر، داغ، جلال، میاں نظام شاہ رام پوری، امانت، قلق، بحر، سحر

اور غالب کے بعض شاگرد جن کا ذکر اوپر آچکا ہے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں)

اصغر علی خاں نسیم، نواب آقا علی خاں قاچار کے بیٹے تھے، دلی میں پیدا ہوئے یہیں نشو ونما پایا اور مومن کی شاگردی اختیار کی، غدر سے کچھ دن پہلے لکھنؤ آئے، واجد علی شاہ کا زمانہ تھا، بعض امرائے ان کی شاگردی اختیار کی اور ۱۲۸۲ھ میں انتقال کیا، بڑے وارستہ مزاج شخص تھے اور مثنوی خوب لکھتے تھے، غزلوں میں بھی انھوں نے دہلوی رنگ نہیں چھوڑا اور روانی و سلاست تو انکا حصہ ہے اور ساقی نامے تو قیامت کے لکھے ہیں،

رنگ سخن یہ تھا۔

کہے دیتی ہیں یہ نیچی نگاہیں	کہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا
نام میرا سنتے ہی شرما گئے	تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا
ہاتھ میں خنجر، کمر میں تیغ تیز	یہ اڑا دے ایک مشتِ خاک پر
آنکھوں میں ہے لحاظ، تبسم فزا ہیں لب	شکر خدا کہ آج تو کچھ راہ پر ہیں آپ
گلہ میں بخت کے اُن کا بھی کچھ قصہ نکل آیا	ہوئی تھی صلح کس مشکل سے پھر جھگڑا نکل آیا

میر مظفر علی خاں اسیر، میر مدد علی کے بیٹے تھے اور امیٹھی میں پیدا ہوئے، جو لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے ادبیات کے فاضل تھے اور شاعری میں مصحفی کے شاگرد، نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ملازم ہوئے امجد علی شاہ کے عہد میں میر منشی ہوگئے لیکن نواب امین الدولہ پر زوال آیا تو یہ بھی قید میں ڈال دیے گئے بعد کو واجد علی شاہ نے انھیں رہا کر کے تنخواہ مقرر کر دی اور تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ کا خطاب مرحمت کیا، انتزاع سلطنت کے بعد رام پور پہنچے، نواب یوسف علی خاں ان کے شاگرد ہوئے اور نواب کلب علی خاں نے بھی ان کی قدر کی، ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا، بڑے پُرگو شاعر تھے اور فن شعر کے اچھے جاننے والے تھے، ان کا رنگ تغزل اپنے استاد مصحفی سے بالکل علیحدہ ہے اور ناسخ کا رنگ ہر جگہ نمایاں ہے، انکے شاگردوں میں

امیر مینائی، احمد علی شوق اور ریاض خیر آبادی نے اچھی شہرت حاصل کی، ان کے بیٹے حکیم وافضل بھی شاعر تھے اور اپنے باپ کے قدم بقدم چلتے تھے۔

سید ظہیر الدین ظہیر، سید جلال الدین حیدر کے بیٹے تھے اور دہلی کے رہنے والے تھے، درسی کتابیں ختم کرنے کے بعد ۱۴ سال کی عمر میں ذوق کے شاگرد ہوگئے، غدر کے وقت لکھنؤ کے ارادہ سے نکلے لیکن یہ معلوم کرکے کہ وہاں انگریزوں کا قبضہ ہوگیا ہے رام پور چلے گئے، یہاں چار برس رہ کر پھر دہلی واپس گئے، اس کے بعد اخبار جلوۂ طور کی اڈیٹری کی جو بلند شہر سے نکلتا تھا، اس کے بعد مہاراج شیو دان سنگھ والیٔ الور نے انھیں بلالیا اور کافی قدر کی، مہاراجہ کے اختیارات سلب ہونے کے بعد پھر دہلی واپس آئے اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور میں ملازم ہوگئے اور ۱۹ سال تک یہیں رہے، مہاراجہ رام سنگھ کے مرنے پر نواب احمد علی خاں نے ٹونک بلا بھیجا اور ۱۵، ۱۶ سال تک ٹونک میں رہے، اسی زمانے میں حیدرآباد گئے اور مہاراجہ کشن پرشاد نے چالیس روپیہ ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کردیا، ان کے تین دیوان چھپ گئے ہیں لیکن چوتھا دیوان طبع نہیں ہوسکا ظہیر ہرچند شاگرد ذوق کے تھے لیکن مومن کا رنگ ان پر غالب تھا، وہی لطیف ترکیبیں، وہی دلنشیں الفاظ اور وہی رنگین کنائے جو مومن کی خصوصیات تھیں ان کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، دہلوی اسکول کی یہ آخری یادگار تھے اور ان کے ساتھ ہی یہ رنگ ہمیشہ کیلئے ختم ہوگیا ذیل کے چند اشعار سے اُن کا رنگ سخن واضح ہوسکے گا۔

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا
نگاہ شرمگیں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا

تصوّر میں وصال یار کے ساماں ہوتے ہیں
ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا

قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر بے نیازی سے
بڑھا جاتا ہے یاں شوقِ سجودِ آستاں کیا کیا

اعجازِ دلفریبیٔ انداز دیکھنا
ہر ہر ادا پہ مجھ کو گمانِ نظر رہا

ہر پرہیزِ عشق سے مجھے وحشت فزوں ہوئی
میں کچھ دوا سے اور بھی رنجور تر رہا

کیا بری شے ہے محبت بھی الٰہی توبہ
جرم ناکردہ خطاوار بنے بیٹھے ہیں

بہت ظہیر کو ہم یاد کرکے واں روئے
کہیں جو ذکرِ حریفانِ بادہ خوار آیا

سالک کا نام قربان علی تھا اور نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے، پیدا ہوئے حیدرآباد میں، نشو و نما ہوا دہلی میں، پہلے مومن کے شاگرد ہوئے پھر غالب کے، غدر کے زمانے میں الور بھاگ کر گئے لیکن وہاں سے حیدرآباد چلے گئے ۱۲۹۱ھ میں انتقال کیا ان کے دیوان کا نام ہنجار سالک ہے، ان کا کلام بھی بہت پاکیزہ ہے اور مومن کی جھلک زیادہ پائی جاتی ہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:-

اعتبارِ نگہِ ناز ہے کیا کیا ان کو — قتل کو آتے ہیں اور ہاتھ میں شمشیر نہیں

تم بھی وہی کہو تو کہے اک جہاں بجا — میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں غلط

پھرتے ہیں داد خواہ ترے حشر میں خراب — تو پوچھتا نہیں تو کوئی پوچھتا نہیں

نہیں کھلا ہم پہ اب سننے کی طاقت دل میں — پہلے سو بار ترا نام لیا کرتا تھا

میر مہدی مجروح، میر حسین فگار کے بیٹے تھے، وطن دہلی تھا اور غالب کے نہایت محبوب شاگرد تھے، غدر کے وقت پانی پت چلے گئے اور پھر الور، لیکن ہمیشہ پریشانی میں زندگی بسر کی، آخیر عمر میں نواب حامد علی خاں رئیس رام پور نے وظیفہ مقرر کر دیا تھا، مجروح کی زبان بہت سادہ و سلیس ہے اور اسی لیے چھوٹی بحروں میں ان کا کلام زیادہ ملتا ہے، کوئی خاص جدت نہیں ہے۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، فارسی، اردو، دونوں کے نہایت اچھے شاعر تھے اور غالب کے شاگردوں میں اس مرتبہ کا کوئی دوسرا نہیں ہوا، یہ نواب سرفراز الملک مرتضیٰ خاں کے بیٹے تھے اور ۱۲۲۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت نہایت پاکیزہ ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی میں امام بخش صہبائی، غالب، ذوق اور آزردہ وغیرہ کا جمگھٹا تھا اسی لیے شیفتہ کو بھی شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور مومن سے مشق سخن کی، ان کا ذوق سخن معیاری چیز سمجھا جاتا تھا غالب کے رقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کا کتنا احترام کرتے تھے

تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۲۸۶ھ ہجری میں انتقال کیا، ان کا کلیات فارسی و اردو ان کے بیٹے نواب محمد اسحاق خاں نے شایع کیا تھا، ذیل کے اشعار سے ان کے کلام کی پاکیزگی واضح ہوگی:-

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی
صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

کیا جانے گزری غیر پہ کیا اُس کی بزم میں
آئے وہ اس طرح سے مجھے پیار آگیا

کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر
کیا کوئی اور ستم یاد آیا

یاں عجز بے ریا ہے نہ واں نازِ دلفریب
شکوہ بجا رہا گلۂ بے سبب تلک

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

مفتی صدر الدین آزردہ، غیر معمولی قابلیت کے انسان تھے اور فہم و تدبّر بلا کا پایا تھا ۱۲۰۴ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا، اپنے وقت کے بڑے جیّد عالم تھے اور ان کے شاگردوں میں بہت سے مشہور علماء گزرے ہیں عربی، فارسی، اردو پر یکساں قدرت حاصل تھی، صدر الصدوری کے عہدے پر ممتاز تھے اور شعراء کے بڑے قدردان تھے کہا جاتا ہے کہ شاعری میں انھوں نے میر ممنون کی شاگردی اختیار کی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا استاد خود ان کا ذوق سلیم تھا اردو کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:-

---

میں اور ذوق بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

کامل اس فرقۂ زہّاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوے

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

مومن کے شاگردوں میں میر حسین تسکین بھی بڑے پایہ کے شاعر تھے، ان کے والد کا نام میر حسن تھا جو میرن صاحب کے لقب سے مشہور تھے، دہلی میں پیدا ہوئے، فارسی صہبائی سے پڑھی اور مشق سخن پہلے شاہ نصیر اور پھر مومن سے کی، دہلی سے رامپور چلے آئے تھے نواب یوسف علی خاں کا زمانہ تھا، یہیں ۵۰ سال کے سن میں ۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا، انکا کلام مومن سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے نمونۂ کلام یہ ہے

جس وقت نظر پڑتی ہے اس شوخ پہ تسکیں
کیا کہیے کہ جی میں مرے کیا کیا نہیں آتا

کوچۂ یار میں تسکیں میں نے
پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

یہ تو سچ ہے کہ جو تم جا ہوگے گزر و گے
پر یہ ممکن نہیں ہم پر کبھی بیداد نہ ہو

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

اس دور کے ایک نہایت خوشگو شاعر انور بھی تھے، ان کا نام سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا تھا، ظہیر کے چھوٹے بھائی تھے اور ذوق و غالب دونوں سے اصلاح لی تھی، ۳۰ سال کی عمر میں بمقام جے پور انتقال کیا، افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی، ورنہ معلوم نہیں ان کی شاعری کا عروج کس حد تک پہونچتا، شوخی و محاکات میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے، ان کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

میں نے کہا کہ غیر سے پردہ نہیں ہوا
کہنے لگے کہ آپ کو پھر کیا؟ نہیں ہوا

تڑپیں کچھ اور کہتی ہے دیکھو تو آئینہ — میں کیا کہ آپ اپنے سے تم بدگماں ہو آج

بدمستیوں کا رنگ ہے جوشِ شباب میں — گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں

ادھر لاؤ ذرا دستِ حنائی — پکڑلیں چور کا دل ہم یہیں سے

پھینکیے کیوں مئے ناقص ساقی — شیخ صاحب کی ضیافت ہی سہی

غالب کے شاگردوں میں نواب سید محمد ذکریا خاں ذکی بھی قابلِ ذکر ہیں، دلی میں پیدا ہوئے تھے (۱۸۳۹ء) اور ان کے والد نواب سید محمد خاں بھی شاعر تھے، ذکی کی تعلیم دہلی میں ہوئی اور درسیات ختم کرنے کے بعد فن شعر میں غالب کی شاگردی اختیار کی، غالب کا رنگ ان کے کلام میں بہت رچا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو

کس نے حیا سے نیچی نظر کی کہ ہوگیا — آساں نہ دیکھنا مجھے دشوار دیکھنا

بڑھا ذوقِ اسیری جب انھوں نے — کہا کہہ دو کہ "اب سے رہا ہیں"

سو حسرتوں سے پوچھنا "کہ جاؤگے" — اُن کا وہ ایک ناز سے کہنا کہ "ہاں چلے"

اسی سلسلے میں حالی کا ذکر بھی ضروری ہے، عام طور پر ان کی جدید شاعری کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ رنگِ تغزل میں بھی ان کا جواب نہ تھا، سوز و گداز، شیرینی و سلاست، فتادگی و تاثر جو غزل کی جان ہے بدرجۂ اتم ان کے کلام میں پائی جاتی ہے اور حق یہ ہے کہ غالب حالی کی شاگردی پر جتنا فخر بھی کرتے کم تھا، ۱۲۵۳ھ میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے، اور ۱۳۳۳ھ میں انتقال کیا، ان کے حالات بہت مشہور ہیں زیادہ اظہار کی ضرورت نہیں، دیوان بھی ان کا شایع ہو چکا ہے، لیکن چند شعر ان کی غزلوں کے پیش کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

ہے کچھ اک باقی خلش امید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیے

ترکِ دنیا کے علائق تو کیے سب زاہد
گر نہ سب ہو تو اک ترک دیا اور سہی

یارانِ تیزگام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اب بھاگتے ہیں سایۂ زلفِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

میاں نظام شاہ رامپوری، اس دور کے بہترین شعرا میں سے تھے اور محاکات کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے، نگار بابت اگست ۱۹۲۴ء میں ایک مستقل تنقیدی مضمون انکی شاعری پر میں نے لکھا تھا۔ ۱۲۳۵ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا، یہ شیخ علی بخش بیمار کے شاگرد تھے اور نواب یوسف علی خاں والی رامپور کے زمانے میں دربار کے شاعر تھے، رامپور ہی میں انکا نشو و نما ہوا اور یہیں مدفون ہیں چند اشعار مثالاً یہاں درج کیے جاتے ہیں:

یوں دیکھ کے مجھ کو مسکرانا
پھر تم کو میں بے خبر کہوں گا

منہ پھیر کے ہنس ہنس کے وہ اقرار کی باتیں
اس طور سے کرتے ہیں کہ باور نہیں آتا

میں حالِ دل اُن سے کہہ رہا ہوں
وہ کہتے ہیں "تجھ سے میں خفا ہوں"

وہ ہائے بگڑ کے اُس کا جانا
رونا وہیں زار زار میرا

آج کل آپ سے باہر ہے نظام
کہیں محفل میں نہ بلوائیے گا

عہد کیا تھا ابھی کیسا نظام
پھر وہیں جانیکا ارادہ کیسا

اب حالِ نظام کچھ نہ پوچھو
غم ہوگا تمہیں بھی گر کہوں گا

متاخرین کے دوسرے دور میں امیرؔ و داغؔ کو جتنی شہرت حاصل ہوئی کسی اور کو نصیب نہ ہوسکی، اور اس کا سبب شاید یہ تھا کہ ایک کو نواب رام پور کی قدر افزائی نے اُچھالا اور دوسرے کو شاہ دکن کی سخن فہمی نے، امیرؔ مینائی اپنے فضل و کمال کے لحاظ سے بڑے مرتبہ کے شخص تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ شاعر پیدا نہ ہوئے تھے، برخلاف اس کے داغؔ شاعر محض تھے اور کچھ نہیں، امیرؔ کی شاعری اکتسابی تھی اور داغؔ کی فطری، لیکن ان کے اکتساب کا بھی یہ عالم تھا کہ غزل، قصیدہ، مثنوی سب کچھ لکھا اور حقیقت یہ ہے کہ زبان کی صحت، لغت کی تحقیق، محاورہ کے استعمال الفاظ کی بندش اور مضمون آفرینی کے لحاظ سے بڑے زبردست اُستاد تھے، لیکن جذبات کے لحاظ سے ان کے کلام میں کوئی کیفیت نہیں پائی جاتی، ان کے دو دیوان ہیں ایک مرآۃ الغیب جو بالکل ان کے اُستاد اسیرؔ کے رنگ میں ہے اور دوسرا صنمخانۂ عشق جس میں داغؔ کا تتبع کیا ہے، اسی کے ساتھ جوہر انتخاب و گوہر انتخاب میں دردؔ و میرؔ کے رنگ کے اشعار پیش کیے ہیں اور اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذہانت سے کام لے کر ہر رنگ میں لکھ سکتے تھے اور فطرتاً وہ خود کسی مخصوص ذوقِ شعری کے مالک نہ تھے

داغؔ، دہلی اسکول کے شاعر تھے اور لال قلعہ کے اندر ان کی تربیت ہوئی تھی، مرزا فخرو کے ساتھ ساتھ ذوقؔ کے سامنے زانوئے ادب انھوں نے بھی تہ کیا تھا، وہ قلعۂ معلّٰی کی زبان، وہ شعر و سخن کا چرچا، وہ رنگین صحبتیں، فطری ذوق چمک اٹھا اور آخر کار دُنیائے شاعری میں وہ شہرت حاصل کی کہ اس دور میں کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوسکی، ان کے کلام کی خوبی محاکاتِ حسن و عشق کے بیان کرنے پر منحصر ہے، اور اس کوچے کی خاک انھوں نے ایسی چھانی کہ کیا کوئی چھانے گا۔

امیر ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۸ھ میں انتقال کیا

داغ ۱۲۴۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۲ھ میں رحلت کی

چونکہ ان دونوں کے تفصیلی حالات مع تنقید کلام کے بارہا دنیا کے سامنے آچکے ہیں اس لیے اظہار کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اسی زمانے میں لکھنؤ کے ایک اور شاعر ضامن علی جلال بھی تھے، یہ حکیم اصغر علی داستاں گو کے بیٹے تھے اور ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے محمد علی شاہ کا زمانہ تھا، انھوں نے امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ دونوں کا زمانہ دیکھا اور اسی عہدِ رنگیں میں ان کا نشو ونما ہوا، درسیات پڑھنے کے بعد شاعری میں امیر علی خاں ہلال کے شاگرد ہوئے اور پھر علی اوسط رشک سے اصلاح لینے لگے، جب رشک کربلائے معلیٰ چلے گئے تو برق سے مشورہ حاصل کرتے رہے، طبیعت چونکہ موزوں تھی اس لیے مشق سے ان کے کلام میں ایک کیفیت پیدا ہوگئی، غدر کے بعد رامپور چلے گئے اور نواب یوسف علی خاں کی سرکار میں جہاں ان کے باپ داستان گوئی کی خدمت پر مامور تھے یہ بھی ملازم ہوگئے بعد کو نواب کلب علی خاں نے بھی ان کی قدر کی، نواب کے انتقال کے بعد پھر لکھنؤ آگئے

امیر مینائی کے بعض اشعار ؎

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

کلیم شکر کر حشر تک نہ ہوش آتا
ہوئی یہ خیر کہ وہ شوخ بے نقاب نہ تھا

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ گئی ہو اسی اضطراب میں

شبِ وصلت قریب آنے نہ پائے کوئی خلوت میں
ادب ہم سے جدا ٹھہرے، حیا تم سے جدا ٹھہرے،

مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے،
آج بجلی گری کہیں نہ کہیں

داغ کے بعض اشعار ؎

وصل میں ہائے وہ اِترا کے مرا بول اُٹھنا
اے فلک دیکھ تو یہ کون مرے گھر آیا

عرض وفا پہ دیکھنا اس کی ادائے دلفریب
دل میں کچھ اعتبار سا آنکھ میں کچھ ملال سا

وعدے پہ مری اُن کی قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

وقتِ خرام ناز دکھا دو جدا جدا
یہ چال حشر کی یہ روش آسمان کی ہے

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

اور منصور نگر میں رہنے لگے، ان کو اپنی محاورہ دانی و زباں دانی پر بڑا ناز تھا، اپنے بعد چار دیوان چھوڑے، ایک کتاب محاورات و اصطلاحات پر "سرمایۂ زبان اردو" کے نام سے تصنیف کی اور ایک رسالہ تذکیر و تانیث، ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ باوجود لکھنؤ میں نشو و نما پانے کے انھوں نے دہلوی رنگ تغزل کو پسند کیا، چنانچہ ان کے کلیات میں بہت سے شعر اس رنگ کے ملتے ہیں، نہایت صاف و شستہ کہنے والوں میں تھے اور رام پور کی صحبتوں میں جہاں امیر، داغ، اسیر، منیر، سحر، قلق اور تسلیم کا اجتماع ہوا کرتا تھا یہ بھی شریک ہوتے تھے اور داد سخن پاتے تھے ۱۳۲۵ھ میں انتقال کیا، ان کے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں،

خوبرویوں کے بگڑنے میں بھی ہیں لاکھ بناؤ　　　کہیں اچھوں کی کوئی بات بری ہوتی ہے

ایک سی شوخی خدا نے دی ہے حسن و عشق میں　　　فرق بس اتنا ہے، وہ آنکھوں میں ہے، یہ دل میں ہے

آنسو رکے تو کیا نہیں چھپنے کا راز عشق　　　حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

ادا و ناز پر سو سو جان دیتے ہیں تمہارے گا　　　ذرا جینے تو دو چندے کسی مرجانے والے کو

شیخ امیر اللہ تسلیم بھی اسی جتھے اور دور کے آدمی تھے، فیض آباد کے ایک گاؤں منگلیسی میں پیدا ہوئے (۱۲۳۵ھ) ان کے والد مولوی عبد الصمد انصاری پلٹن میں ملازم تھے اس لیے ان کا نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، درسیات ختم کرنے کے بعد تو شاعری کا شوق پیدا ہوا اور اصغر علی خاں نسیم کے شاگرد ہوئے جو اس وقت لکھنؤ میں تھے، جب ان کے والد ضعیف ہوئے تو بیٹے کو اپنی جگہ پلٹن میں رکھا دیا، محمد علی شاہ کا زمانہ تھا، واجد علی شاہ کے زمانے میں جب یہ پلٹن ٹوٹ گئی تو تسلیم بیکار ہو گئے، آخر کار غدر کے بعد یہ رام پور چلے گئے اور عرصہ تک وہاں رہے، جب لکھنؤ میں انگریزوں کا تسلط ہوا تو یہ پھر لکھنؤ آ گئے، اور منشی نول کشور نے اپنے مطبع میں تصحیح کتب کے لیے بیس روپیہ ماہوار پر نوکر رکھ لیا، دس روپیہ نواب محمد تقی خاں بھی دیتے تھے، جب نواب کلب علی خاں تخت نشین ہوئے تو پھر ان کو رام پور طلب کیا اور تیس روپیہ تنخواہ کر دی لیکن انعام و اکرام ملتا رہتا تھا اس لیے فارغ البالی سے بسر ہوتی رہی، نواب کے مرنے پر پندرہ روپیہ پنشن ہو گئی، یہ پریشان ہو کر ٹونک اور مانگرول گئے، مانگرول کے رئیس نے ان کو روکنا چاہا لیکن آب و ہوا ناموافق تھی اس لیے لکھنؤ آ گئے، جب نواب حامد علی خاں تخت نشین ہوئے تو ان کو طلب کیا

اور اصل تنخواہ پر دس کا اضافہ کر کے بحال کر دیا، اخیر وقت میں بینائی بھی جاتی رہی تھی اور ثقلِ سماعت بھی بہت ہوگیا تھا ۹۶ برس کی عمر میں سنہ ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی۔

انھوں نے پانچ دیوان لکھے، پہلا دیوان غدر سے قبل کا ضایع ہوگیا، دوسرا بعد غدر نظم ارجمند کے نام سے شایع ہوا جس میں چند قصائد بھی ہیں اور دو مثنویاں بھی، تیسرا دیوان نظم دل افروز کے نام سے اور چوتھا دفترِ خیال کے نام سے رام پور میں طبع ہوا، اور پانچویں کے متفرق اجزا ان کے شاگردوں کے پاس ہیں شایع نہیں ہوئے، تسلیم کو مثنوی لکھنے میں خاص ملکہ حاصل تھا اور اس حیثیت سے وہ اپنے تمام ہم عصر شعرا سے بڑھے ہوئے تھے، قصائد بھی انھوں نے خوب لکھے ہیں اور تغزل میں تو خیر وہ دہلوی رنگ کے متبع تھے ہی،

غزل کا رنگ ملاحظہ ہو

ہائے کب تک نہ میں گھبراؤنگا اے دستِ جنوں　　اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا

محبت میں یہ بے رحمی کہ جینا ہوگیا مشکل　　خدا نا کردہ کیا ہوتا جو وہ کافر عدو ہوتا

اللہ رے اضطراب تمنائے دیدِ یار　　اک فرصتِ نگاہ میں سو بار دیکھنا

تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے　　اُٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر

مانا کہ حسنِ یار سے لبریز ہے جہاں　　لیکن وہ حوصلہ وہ شکیبِ نظر کہاں

گر انھیں ہے خوف عرضِ آرزو　　دور سے حالِ پریشاں دیکھ لیں

التفاتِ جوشِ وحشت پھر کہاں　　ہو سکے جب تک بیاباں دیکھ لیں

امیر مینائی کے شاگردوں میں جلیل مانک پوری، حفیظ جون پوری اور ریاض خیرآبادی نے خاص شہرت حاصل کی لیکن فرق یہ ہے کہ جلیل نے امیر و داغ و جلال وغیرہ سب کا رنگ اختیار کر لیا، اور حفیظ جون پوری نے داغ کا ریاض خیرآبادی نے خود اپنا ایک رنگ علیحدہ قائم کیا۔

جلال کے شاگردوں میں انور حسین آرزو بہترین کہنے والے ہیں اور تسلیم کے لیے یہ فخر کافی ہے کہ حسرت موہانی ایسا شاگرد انھیں نصیب ہوا۔

داغ کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے لیکن خاص خاص یہ ہیں، بیخود دہلوی، سائل دہلوی، نسیم بھرت پوری بیخود بدایونی، نوح ناروی، آغا شاعر دہلوی، بیباک ورسا۔

اسی دور میں دو شاعر ایسے گزرے ہیں جو ایک حیثیت سے متاخرین کے دور اول میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں شاد[1] عظیم آبادی اور نظم[2] طباطبائی کئی سال ہوئے شاد کا انتقال ہو چکا ہے اور نظم طباطبائی نے حال ہی میں رحلت کی ہے نظم، داغ کے رنگ کے بہترین کہنے والے تھے اور واقفیت فن کے لحاظ سے اس دور میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے شاد، بلحاظ تغزل بڑے مرتبے کے شاعر تھے، ان کے یہاں میر و درد کا گداز، مومن کی نکتہ سنجی، غالب کی بلند پروازی اور امیر و داغ کی سلاست سب وقت واحد میں ایسی ملی جلی نظر آتی ہیں کہ اب زمانہ مشکل سے کوئی دوسری نظیر پیش کر سکے گا، ان کا ایک مختصر سا دیوان جامعۂ ملیہ دہلی نے شایع کیا ہے لیکن باقی غیر مطبوعہ کلام جو کئی صندوقوں میں بند ہے انھیں کے ورثا کے قبضے میں ہے، معلوم نہیں اس زلزلے میں وہ باقی بھی رہا یا نہیں۔

---

[1] دہلی کی ویرانی کے بعد جب شعرا منتشر ہوئے تو ان میں سے اکثر تو سلطنت اودھ کی طرف آئے جس کا پایۂ تخت لکھنؤ تھا، کچھ عظیم آباد کی طرف گئے اور کچھ مرشد آباد کی طرف، کیونکہ جس طرح صوبۂ اودھ دہلی سے علیحدہ ہو کر خود مختار ہو گیا تھا اسی طرح راجہ شتاب رائے نے نظامت بنگال سے علیحدہ ہو کر صوبۂ بہار میں اپنی حکومت جداگانہ قائم کر لی تھی، چونکہ یہ خود بھی شاعر تھا اس لیے خصوصیت کے ساتھ شعرا کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا، چنانچہ اس وقت سے عظیم آباد کو ایک مرکزی حیثیت شاعری کے لحاظ سے حاصل ہو گئی اور مختلف زمانوں میں نہ صرف یہ کہ باہر کے شعرا وہاں پہونچے بلکہ خود وہاں کی سرزمین سے بھی اچھے اچھے کہنے والے پیدا ہوئے۔

عہد متقدمین و متوسطین میں بیدل، ناجی، فغاں، حسرت اور راسخ ایسی ہستیاں وہاں پائی جاتی تھیں اور اب دور آخر میں امداد امام اثر اور شاد پیدا ہوئے، اثر کا حال میں انتقال ہوا اور شاد کے انتقال کو تین سال ہوئے۔

شاد عظیم آباد ہی کے رہنے والے تھے اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی، شاد ۵۷ء کے غدر سے ۱۰، ۱۱ سال قبل پیدا ہوئے اور ۸۰ سے متجاوز ہو کر انتقال کیا۔

(اس میں شک نہیں، کہ ناسخ نے لکھنؤ کو بہت بدنام کیا اور جس لغو شاعری کی طرح انھوں نے ڈالی تھی وہ عرصہ تک قائم رہی لیکن اب تقریباً دس پندرہ سال سے لکھنوی شعراء کا ذوق بالکل بدلتا جا رہا ہے اور ان کا رنگ تغزل دہلوی رنگ کا ہوتا جاتا ہے چنانچہ عہد حاضر کے کہنہ مشق شعراء میں آرزو، صفی، ثاقب، عزیز، اثر، اور نو مشق شعراء میں آشفتہ و سراج وغیرہ کا کلام اکثر جذبات سے لبریز نظر آتا ہے، دہلی میں اب بالکل سناٹا ہے، کیونکہ سائل و بیخود باوجود دہلوی ہونے کے شاعری کے لحاظ سے دہلی کے لیے ننگ و عار ہیں، دہلی و لکھنؤ سے غیر متعلق لوگ بھی اس وقت بہت بلند پایہ غزلیں کہنے لگے ہیں)

(حسرت [redacted] ہانی کا ذکر تفصیل کے ساتھ میں نے قصداً نہیں کیا کہ اُن کا مرتبہ غزل گوئی میں اس وقت میر و درد کی طرح مسلم ہے

(بسلسلۂ سابق) ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا اور اساتذان عصر میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کی شاعری کی عمر ۶۵ سال سے کم نہ تھی اور ظاہر ہے کہ اتنی طویل مدت میں انھوں نے کیا کچھ اور کتنا نہ کہا ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ اب سوائے غزلیات کے ایک مختصر سے مجموعے کے اور کچھ ہمارے سامنے موجود نہیں،

شاد اپنے رنگ تغزل کے لحاظ سے بالکل میر و سوز کے متبع تھے، وہی بیان کی سادگی، وہی عجز و فتادگی، وہی سوز و گداز اور وہی محبت کے خاص جذبات جو تغزل کی جان ہیں ان کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، سوقیانہ محاورات اور فحش و ابتذال ان کے یہاں بالکل مفقود ہے۔

ذیل کے اشعار سے ان کا رنگ تغزل واضح ہوگا۔

جب اہل شوق کہتے ہیں افسانہ آپ کا　　　ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

جفائے یار کا دل کو ملال آ ہی گیا　　　ہزار دھیان کو ٹالا خیال آ ہی گیا

شب ہجراں کی سختی ہو تو ہو لیکن یہ کیا کم ہے　　　کہ لب پر رات بھر رہ رہ کے تیرا نام آئے گا

کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنے ہی افسانے میں تھا　　　مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا

ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب بے اختیار　　　اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا

نہ جانبازوں کا مجمع تھا نہ مشتاقوں کا میلا تھا　　　خدا جانے کہاں مرتا تھا میں جب تو اکیلا تھا

جب کسی نے حال پوچھا رو دیا　　　چشم تر تو نے تو مجھ کو کھو دیا

دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال　　　لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

گزشتہ رُبع صدی کے اندر غزلوں سے زیادہ نظموں کی طرف ملک کے شعرا نے توجہ کی ہے لیکن میری رائے میں اس کی ابتدا سب سے پہلے نظیر اکبرآبادی نے کی، اس کے بعد اسمٰعیل میرٹھی اور مولانا حالی نے اس کو ترقی دی یہاں تک کہ اس وقت ملک میں ہزاروں قومی، سیاسی، اور محاکاتی نظمیں کہنے والے پیدا ہوگئے ہیں مگر اس باب میں جو عزت اقبال کو حاصل ہوئی وہ کسی کو نصیب نہ ہوئی، اکبر الہ آبادی ہر چند اپنے قدیم رنگ تغزل کے لحاظ سے متاخرین کے دور اول میں شمار ہونے کے قابل ہیں لیکن انھوں نے اپنے آپ کو جس رنگ میں پیش کیا وہ سب سے علحدہ ہے اور انھیں کے ساتھ ختم ہو گیا، مرثیہ گوئی میں انیس و دبیر کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں، اور اگر لکھنوی دور شاعری سوائے انیس و دبیر کے کسی اور شاعر کو نہ پیدا کرتا تو بھی اسکے لیے یہ فخر کم نہ تھا کہ اس نے ایسی دو ہستیاں پیش کیں، گو اُن کا تعلق بھی حقیقتاً دہلی ہی سے تھا۔

(بسلسلۂ سابق) میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

بن چلا ڈھیر راکھ کا تو، بجھا چلا اپنے دل کی لیکن بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ اے کارواں رہے گی

ابھی سے ویرانہ پن عیاں ہے، ابھی سے وحشت برس رہی ہے ابھی تو سُنتا ہوں کچھ دنوں تک بہار لے آشیاں رہے گی

ایک ستم اور لاکھ ادائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے ترچھی نگاہیں تنگ قبائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اور ہی عالم، ابرِ بہاراں، دیدۂ پُرنم ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے دھانی دُوپٹے لٹ چھٹکائے مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

تپچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے نمازیں، ناک رگڑنی، سجدے پہ سجدے جو نہیں جائز اُس کی دعائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

شاد نہ وہ دیدار پرستی، اور نہ وہ بے نشہ کی مستی تجھ کو کہاں سے ڈھونڈھ کے لائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

مرے پہلو سے آخر اُٹھ گیا غمخوار گھبرا کر بہت مشکل ہے آکر بیٹھنا آشفتہ حالوں میں

ہم اور سیر لالہ و گل ہجر یار میں کیسی بہار آگ لگا دو بہار میں

فنا کے بعد لحد پر وہ آکے روتے ہیں کہاں کی چھیڑ نکالی ہے کہ دہ سوتے ہیں

یہ سب درست کہ تم بت بھی ہو خدا بھی ہو مگر نیاز کے قابل یہ دل رہا بھی ہو

شاہان دہلی میں بہادر شاہ ظفر سے بہتر کوئی شاعر نہیں ہوا
اور نوابان اودھ میں آصف الدولہ سے زیادہ صحیح رنگ تغزل کسی نے پیش نہیں کیا، اس رسالہ میں میرا ایک مضمون آصف الدولہ کی شاعری کے متعلق علیحدہ نظر آئے گا،
نوابان رام پور میں سے اکثر نے شاعری کی، لیکن وہ شاعری ایسی ہی تھی جیسی بادشاہوں اور رئیسوں کی ہوا کرتی ہے
اسی صفحوں کے ساتھ میں چند ضمیمے بھی پیش کرتا ہوں جن سے میرے اس تاریخی تبصرہ کے سمجھنے میں زیادہ مدد ملے گی۔

(بسلسلۂ سابق) ظفر کا رنگ تغزل یہ تھا۔

نہ شوخی، اے حیا کی وضع میں اب فرق آتا ہے
غبار اُڑ بجانہ ہو جائے کہیں ہم خاکساروں کا

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برق خرمن کا
لگا کر آگ دیکھیں گے تماشا اب نشیمن کا

ادائیں، سادگی میں، کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا
شکن ماتھے پہ، ابرو میں گرہ، گیسو میں بل ڈالا

گہر ہے کہ صبح بناگوش میں
ستارہ سا ہے جھلملاتا ہوا

آگیا پھر رمضاں کیا ہوگا
ہائے اے پیر مغاں کیا ہوگا

پرسان حال وہ ہو اور سامنے بلا کر
کیا جانیے زباں سے کیا نکلے بیخودی میں

ذرا کہے سنے سے ذرا پاس آکے بیٹھ گئے
نگاہ پھیر کے تیوری چڑھا کے بیٹھ گئے
نگاہ یاس مری کام کر گئی اپنا
رُلا کے اُٹھے تھے وہ مسکرا کے بیٹھ گئے

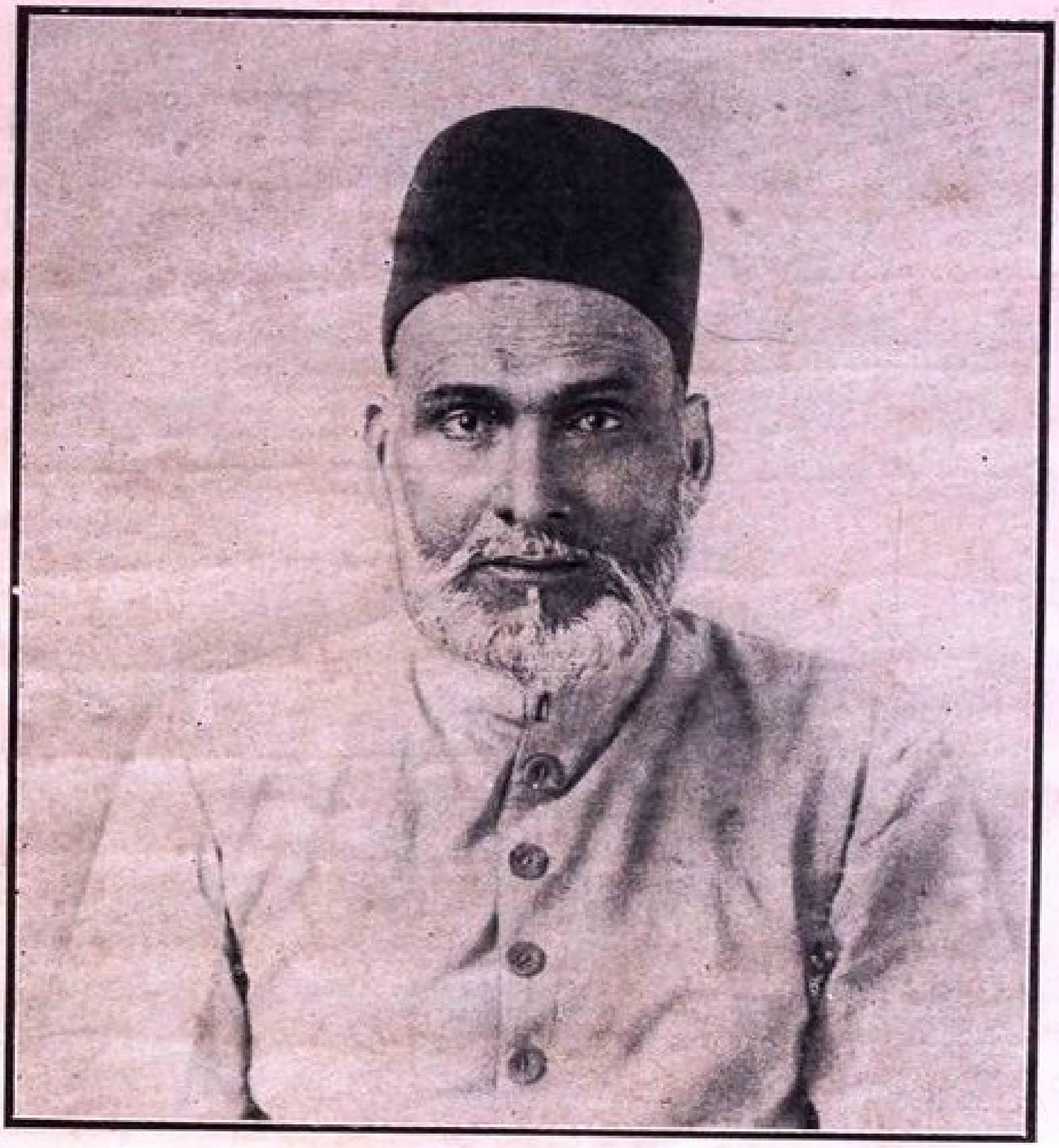

مولوی امیر احمد علوی- بی۔ اے

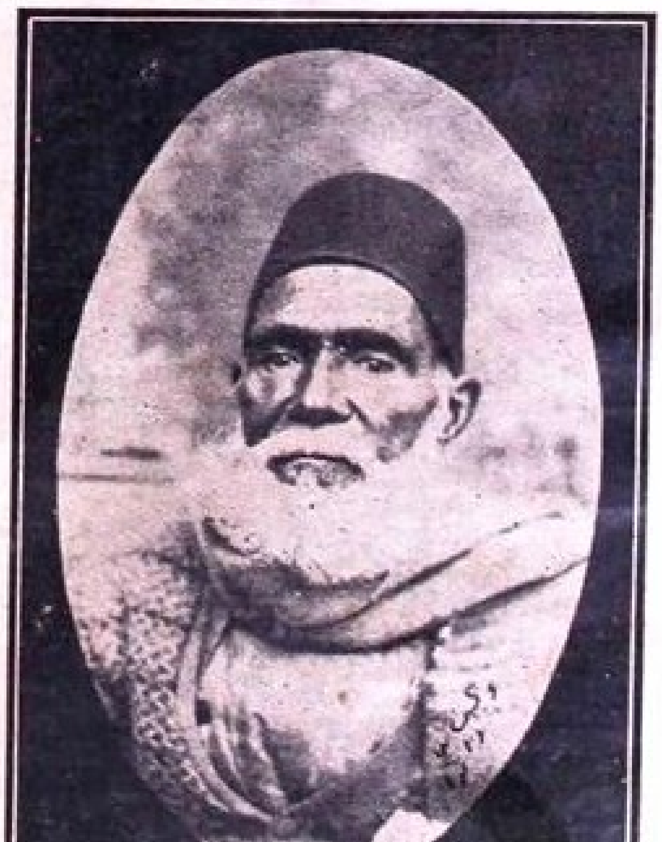

مولوی نورالحسن نیر- بی۔ اے

مسٹر- شبیر احمد علوی- بی۔ اے

اُردو کی مشہور مثنویاں

اصطلاح شعراء میں "مثنوی" اُس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کی ہر بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور سب اشعار ایک ہی بحر میں ہوں۔ نہ قصیدے کی طرح ابیات کی تعداد محدود ہے۔ نہ غزل کی طرح ردیف و قافیہ کی قید ہے۔ مناظر قدرت۔ فلسفہ و تصوف کے طویل مباحث۔ حسن و عشق، بزم و رزم کی داستانیں اس صنف سخن میں بخوبی نظم ہو سکتی ہیں اور واقعہ نگاری کے لئے اس نوع سے بہتر مشرق کی شاعری میں کوئی اسلوب نہیں ہے۔

اس ہمہ گیر طرز کی ایجاد کا فخر غالباً ایران کو حاصل ہے اور فارسی شاعری کا گراں ترین گنجینہ اسی صنف کلام میں محفوظ ہے۔ شاہنامہ سکندر نامہ۔ حملۂ حیدری بیان رزم میں۔ یوسف زلیخا اور شیریں خسرو، داستان محبت میں۔ ہفت پیکر و ہشت بہشت قصص و حکایات میں۔ بوستاں تعلیم اخلاق میں اور مثنوی معنوی تصوف میں وہ بے نظیر نظمیں ہیں جو فارسی شاعری کی حیات جاوید کا باعث ہوئیں اور جن کو ادب ایران سے خارج کر دیا جائے تو ہیملٹ کا تماشہ بغیر شہزادۂ مظلوم کے یا اندر سبھا کا کھیل بغیر گلفام کے رہ جائے گا۔

اُردو شاعری فارسی کے سانچے پر ڈھالی گئی۔ علم عروض ایران کی معرفت آیا۔ اصناف کلام ایران سے آئے۔ تشبیہات و استعارات بلکہ شاعرانہ خیالات بھی اُسی ملک سے لئے گئے۔ بحریں ایران کی تھیں اور اُن کے ابتدائی شناور بھی فارسی نژاد و نکے وارث یا شاگرد تھے عرفی و نظیری۔ صائب و کلیم نے ہندوستان کے سخن فہموں کو غزل کا دیوانہ بنا رکھا تھا اس لئے دکن میں نظم اُردو کی داغ بیل ڈالی گئی تو پہلے غزل ہی تختۂ مشق بنی۔ مگر مثنوی کی لذت سے آشنائی تھی اور اسکی منفعت و عظمت سے شناسائی لہذا باوجودیکہ زبان میں ادائے مضامین کی قدرت نہ تھی مگر پہلے ہی دور سے مثنوی لکھنے کی کوشش کی گئی۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مری زباں کے لئے

کہا جاتا ہے کہ ۱۰۱۰ھ میں قطب شاہ فرمانروائے گولکنڈہ نے ایک مثنوی لغت میں لکھی اور یہی پہلی مثنوی تھی جو دکنی بھاشا میں کہی گئی اُس کے بعد متعدد مثنویاں اُسی سرزمین پر تصنیف ہوئیں جنمیں سے غواصی کی مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" ہنوز مشہور ہے اور

اس کا سال تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے۔

برس ایک ہزار ہور پنج تیس میں
کیا ختم یو نظم دن تیس میں

علی عادل شاہ المتوفی ۱۰۶۳ھ کے عہدِ سلطنت میں نصرتی نے کئی مثنویاں لکھیں جن میں سے ایک "علی نامہ" عادل شاہ کے فتوحات کی داستان شاہنامہ کے جواب میں تھی۔ جو نسبت غریب عادل کو کیخسرو اور افراسیاب سے اور اُس کے سپہ سالاروں کو رستم و سہراب سے تھی شاید وہ نسبت بھی اس مثنوی کو شاہنامہ سے نہو گی۔ اسی دوران میں ملا ہاشمی نے یوسف زلیخا کا مشہور قصہ نظم کیا اور اس کے بعد خواجہ بحری نے ۱۱۱۲ھ میں ایک مثنوی "من لگن" نام تصوف میں لکھی مگر ان سب تصنیفات کو اُردو سے معلّیٰ سے وہی دور کا رشتہ ہے جو ڈارون کی تحقیق کے مطابق بندر کو بائرن اور میکالے سے تھا۔

نظم اُردو کے مجدد میر شمس الدین ولی نے ۱۱۴۱ھ میں ایک مثنوی شہدائے کربلا کے حال میں لکھی۔

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال
تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال

شاہ مبارک آبرو اور مولوی سید محمد نے مثنویاں لکھیں جنھوں نے چندروزہ شہرت پائی مگر سید سراج الدین اورنگ آبادی کی مثنوی بوستانِ خیال آج دو سو برس کے بعد بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

یہ نظم ۱۱۶۰ھ میں کہی گئی اور اسی رعایت سے اس میں ۱۱۶۰ اشعار ہیں۔

زبس اس میں ہے سیرِ گلشن تمام
رکھا بوستانِ خیال اس کا نام

عدد جبکہ اس نام کے آئے ہاتھ
مطابق ہوئے سال و ابیات ساتھ

یہ دو دن کی تصنیف ہے حسب حال
زباں پر نکل آیا دل کا اُبال

باغ کی سیر کیجئے:-

ہر اک سمت پانی کی نہروں کی سیر
وہ نہروں میں پانی کی لہروں کی سیر

رواں آب کے ہر طرف آبشار
جدھر دیکھئے ہو رہی تھی بہار

طرب بخش تھا ناچنا مور کا
سماں پا تھا ہر مور کے شور کا

ہر اک سرو پر عشق پیچے کی بیل
خوشی کی گلے میں تھی گویا حمیل

جُھکی ڈالیاں بید مجنوں کی تھیں
خمِ زلفِ لیلیٰ کے افسوں کی تھیں

ہر اک حوض پانی سے لبریز تھا
ہر اک قطعۂ باغ گل خیز تھا

سمن - ارغواں - نرگس عبہری
گل لالہ و سیوتی جعفری

درخت آم کے سبز اور سایہ دار | نہالانِ نوخیز رنگیں بہار
اِدھر بلبلوں کی غزل خوانیاں | اُدھر پھول کی شبنم افشانیاں
ہزارا اناروں کے تختوں کی سیر | نئی کوپلوں کے درختوں کی سیر
رپٹ جھوم آیا تھا ابرِ بہار | برستی تھی باریک جھم جھم بہار

جنگل کی وحشت اور تاریکی کا سماں۔

وہ صحرائے وحشت فزا لق و دق | کہ اُڑتے تھے شیروں کے دل کے ورق
کہوں کیا میں اُس مینھ کے شدت کی بات | کٹاری تھی بوندی کی ہر بوند سات
پھر اُس پر سنو تم اندھیرے کا حال | نہ تھی شمع واں غیر چشمِ غزال
وہ تنہائی و وحشت و بیکسی | مجھے اپنے احوال پر تھی ہنسی
صدا رعد کی شدت گرد و باد | قیامت کے دن کی دلاتی تھی یاد
گزرتا تھا ہر آن دل پر یقیں | مگر صدر کا حکم ہے آج ہیں
نہ اُس شب میں تھا روشنی کا نشاں | نہ کچھ تھا ستاروں کا وہم و گماں
ہوا جمع یکجا خدا کا غضب | کہ صورت پکڑ نام پایا تھا شب
چراغ اُس اندھیرے میں پاوے کہاں | چمکنا ہی برق کا تھا واں
سیہ شب میں بجلی چمکتی تھی یوں | نظر چشمِ دلبر میں چمکے ہے جیوں
شبِ مرگ یا جان کی کال تھی | درازی میں ہر ہر گھڑی سال تھی

بے تکلف دوست کا کردار ملاحظہ کیجئے:-

رپٹ بے حجابی سے ملنے لگے | ہنسی ساتھ جوں پھول کھلنے لگے
کبھی سر کو لاویں مرے مُنھ کے پاس | کہ پہونچے ہر اک طرح زلفوں کی باس
کبھی میرے زانو پہ زانو رکھیں | کبھی میرے پہلو پہ پہلو رکھیں
دوپٹا مرا اوڑھ کر لیٹ جائیں | کبھی شال اپنی مرے تئیں اُڑھائیں
کہوں کیا کہ کیا کیا کئے مجھ سے چھند | کہ دل اسکا ہووے ہر اک طرح بند

عارف الدین عاجز المتوفی سنہ ۱۱۷۸ھ کا قصہ "لال و گوہر" اُس عہد کی صاف شدہ اُردو کا عمدہ نمونہ ہے۔

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی، عطا کر مجھ کو یاقوت معانی
سخن کے در کا مجھ کو جوہری کر سخن سنجوں کو میرا مشتری کر
سخن کا لال دے میری زباں کو دُرِ معنی سے بھر میرے بیاں کو

(جنگل کا سین)

وہاں ہرگز نہ تھا پانی کا آثار اجل کا کھیت تھا وہ دشت خونخوار
وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی

جب زبان اس منزل سے آگے بڑھی اور مرزا و میر نے غزل کا خیمہ فلک اطلس تک پہونچایا۔ مثنوی نے بھی ترقی پائی۔ مرزا رفیع سودا نے چوبیس مختصر مثنویاں لکھیں۔ لیکن وہ قصیدہ گوئی اور ظرافت نگاری کے بادشاہ تھے۔ مناظر کی مصوری۔ جذبات کی نقاشی میں ناموری نہ حاصل کر سکے۔ البتہ میر تقی نے متعدد مثنویاں درد و تاثیر سے لبریز لکھ کر شعر و سخن کے اس تختہ پر آب حیات کا چھینٹا دیا۔ خصوصاً شعلۂ شوق اور دریائے عشق میں فصاحت و بلاغت کے وہ آبدار موتی پروئے کہ یہ نظمیں عروس سخن کا زیور نگئیں اور آج تک مثنویوں کی صف اول میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔

افسانے دلچسپ نہ سہی دردناک ہیں۔ حکایتیں طویل نہیں نتیجہ خیز ہیں۔ جذبات کی مصوری اور مناظر کی نقاشی ہے۔ بیان کی سادگی، گفتگو کی شیرینی میر صاحب کا حصہ ہے۔

(از مثنوی شعلۂ شوق)

یہ سرگرم فریاد و زاری ہوا لہو اُسکی آنکھوں سے جاری ہوا
جگر غم میں یک لخت خوں ہوگیا رُکا دل کہ آخر جنوں ہوگیا
گئے ہوش و صبر اُس کے یکبارگی طبیعت میں آئی اک آوارگی
سراسیمگی سے بگولا ہوا پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا
کبھو یاں کبھو واں بحال خراب وہی بے قراری وہی اضطراب
ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد
کچھ اپنے بد و نیک کی سُدھ نہیں نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں
کبھو جا کے صحرا سے لا دیں اُسے کبھو روتے دریا پہ پا دیں اُسے
کبھو خاک ملتا ہے منہ پر کھڑا کہیں ہے خرابے میں بے سُدھ پڑا

(از مثنوی دریائے عشق) ۔ اینجاست کہ آفتاب تیز است

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال ہر جگہ اُس کی اک نئی ہے چال
دل میں جاکر کہیں تو درد ہوا کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
خار خار دل غریباں ہے انتظار بلا نصیباں ہے

(آغاز محبت)

ایک دن بیکلی سے گھبرایا سیر کرنے کو باغ میں آیا
ایک غرفے سے ایک مہ پارہ تھی طرف اُس کے گرم نظارہ
پڑگئی اُس پہ اک نظر اُس کی پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی، وہ نظر ہی وداع طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بے قراری نے کج ادائی کی تاب و طاقت نے بیوفائی کی
بستر خاک پر گرا وہ زار درد کا گھر ہوا دل بیمار

(دایہ کے فریب میں پھنسکر دریا میں کودتا ہے)

بے خبر کار عشق کی تہ سے جست کی اُس نے اپنی جاگہ سے
تھا سفینے میں یا کہ دریا میں موج زنجیر ہوگئی پا میں
کھنچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب تھی کشش عشق کی مگر تہ آب
کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں ڈوبے ایسے کوئی نکلتے ہیں
ڈوبے جو یاں کہیں وہ جا نکلے غرق دریائے عشق کیا نکلے
عشق نے آہ کھو دیا اُس کو آخر آخر ڈبو دیا اُس کو

(عاشق و معشوق کی لاش دریا سے نکلتی ہے)

نکلے باہر وے موئے نکلے دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربط چھپاں بہم ہویدا تھا مر گئے پھر بھی شوق پیدا تھا

ایک کے ہاتھ ایک کے بالیں — ایک کے لب سے ایک کو تسکیں
جو نظر ان کو آن کرتے تھے — ایک قالب گمان کرتے تھے

"مثنوی در بیان دنیا" میں ضعف پیری کی لاجواب تصویر ملاحظہ ہو:-

جوانی گئی موسم شیب ہے — شہود ایک دو روز کو غیب ہے
نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام — مزا کچھ نہیں ہو چکی صبح شام
بلا ارتعاش تن زار ہے — ہر ایک عضو چلنے کو طیار ہے
نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے — سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے
صد افسوس لطف سماعت نہیں — صدا دور سے جیسے آوے کہیں
شباب آہ داغِ جگر دے گیا — قد خم زمیں کی طرف لے گیا
جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی — سفیدی مُو سے سحر ہو گئی
کھڑے ہوں تو تھرائے ران اور ساق — جبیں بیٹھے کیونکر کہ جینا ہے شاق
جو یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے — تو دیکھو گے ہم بانسے چلتے رہے
اگر ضعف سے چپ ہی رہتے ہیں ہم — یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم
بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور — دئے آنکھیں نہیں دے نہ چتون کے طور
لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ — در و بام پر حسرتوں سے نگاہ
شکن جلد میں دل کو پژمردگی — غریزی حرارت میں افسردگی
برودت بہت جسم میں آگئی — مزاجی تھی گرمی سو ٹھٹھر اگئی
سیہ رو رہے شیب اک ستم کر گیا — لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا

-۱۲

اسی زمانہ کے قریب خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر نے ایک نظم "خواب و خیال" تصنیف کی جس کو بعض تبصرہ نگار اعلیٰ درجہ کی مثنوی خیال کرتے ہیں۔ شاید ایسی ہی ہو۔ نہ کوئی مسلسل قصہ ہے نہ داستان۔ نہ مصوری ہے نہ سیرت نگاری صرف زبان کی صفائی ہے اور مواصلت میں عریاں نگاری کی ایجاد کا شرف۔ شاعر کو خود اعتراف ہے کہ

وضع اس کی ہوئی خلاف طبع — ہے مجھے اس سے انحراف طبع

یہ تو قابل نہیں سُنانے کے　　　نہیں لایق کہیں دکھانے کے
ایک دو دن میں ہم نے پھینک دیا　　　نہیں معلوم کن نے اس کو لیا
اب جو دیکھو کسو کے پاس کہیں　　　ہیں یہ اشعار اُسی کے میرے نہیں

مثنوی کا بیشتر حصہ فارسی اشعار اور میر درد کی غزلوں سے بھرا ہوا ہے۔ سیکڑوں اشعار معشوق کے سراپا کی توصیف میں ہیں جن میں سے چند مرزا علی لطف نے تذکرۂ گلشنِ ہند میں نقل کر کے اس نظم کی تضحیک کی ہے۔ مثلاً :۔

ناک ہے یا کہ ایک طوطا ہے　　　چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے
ذایقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں　　　شہد و شربت جو کچھ کہو سب ہیں
دانت پھریوں چمکتے ہیں سارے　　　رات اندھیری میں جیسے ہوں تارے

میر تقی علیہ الرحمۃ نے بھی ایک مثنوی "خواب و خیال" نام لکھی تھی اور اُس میں بھی معشوق کا سراپا تھا۔ صرف ایک شعر پر میر اثر کا کل سراپا قربان ہے۔

"سراپا میں جس جا نظر کیجئے　　　وہیں عمر اپنی بسر کیجئے"

اثر کی اس نظم کے بعض اشعار خوب ہیں۔

ہجر میں جی ہے میرے پاس کہاں　　　وصل میں گر جیا حواس کہاں
درد کوئی کسی کا کیا جانے　　　اُس کا دل جانے یا خدا جانے
رات کاٹے کوئی کہ دن کاٹے　　　بات بنتی نہیں ہے بن کاٹے

لیکن یہ غزل کے مضامین ہیں۔ مثنوی چیزے دیگر است۔

شیخ قلندر بخش جرات نے دو مثنویاں لکھیں۔ وہ مشہور نہ ہوئیں۔ البتہ ان کے آقائے نامدار۔ نواب محبت خاں فرزند کشتۂ جفائے شجاع الدولہ حافظ رحمت خاں روہیلہ کی مثنوی اسرار محبت عام و خاص میں مقبول ہوئی۔ یہ ۱۱۹۶ھ کی تالیف ہے۔

کہی تاریخ اُس کی یہ بہ صنعت　　　عجب قصہ ہے اسرار محبت

مصحفی کی زبان ہے اور جرأت کا انداز بیان "مستی" اور "جنوں" کے عشق محبت کا افسانہ ہے یا سوز و گداز کا تصویر خانہ! پہلے متفرق اشعار سنئیے :۔

محبت نام ہے اور ہر دل نگیں ہے　　　محبت سے کوئی خالی نہیں ہے
کرے بے خود سو وہ مے ہے محبت　　　خدا جانے کہ کیا شے ہے محبت

یہ گرمی حُسن کی اُس نازنیں پر   کہ گویا مہر اُتر آیا زمیں پر
ہر ایک تھا غنچۂ گل جیوں گلابی   شجر جھومیں تھے سب مثل شرابی
وہ سرگرم رہِ دشتِ فنا تھی   اجل تھی داہنے بائیں قضا تھی

(ہجر کی مصیبت)

جنونِ عشق جب ہوتا زیادہ   نکل جانے کا کرتی تھی ارادہ
کبھی مکھڑے پہ کر زلفیں پریشاں   گریباں چاک کرتی تا بہ داماں
کبھی پھیلا کے دونوں پاؤں اکبار   زمیں پر بیٹھ جاتی ہو کے ناچار
کبھی گھبرا کے اُٹھ کر واں سے چلتی   اُٹھا کر خاک اپنے منھ سے ملتی
غرض دُشوار تھا آرام پانا   کبھی اُٹھنا کبھی پھر بیٹھ جانا
کبھی دو دو پہر آوارہ پھرنا   کبھی اُٹھنا کبھی غش کھا کے گرنا
کبھی سر پیٹ لینا گاہ رونا   کبھی بیزار آپ اپنے سے ہونا
کبھی حیران ہو اک سمت تکنا   کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا
اُسے جب کوئی سمجھانے کو آتا   تو یہ روتی کہ بس جی ڈوب جاتا
کبھی چُپ اور کبھی رو رو بلکتی   بسانِ موج سر دے دے پٹکتی

کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں فضایل علی خاں بے قید نے ایک مثنوی اپنے حالات میں لکھی تھی اور میر و مرزا کے عہد تک اُس نظم کی اتنی شہرت تھی کہ ایوان فصاحت کے بالانشین میر حسن نے "حسبِ حال خود مثنوی گفتہ و بسے دُرہائے معانی سفتہ" کا سرٹیفکٹ دیا تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اُسی نظم کے نمونہ پر میر حسن نے اپنی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان، تصنیف کی وہ خود فرماتے ہیں:-

نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان   نہیں مثنوی ہے یہ سحر البیان
جو منصف سُنیں گے کہیں گے یہی   نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہو گی کبھی

شیخ مصحفی نے "یہ بت خانۂ چین ہے بے بدل" اور فخر الدین ماہر نے "ہے اس مثنوی کی یہ نادر طرح" مصرعہائے تاریخ کہے جن سے مصنف کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ اس طرز کی کوئی دوسری مثنوی اُس وقت اُردو زبان میں موجود نہ تھی۔

بہرحال یہ مثنوی ۱۱۹۹ھ میں بعہد نواب آصف الدولہ بہادر تمام ہوئی اور اس میں جذبات قلبی۔ واردات عشق۔ ہجر و وصل۔ مناظر قدرت۔ سراپا۔ زیورات۔ رئیسوں کی معاشرت۔ بیاہ شادی کے رسوم۔ اہل حرفہ کی اصطلاحیں۔ آزادوں کی بولی ٹھولی کے ساتھ ساتھ قصہ دلچسپ۔ داستان پرلطف۔ قافیے چست۔ زبان صاف و شستہ۔ تمام اوصاف و محاسن جمع تھے۔ اول سے آخر تک کوئی شعر بیکار نہیں اور کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہیں۔

ہجر کی روداد ایسے موثر الفاظ میں بیان کی کہ اُردو شاعری کے سارے خزانے میں اس سے زیادہ بااثر اور سچی تصویر غم جدائی کی موجود نہیں ہے۔

خفا زندگانی سے ہونے لگی　　بہانے سے جا جا کے سونے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا　　نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے　　محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ "بی بی چلو"　　تو اُٹھنا اُسے کہکے "ہاں جی چلو"
جو پوچھا کسی نے کہ "کہ کیا حال ہے"　　تو کہنا "یہی ہے جو احوال ہے"
کہا گر کسی نے کہ "کچھ کھائیے"　　کہا "خیر۔ بہتر ہے منگوائیے"
جو پانی پلانا تو پینا اُسے　　غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

(بے قراری بڑھتی ہے)

زباں پر تو باتیں و لے دل اُداس　　پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ مُنھ کی خبر اور نہ تن کی خبر　　نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر
جو مسّی ہے دو دن کی تو ہے وہی　　جو کنگھی نہیں ہے تو یونہیں سہی
اگر سر کھُلا ہے تو کچھ غم نہیں　　جو کُرتی ہے میلی تو محرم نہیں
ولیکن یہ خوباں کا دیکھا سُبھاؤ　　کہ بگڑے سے دونا ہو اُن کا بناؤ

تصویر کشی کے کمالات:۔

(عیش بائی مجرے کے لئے حاضر ہوتی ہے)

وہ خلقت کی گرمی وہ ڈُومنی پنا　　نشے میں بھبھوکا سا چہرہ بنا
وہ بن پوچھے ہونٹوں کی مسّی غضب　　کہ منھ پر تھی گویا قیامت کی شب

بندھا سر پہ جوڑا پڑی زرد شال   کمر کی لچک اور مٹک کی وہ چال
وہ اُٹھی ہوئی چین پشواز کی   وہ مسکی ہوئی چولی انداز کی
وہ مہندی کا عالم وہ توڑے چھڑے   وہ پاؤں میں سونے کے دودو کڑے
چلی وانسے دامن اُٹھاتی ہوئی   کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی
وہ آنے لگی کافراس آن سے   کہ جانے لگا جی مسلمان سے

(ناچ گانا ہوتا ہے)

وہ رقص بتاں اور ستھری الاپ   وہ "گوری" کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ
وہ دل چھینا ہاتھ پر دھر کے ہاتھ   اُچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ

(شہزادہ لب بام سے غائب ہو گیا - خواصوں کی پریشانی)

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی   کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو   گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی   رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں سے داب   کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب
لب بام کثرت جو کیسر ہوئی   تلے کی زمیں ساری اوپر ہوئی

(وزیر زادی جوگن کا بھیس بنا کر شہزادے کو ڈھونڈھنے نکلتی ہے - جوگن کی تصویر)

کئی سیر موتی جلا راکھ کر   بھبھوت اپنی تن پر ملی سربسر
پہن ایک لہنگا زری باف کا   وہ پردہ سا کر اُس تن صاف کا
زمرد کے مُندرے لگا کان میں   کہ جوں سبزہ گل ہو گلستان میں
زمرد کی سُمرن کو ہاتھوں میں ڈال   اور اک بین کاندھے پر اپنے سنبھال
وہ موتی کی مالا وہ مونگے کا ہار   گل نسترن کی چمن میں بہار
وہ قشقہ کھنچا سُرخ ماتھے پہ یوں   پڑے نور پر لعل کا عکس جوں
پہن سیلی اور گیروا اوڑھ کھیس   چلی بن کے صحرا کو جوگن کا بھیس
وہ رخصت جو اس طرح ہونے لگی   تو وہ صاحب خانہ رونے لگی

وہ رو رو کے دو ابرِ غم یوں ملے کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے
نہ سُدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

آصف الدولہ کے عہد میں نوجوان رئیس زادوں کا فیشن۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سِن جوانی کی راتیں مرادوں کے دن
گلے میں پڑا نیمہ شبنم کا ایک بدن سے عیاں نورِ عالم کا ایک
تمامی کی سنجاف جلوہ کناں کہ جوں عکسِ مہ زیبِ آبِ رواں
طرحدار اک سر پہ پھینٹا سجا تمامی کا پٹکا کمر سے بندھا
جواہر کا تکمہ گلے میں بندھا ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا
وہ موتی کا لٹکن زمرد کی ہڑ لٹک جس کی زیبندہ دستار پر
اک الماس کی ہاتھ میں انگشتری سراسر حنا دست و پا میں لگی
اکڑ زلف کی اور کاکل کا بل جوانی کی شب اور سماں برمحل

کلام کا زور اور قافیوں کی چُستی

دوپٹے کو کرنا کبھی مُنھ کے اوٹ کہ پردے میں ہو جائے دل لوٹ پوٹ
فقیری جو کیجئے تو دُنیا کے ساتھ نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ
غلاف اُنپہ باناتِ پرزر کے ٹانک شتابی سے نقاروں کو سینک سا ہانک
گئی بائیں کی آسماں تک گمک اُٹھا گنبدِ چرخ سارا دھمک
کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے وہ پاؤں کے گھنگرو جھنکتے ہوئے
یہ کہہ نیچے اُترا دیے پاؤں وہ نظر سے بچائے ہوئے چھاؤں وہ
صباحت صفا اُس میں جھلکی ہوئی پڑی سر سے کاندھے پہ ڈھلکی ہوئی
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رباعی کہاں کی غزل
مسافر سے کرتا ہے کوئی بھی پیت مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت
دیا آسماں پر جو طبلوں کو کھینچ ہر اک تھاپ میں دل لیا سب کا اینچ

مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں۔ ساری کتاب حفظ کرنے کے قابل ہے:۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا ایں جاست

میرحسن نے دو مثنویاں اور لکھیں ۔ رموز العارفین تصوف میں اور گلِ ارم فیض آباد کی تعریف میں۔ ایک سحرالبیان سے پہلے اور دوسری اُس کے بعد مگر اس شاہکار کی چھاؤں تک بھی نہ پہونچ سکے ۔

ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہو سب کا سر — مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

سید انشانے دریائے لطافت میں اس مثنوی کے اندازِ بیان پر تعریض " بدرمنیر کی مثنوی نہیں کہی۔ گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں " لیکن خود اس میدان میں بالکل ناکارہ ثابت ہوئے ۔ متعدد مثنویاں " زنبور " و " پشہ " ۔ " فیل " و " مرغ " کی داستانوں میں اور ایک اپنے عاشقی کے احوال میں لکھی مگر میرحسن کی گرد کو بھی نہ پہونچے ۔ چند اشعار سنئے :-

کروں کیا جور گردوں کی شکایت — جہاں دیکھو اسی کی ہے حکایت

ستائے بن نہیں ہے کام اُس کو — کہاں بن دُکھ دیئے آرام اُس کو

نہیں معلوم منظور اُس کو کیا ہے — بُری چِتون سے کافر دیکھتا ہے

(پہلی ملاقات)

گئی آنکھوں تلے بجلی سے اک کوند — سمندِ ناز نے ڈالا اُسے روند

کہا دل نے مرے دیکھی جو وہ مانگ — کہ ہے یہ رات آدھی کچھ دعا مانگ

سُہانا تھا کچھ ایسا روپ اُس کا — کہ سایہ چاہتی تھی دھوپ اُس کا

وہ ظالم کے مسی آلودہ دنداں — جھلک میں موتیوں سے بھی درخشاں

پڑے ہونٹوں میں تھے ایسے دمکتے — کہ ہوں جوں رات کو جگنو چمکتے

(فراق کی بیتابی)

لبوں پر آہ ہے اور جی میں ہے درد — بھرا کرتا ہوں جب تب میں دم سرد

مجھے کچھ کھانے پینے کا نہیں ہوش — تصور سے اُنھوں کے ہوں ہم آغوش

لگی ہے آگ سی اک دل میں میرے — سمائی وحشت آب و گل میں میرے

یہ گھر سنسان اُن بن لگے ہے — کسی کو جس طرح سے جن لگے ہے

ان کے دوست یکرنگ سعادت یار خاں رنگین نے ایک مثنوی ریختی میں لکھی اور عورتوں کی زبان میں میرحسن کے اندازِ بیان کی نقالی کی :-

یہ جو ملنے میں اُس سے شرماتی — وہ اُسے چھیڑ چھیڑ گرماتی
آگئیں خوب اُس کے جب بس میں — پھر تو دینے لگیں اُسے قسمیں
اب تجھ سے ہے یہ سوال میرا — کیوں تجھ کو نہیں خیال میرا
ہستی تری ہے اگر نمودار — تو میری دھڑی بھی ہے دھواں دار
گر نکلے ہے تجھ پہ خلق کا دم — تو مجھ کو بھی چاہتا ہے عالم

افسوس ہے کہ فحش کی آمیزش نے مثنوی کو اس قابل نہ رکھا کہ اُس کے طویل اقتباسات پیش کئے جاسکیں اور کوئی مسلسل بیان نقل کیا جاسکے۔

اُستاد الاساتذہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ایک مثنوی بحر المحبت نام میر تقی کی دریائے عشق کے جواب میں لکھی۔

گرچہ ہے کلکِ میر نادر کار — تو بھی نُدرت کو اپنی کر اظہار
جن مقاموں میں رنگ کم ہے بھرا — دے ذرا اور بھی تو حسن ملا

وہی قصہ ہے وہی بحر لیکن وہ درد نہیں۔ میر صاحب کے ہر شعر کا جواب لکھنے کی کوشش فرمائی ہے۔

میر:- ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
مصحفی:- جان ہونٹوں پہ آئی آہ کے ساتھ — لہو آنے لگا نگاہ کے ساتھ
میر:- نکلے باہر وے مُوے سے نکلے — دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
مصحفی:- دو ہم آغوش دام میں نکلے — پکّے اپنے وہ کام میں نکلے
میر:- کھنچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب — تھی کشش عشق کی مگر تہ آب
مصحفی:- کفش کے ساتھ ہی گیا تہ آب — ہوا غواص گوہر نایاب

شیخ صاحب مثنوی کے خاتمہ پر عرض پرداز ہیں:-

ہے توقع کہ صاحب انصاف — مجھکو اس گفتگو میں رکھیں معاف
کچھ مرے حق میں خیر و شر نہ کہیں — نہ کہیں بد بھی نیک گر نہ کہیں

لہذا موازنہ مناسب نہیں اور اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ ہنسوڑ کہتے ہیں:-

"کہاں چاندنی چوک کی سلونی زبان اور کہاں یہ امروہہ کا پھیکا پکوان !!"

اس بحر کے آبدار موتیوں کا نمونہ یہ ہے:-

ہجر میں وصل جاودانی ہے
ہجر عاشق کی زندگانی ہے

نہ کوئی آشنا نہ ہمدم ہے
ہے جو مونس تو بس ترا غم ہے

جان مضطر ہو تن سے جانے لگی
بیخودی میں غشی سی آنے لگی

مصحفی کے شاگرد رشید طالب علی خاں عیشؔ نے ایک مختصر مثنوی "سوز و ساز" لکھی۔ قصہ دلچسپ نہیں لیکن بندش کی صفائی اور تاثیر کلام میں اُستاد سے گوئے سبقت لے گئے۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں:-

سرمایۂ سوز و ساز ہے عشق
نیرنگ نیاز و ناز ہے عشق

دل بسکہ ضعیف و ناتواں ہے
تن پر مرے جان بھی گراں ہے

طاقت نہیں جان مضمحل میں
اک آگ سی لگ رہی ہے دل میں

ناساز ہوئی جو زندگانی
بیمار نے اپنی موت ٹھانی

گر عشق دکھائے اپنی بازی
محمود کیا کرے ایازی

مصحفی کے دوسرے نامور شاگرد میر تقی ہوسؔ نے نظامی کی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ کیا اور ایسی دردناک مثنوی لکھی کہ دریائے عشق اُس کے آگے پانی پانی ہے۔ قصہ دلچسپ۔ اندازِ بیان درد خیز۔ بحر عاشقانہ۔ مثنوی کو قبولیت نصیب ہوئی۔ زبان اب بہت ترقی کر چکی ہے۔ "نپٹ" "نت" "روندھنا" وغیرہ الفاظ غیر مانوس ہوگئے ہیں لیکن کلام کی تاثیر آج بھی دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے اور آنسوؤں کے دو چار موتی شاگرد مصحفی کی اس یادگار پر چڑھانا ہی پڑتے ہیں۔

ابتدائے عشق:-

از بہر تجسس دل آرام
جھک جھک کبھی دیکھتا در و بام

کرتا کبھی دیکھنے کی گھاتیں
کرتا کبھی آپ ہی آپ باتیں

رُک رُک کے کبھی زار زار روتا
اُٹھ بیٹھتا گاہ سوتا ہوتا

کرتا کبھی چاک پیرہن کو
ملتا کبھی خاک سے بدن کو

ہر کوچے میں بے قرار پھرتا
غش کھا کے ہر ایک در پہ گرتا

لیلیٰ غرفہ سے مجنوں کو دیکھتی ہے:-

آلودہ بگرد وہ سراپا
ڈوبی یہ عرق میں سر سے تا پا

تہہ گرد کی اُس کے تھی بدن پر
تھا بار لباس اس کے تن پر

عریاں تھا جو بے کلاہ واں سر
افسوس سے ہاتھ یاں جبیں پر

واں درد سے تھا وہ دست بر دل
یاں عشق سے تھی شکست بر دل

وہ فرش زمیں پہ پا بزنجیر
مسند پہ یہاں یہ غم کی تصویر

وہ صورت موج بے قراری
یہ غرق بہ بحر سر بسر ساری

بسمل کی طرح سے وہ پھڑکتا
دل سینے میں اس کا تھا دھڑکتا

وہ آتش عشق سے پھنکے تھا
یاں ضبط سے اس کا دم رُکے تھا

ملتی تھی اُدھر وہ دست افسوس
کرتا تھا یہ دور سے قدمبوس

مجنوں کی ماں کا حال زار۔

ماں کا ترے حال ہے دگر گوں
ہے یاد تری ہی اُس کو مجنوں

روتی شب و روز رہتی ہے وہ
بیچین ہو کر یہ کہتی ہے وہ

مجنوں کی مجھے خبر نہ آئی
صورت وہ کہیں نظر نہ آئی

جس روز سے تو جدا ہوا ہے
میں کیا کہوں اُس کو کیا ہوا ہے

مطلق نہیں اپنا ہوش اُس کو
غم رکھے ہے نِت خموش اُسکو

ہے شدت غم مدام اُس کو
ہے خواب خورش حرام اُس کو

کھینچے ہے جگر سے آہ پر آہ
خوں روتی ہے شام اور سحر گاہ

نے گھر کا اُسے خیال تجھ بن
نے غم سے ہے اُس میں حال تجھ بن

بے فرش پڑے ہیں سارے دالان
سب گھر ہے بغیر تیرے ویران

ہے نام ترا ہی لیتی پھرتی
بالوں سے ہے جھاڑ دیتی پھرتی

نواب اعظم الدولہ سرور دہلوی نے سات مثنویاں یوسف زلیخا۔ شیریں فرہاد۔ لیلیٰ مجنوں وغیرہ تصنیف کیں اور وہ "سبعہ سیارہ" کے نام سے سپہر سخن پر درخشاں ہوئیں مگر اب اُن کا نشان نہیں ملتا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

اگر حاصل ہو عمر جاودانی
نہیں بن عشق لطف زندگانی

. . . .

اگرچہ عشق میں آفت ہے یکسر
نہیں پر شغل کوئی اس سے بہتر

اندوہ میں اُسکے راحتیں ہیں | مرغوب اُس کی اذیتیں ہیں
مجھ کو رہے عشق سے سروکار | اس نشہ کا دل سے ہوں طلبگار

۱۲۲۵ھ میں دہلی کے ایک شاعر منشی مولچند نے تقریباً ۹۰۰۰ بیت کی ایک طویل مثنوی لکھکر ادب اُردو کا دامن جمشید و کیخسرو - رستم و افراسیاب کی کہانیوں سے بھر دیا - سبب تالیف مولف کی زبان سے سنئے :-

عزیزان معنی شناس ایک روز | کہ تھا مثل نوروز بہجت فروز
بہم محفل آرا تھے ہنگام شب | مہیا تھے سامان عیش و طرب
وہ مجلس تھی رشک بہار چمن | ہر اک لحظہ تھا ذکر شعر و سخن
تواریخ کا بھی جو مذکور تھا | تو واں پر کسی نے بیاں یوں کیا
کہ ہے شاہنامہ تماشہ کتاب | عجب نظم دلکش ہی باآب و تاب
توکل کہ مرد سخن سنج تھا | کیا ترجمہ اُس نے شہنامے کا
لکھا نثر میں قصۂ مختصر | کہ احوال معلوم ہو سر بسر
بہ شمشیر خانی وہ موسوم ہے | تمام اُس میں احوال مرقوم ہے
یہ سُنکر برادر مرے مہرباں | سخن فہم دانشور و نکتہ داں
یہ بولے کہ منشی جی اس نامے کو | تم اب ریختے کی زباں میں لکھو
ہوا میں دل و جاں سے مصروف کار | لکھی نظم یہ دلکش و آبدار
مرتب یہ شہنامہ جب ہو چکا | کیا فکر بتب سال تاریخ کا
تو پھر ہاتف غیب نے صبحدم | کہا - قصۂ خسروان عجم

شعرا کے نقطۂ نگاہ سے اس مثنوی میں بے شمار نقائص تھے - بندشیں کمزور - قافیے سُست - محاورے بے محل الفاظ غلط - اُن کی بزم میں یہ نظم مقبول نہوئی مگر داستانیں دلچسپ تھیں - بیان صاف و سادہ تھا - ملک نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مُنیژہ کی کہانی گلی گلی بیان ہونے لگی -

مُنیژہ ہوں میں دُختِ افراسیاب | کیا گردشِ آسماں نے خراب

ناگ پنچمی اور سلونو کے میلوں میں یہ شعر اب بھی سُننے میں آجاتا ہے -

پکڑ کر کمر بند سُہراب کا | زمیں سے لیا پہلتن نے اُٹھا

اسی عہد کے قریب حکیم مومن خاں دہلوی نے متعدد مثنویاں لکھیں جن میں سے شکایت ستم (۱۲۳۱ھ) قصہ غم (۱۲۳۵ھ) اور قول غمین (۱۲۳۶ھ) نہایت درد انگیز ہیں مگر ادب اُردو کی بدنصیبی سے ان کی واقعہ نگاری اور سخن طرازی کی کچھ قدر نہ ہوئی، غزلیں غالب کی "واہ واہ" سے اور مثنویاں میر کی "آہ" سے کم رتبہ سمجھی گئیں۔ اسباب و علل پر مباحثہ فقیر کا شعار نہیں لیکن یہ واقعہ کا اظہار ہے کہ آج سخن سنجوں کی بزم میں چند ہی نفوس اس حقیقت سے آشنا ہوں گے کہ مومن کی مثنویاں درد و تاثیر میں میر و مصحفی کی مسلسل نظموں سے فائق ہیں۔ اور غالب تو اس میدان کے مرد ہی نہ تھے وہ صرف غزلوں کی "شاخ"[1] سے "چوگان" کھیلتے تھے اور اس بازی میں بھی مومن سے اکثر ہارتے تھے!!

مومن اُسی نے تجھ سے دی برتری کسی کو
جو پست فہم تیرے اشعار تک نہ پہونچا

(از قول غمین)

جدائی

اُس کے کوچے سے نہ اُٹھتا تھا قدم　　بیٹھے جاتے تھے ہر اک گام پہ ہم
دل میں جب ہوک اُٹھی بیٹھ گیا　　پاؤں اُٹھا بھی تو جی بیٹھ گیا

آخری ملاقات

کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی　　کہ نہ کچھ بولے نہ کچھ بات ہوئی
ملکے حیرت زدگان بیکس　　دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس
خوں فشاں لب پہ وہ آہیں باہم　　حسرت آلودہ نگاہیں باہم
گرچہ ہرگز بھی نہ تھی تاب کلام　　پر یہ بولی کہ ذرا جی کو تھام
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو　　مفت کس واسطے جی کھوتے ہو
اب تم اوروں سے لگا لیجیو جی　　نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی
ہاں اگر فکر ہو تو ہم کو ہو　　رنج و اندوہ ہو جو ہم کو ہو
کہ بری آدہماری خو ہے　　ہم میں اک مہر و وفا کی بو ہے

---

[1] - ایک مختصر مثنوی انبہ کی تعریف میں غالب نے کہی تھی۔

آم کا کون مرد میداں ہے　　ثمر و شاخ گوے و چوگاں ہے

تم رہو خوش کسی جاناں کے ساتھ — ہم چلے حسرت و حرماں کے ساتھ
کام دل رنج و بلا کو سونپا — تم کو تو ہم نے خدا کو سونپا

چھیڑ چھاڑ (از قصۂ غم)

وہ ہاتھ کو دمبدم جھٹکنا — وہ تکیے پہ سر کو دے پٹکنا
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا — وہ ہو کے بتنگ کاٹ کھانا
ہرجائی کی چٹکیاں وہ لینی — آزردہ ہو گالیاں وہ دینی
وہ جی سے تنگ ہونے لگتا — کچھ بس نہ چلا تو رونے لگتا

اسی زمانہ میں لکھنؤ کے ایک ہندو شاعر راحت (یا تاج ؟) تخلص نے نلدمن فیضی کا خلاصہ اُردو نظم میں کیا۔ قصہ کی نُدرت سے مثنوی مشہور ہوئی اور آج تک نوجوانوں کی صحبت میں اُس کی قدر باقی ہے۔ زبان صاف اور شاہنامہ منشی سے بہتر ہے۔

سببِ تالیف کتاب :-

قلم سے کرکے اول دُر فشانی — لکھوں میں دل کے اسرار نہانی
کہ تھا از بس سخن سے ذوق مجھ کو — سدا تھا مثنوی سے شوق مجھ کو
جو دیکھا آج کل ہندی کا چرچا — ہوا دل ایک دن مشتاق اُس کا
کہ عشق نل جو ہے عالم میں مشہور — کرے ہندی زباں میں اسکو مذکور
اگرچہ فارسی میں سب بیاں ہے — مگر طول اس کی ہراک داستاں ہے
کرے تو مختصر ایسا بیاں سب — کُھلے ہراک پہ جو راز نہاں سب

ہندوستان کی تعریف :-

زہے ہے حُسن میں وہ مُلک نامی — بجا ہے گر کرے کنعاں غلامی
وہ کافر زلف رکھتے ہیں کمر تک — پھنسے جس میں دل اسلام بیشک
جہاں ایسے بتوں کی ہو خدائی — کریں کیونکر نہ واں سب جبہ سائی

یہ مثنوی ۱۲۶۲ھ میں تمام ہوئی۔ "یہ داستان ہے راحت افزا"، تاریخ اختتام ہے۔ مصنف کا صحیح نام معلوم نہ ہوسکا۔ کوئی کہتا ہے کہ تاج بہادر تاج کی تصنیف ہے جو محلہ نوبستہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور کوئی راحت کی طرف منسوب کرتا ہے۔ داستان مشہور ہے

مگر داستان گو گمنام ہوگیا۔

میر تقی۔ میر حسن۔ انشا و مصحفی نے لکھنؤ کی مبارک سرزمین پر اپنی مشہور مثنویاں تمام کیں لیکن اُن کے سینوں میں دلّی کے "اُجڑے ہوئے دیار" کی یاد تھی۔ وہ اپنی زبان و محاورات کی سند کے لئے "خانم کی بازار" اور "جامع مسجد کی سیڑھیوں کی" طرف اشارہ کرتے تھے۔ لکھنؤ کی زبان اور بیان کا اسوقت تک کوئی جداگانہ انداز نہ تھا اس لئے زبان کے اعتبار سے ان بزرگوں کی مثنویاں خواہ لکھنؤ کی خیال کی جائیں یا دلّی کی مگر ان سب میں عموماً اور سحرالبیان میں خصوصاً لکھنؤ کی معاشرت کا اس قدر گہرا نقش ہے کہ کم از کم مثنوی میر حسن کو تو خالص لکھنؤ کی پیداوار سمجھنا چاہئے۔

ناسخ و آتش کے دور میں لکھنؤ نے علم بغاوت بلند کیا۔ نواب وزیر شطرنج کے بادشاہ بنے۔ متروکات سخن کے نئے دفتر اور معائب کلام کے جدید قوانین مرتب ہوئے۔ تازہ محاورات خانہ ساز ٹکسال میں ڈھلنے لگے۔ شعرا نے دلّی کی مرکزی حکومت کا جُوا گردنوں سے اُتار پھینکا۔ صحت زبان صفائی بیان پر مرجح قرار پائی۔ صنعت طرازی اظہار جذبات سے اعلیٰ متصور ہوئی اور زباندانی۔ خوش بیانی کا ایک جدید اسکول یہاں قایم ہوگیا۔ اس دور انقلاب کی پہلی مشہور مثنوی شیخ ناسخ کی نظم سراج ہے جو سنہ ۱۲۵۴ھ میں مکمل ہوئی چھ سات سو بیتوں میں بعض احادیث کا ترجمہ ہے صحت الفاظ میں شک کی گنجایش نہیں لیکن قافیے بے حد سست ہیں۔ "نیک نام" "نیک خو" "خوش بیان" "خوش کلام" وغیرہ وقف عام صفتیں مصرعوں کا وزن پورا کرنے کو بے ضرورت استعمال کی گئی ہیں اور ایک شعر بھی اس قابل نہیں ہے کہ اس مضمون میں نقل کیا جائے۔ "معجزۂ آل نبی" اور "قصۂ شاہ روم" جو اسی زمانہ کی بعض غیر مشہور شاعروں کی تصنیفات ہیں وہ مجد و زبان کی اس مثنوی سے افضل ہیں۔ اُن میں روانی اور تاثیر ہے جس کا نظم سراج میں نشان نہیں۔ ناسخ کی مثنوی کلیات میں بحفاظت مقفل ہے لیکن "قصۂ شاہ روم" اب بھی بچوں کی زبان پر ہے۔

عجب تھا سہمگیں میداں وہاں کا　　شجر بھی واں نہ تھا سایہ کہاں کا
ہوئی مرضی جو رب العالمیں کی　　طنابیں کھنچ گئیں اُس سرزمیں کی
وہ شہ اور فوج و لشکر اُس کے ہمراہ　　ستاروں کے ہو جیسے بیچ میں ماہ

شیخ ناسخ کے انتساب سے نظم سراج لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی تصور کی گئی ورنہ شاعرانہ حیثیت سے اُس کا کوئی درجہ نہیں۔ علاوہ اس کے وہ اس جہت سے بھی اول کہلانے کی مستحق نہیں کہ جو اس نظم کا سنہ تالیف ہے وہی سال اُس بے مثال مثنوی کے اختتام کا ہے جس کا ادب اُردو میں کوئی ثانی نہ ہوسکا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے گل بکاؤلی کا دلچسپ قصہ جو پہلے سے اُردو نثر میں موجود تھا نظم کیا

وہ نثر ہے داد نظم دوں میں　　اس مے کو دو آتشہ کروں میں

اور سنہ ۱۲۵۴ھ میں یہ بیش بہا مثنوی تمام ہوئی۔

ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد　　　گلزار نسیم نام بنہاد
بشنید و نوید ہاتفے داد　　　توقیع قبول روزیش باد

میر حسن نے مناظر کی مصوری اور جذبات کی نقاشی میں کمال دکھایا تھا لیکن داستان اُن کی طبعزاد تھی۔ جب جگہ جیسی ضرورت ہوئی قصہ کو توڑ مروڑ لیا۔

نسیم دوسرے کی لکھی ہوئی "روداد زمان باستانی" کے پابند تھے اور اس میں ترمیم و تحریف کی گنجائش نہ تھی۔ میر حسن نے زبان صاف۔ سادہ اور بے تکلف اختیار کی جو واقعہ نگاری کے لئے مناسب و موزوں تھی۔ نسیم نازک خیالی۔ نقش طرازی۔ اور معنی آفرینی کے بغیر شعر کہنا وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ کسی جگہ اسلوب بیان سحر البیان سے ٹکر نہ کھائے۔ ان سخت قیود کے ساتھ داستاں نگاری میں کامیابی نسیم کا سحر و نیرنگ ہے۔

خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر　　　نیرنگ نسیم باغ کشمیر
نقطے ہوں پسند خوش بیانی　　　جدول ہو حصار سحر خوانی
جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے　　　مرکز پہ کشش مری پہونچ جائے

مصوری کے کمالات دیکھئے :-

(۱)

اک شب راجہ تھا محفل آرا　　　یاد آئی بکاؤلی دل آرا
پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے　　　شہزادی بکاؤلی کدھر ہے
منھ پھیر کے ایک مسکرائی　　　آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہگئی ایک　　　ہونٹوں کو ہلا کے رہگئی ایک

راقم الحروف کئی دن غور کرتا رہا کہ مندرجۂ بالا دو شعروں کا جواب اُردو شاعری کے تمام سرمایہ میں کہیں موجود ہے یا نہیں، بلکہ فارسی کی گرانقدر مثنویوں میں بھی یہ سینما کی سی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں یا نہیں مگر کوئی نظیر یاد نہ آئی۔ ممکن ہے کہ اُسکی کوتاہ نظری کا قصور ہو یا فہم کا فتور۔

(۲)

جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں　　　باہر بصد آب و تاب آئیں
پوشاک دھری ہوئی نہ پائی　　　جانا کہ حریف نے اُڑائی

جھک جھک کے بدن چراتی آئیں　　رک رک کے قدم بڑھاتی آئیں
جھنجھلا کے کہا کہ لاؤ مانو　　ہم کو بھی بکاؤلی نہ جانو

واقعہ نگاری کی شان دیکھئے:-

روح افزا نے کہا بہن سے　　بہتر کوئی جا نہیں چمن سے
گلگشت کریں چلو — کہا خیر　　کیا جانئے کہ ہوگی سیر میں سیر
چل پھر کے ہنسی ہنسی میں پوچھا　　کھونا ملنا بہن یہ کیا تھا
روح افزا نے کہا کہ ہمشیر　　میں نے یہ سنا کہ تو ہے دلگیر
واللہ کہ چھان کر خدائی　　تیرے پیارے کو ڈھونڈھ لائی
سمجھی وہ ہنسی کہا سڑن ہو　　نادان ہو کیا کہوں بہن ہو
ہم کو یہ ہنسی نہیں گوارا　　پیارا ہوئیگا وہ تمہارا
پیارا جو نہ تھا تو کھوگئیں کیوں　　بدرا بھی آپ ہوگئیں کیوں
بولی وہ آشنا تمہارا　　پیارا نہیں پیاری کا ہے پیارا
گر اُس کی تلاش میں میں کھوئی　　بدراہ نہ کہہ سکیگا کوئی
جو چاہو کہو جواب کیا دوں　　قایل نہیں ہوتی ہو دکھادوں
وہ جوگی وہ دھونی اور وہ آسن　　دکھلایا تو تھی اُسیکی جوگن

جذبات کی نغمہ سرائی:-

منھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی،　　پر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے　　کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل؟　　جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہاتھ اُسپہ اگر پڑا نہیں ہے　　بو ہوکے تو پھول اُڑا نہیں ہے
تھرائیں خواصیں صورتِ بید　　اک ایک سے پوچھنے لگی بھید
انہوں میں سے پھول لیگیا کون　　بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون
شبنم کے سوا چرانے والا　　اوپر کا تھا کون آنے والا

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا پتلی وہی چشم حوض کا تھا
نام اُس کا صبا نہ لیتی تھی میں اُس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں
اور باد صبا ہوا نہ بتلا خوشبو ہی سُنگھا پتا نہ بتلا

اشارات وکنایات کا طلسم :-

جب پردۂ صبح ہوگیا فاش خنداں خنداں اُٹھا وہ بشاش
اُس غنچہ دہن کا مُسکرانا بے رنگ بکاؤلی نے جانا
ہنستے ہنستے کہا ہنسے کیوں ہنستا نہیں بے سبب کوئی یوں
بولا وہ کہ خواب دیکھتا تھا آتش پہ کباب دیکھتا تھا
بولی وہ کہ ہم بتائیں تعبیر دل سوزی کرے گا کوئی دلگیر
بولا وہ کہ رات کو اُفق میں خورشید تھا آتش شفق میں
بولی وہ کہ پھر سے شب و روز عالم میں رہو گے رونق افروز
بولا وہ کہ اک مقام ہو تھا گلزار خلیل روبرو تھا
بولی وہ بشر ہو تم دلاور سرسبز ہو قوم آتشی پر
بولا وہ کہ دیکھی اک شبستاں شعلہ ہوا انجمن میں رقصاں
بولی وہ کہ شعلہ میں پری ہوں جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں
بولا وہ کہ جب ہوا اُجالا بخشا مہ انجمن نے ہالا
ہالا مہ انجمن کا کیا تھا ؟ وہ ہار تھا جو گلے پڑا تھا!!
گھبرائی پری کہ ہیں! یہ کیا ہے ؟ بولی وہ کہ ہار نولکھا ہے!!
کاندھے پہ تھا جس کے رات ڈالا پہچانتی ہو وہ سطبلے والا

صنعت طرازی کے ساتھ الفاظ کی سادگی اور قافیوں کی چُستی -

تو باغ ارم سے لے گیا گُل تو مجھ سی پری کو دے گیا جُل
تجھ کو ترے باپ سے ملایا مجھ کو یہ ملا کہ تجھ کو پایا

جو جو اسرار تھے نہانی | سب تجھ سے سُنے تری زبانی
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے | جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
اب تک ہیں وہ خارجی کے جی میں | جلد آ کہ ہے مصلحت اسی میں
آئے گا تو درگزر کروں گی | ورنہ میں بہت سا شر کروں گی
کانٹوں میں اگر نہو اُلجھنا | تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

اختصار اس مثنوی کا بے مثال ہے۔ ایک شعر درمیان سے حذف کیجئے تو ساری داستان برہم ہوجائے۔

طوطا بنکر شجر پہ آکر | پھل کھا کے بشر کا روپ پاکر
پتے پھل گوند چھال لکڑی | اُس پیڑ سے لیکے راہ پکڑی
گھر بار سے کیا فقیر کو کام | کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام
پوچھا کہ سبب؟ کہا کہ قسمت | پوچھا کہ طلب؟ کہا۔ قناعت
تنہا اُسے دیکھ کر کہا۔ ہیں! | محمود اکیا ہوئیں؟ کہا "ہیں"
یہ کہکے اُٹھا کہا کہ "لو جان" | جاتے ہیں کہا۔ "خدا نگہبان"
پوچھا کہ کدھر سے آئے کیا نام | بولا وہ کہ نام سے ہے کیا کام
تیورا کے دہیں وہ بار بردوش | بیٹھا تو گرا۔ گرا تو بیہوش
جھنجھلا کے ڈرا کے غل مچا کے | سمجھا کے۔ دبا کے۔ دست پا کے
مَن چھین کے چوری کے بہانے | بھیجا کھلے بندوں قید خانے

نازک خیالی کا کمال

چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں | کالے ڈسیں بال اگر چھوئے ہوں
سیاح کو کیا قیام سے کار | شبنم نہیں جاگزینِ گلزار
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا | جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

اشعار کہاں تک نقل کئے جائیں۔ اول سے آخر تک صنایع و بدایع کا دریا موجزن ہے۔ جب تک اُردو زبان ہندوستان میں زندہ ہے یہ نظم سخن فہموں کے گلے کا ہار رہیگی اور سحرالبیان کے برابر اس کی عزت و توقیر ہوگی۔

گلزار نسیم کی مہک نے سخنوروں کی محفل کو طبلۂ عطار بنادیا۔ لکھنؤ کے گلی کوچے اس خوشبو سے مست ہوئے اور مثنوی کہنے کا

عام شوق پیدا ہوگیا۔

نازک خیالی اور سخن آفرینی کے ساتھ واقعہ نگاری نسیم کا حصہ تھا۔ تقلید کی بیشتر کوششیں ناکام رہیں۔ ملک الشعرا قاضی صادق علی خاں اختر نے ایک مثنوی "سراپا سوز" لکھی۔ نہ بیان میں روانی تھی نہ زبان میں شعلہ فشانی۔ افسانہ بھی دلچسپ نہ تھا۔ دُختِ زرگر کی کہانی بُھکر رہگئی۔ (رئیس زادہ جوگی بنکر آتا ہے)

گرد و پیش اُس کے ایک جمِ غفیر	ہمدم گریہ سب صغیر و کبیر
خاک اڑاتا تھا اپنے سر پہ کوئی	ہاتھ رکھے ہوئے جگر پہ کوئی
کوئی کرتا تھا اس طرح نالے	جس سے جینے کے پڑ گئے لالے
لوگ تھے گرد ماتمی سج سے	بیچ میں وہ جواں تھا اس دھج سے
تن کی اُس کے بھبوت سے یہ نمود	جیسے دُرِّ یتیم گرد آلود
سر پہ یوں زر کے انڈوے کی پھبن	ہو دے سورج کے گرد جیسے کرن
کنڈل اُن کانوں میں یہ آفت ہوش	مہر و مہ جسکی چھب کے حلقہ بگوش
زیب بخش گلو تھا یوں زُنّار	ہو بندھا جیسے آنسوؤں کا تار
غرض اس شکل سے جو آتا تھا	خلق کا جی ہی نکلا جاتا تھا

آتش کے نامور شاگرد میر وزیر صبا نے ۱۲۶۴ھ میں ایک مثنوی "صیدیہ" لکھی۔ اپنے مُربّی نواب محسن الدولہ کے سیر و شکار کی حکایت نظم کی۔ صنایع و بدایع کے طلسم بنائے۔ محاورات کے دریا بہائے لیکن قبولیت عام کا شکار نہ کر سکے۔ بہر حال اُستاد کا کلام ہے اور موتیوں سے تولنے کے قابل ہے۔ چند اشعار سنئے:۔

عجب ایک بستی لبِ آب تھی	کہ جو بات تھی اُس کی نایاب تھی
جسے دیکھئے حسن میں وہ پری	وہ صورت کہ دیکھا کرے آدمی
لٹک۔ اچپلاہٹ۔ شرارت۔ اُمنگ	دمکتا وہ کندن سا چہروں کا رنگ
وہ چھوٹے ہوئے گیسوئے عنبریں	کمندیں لئے غارت نقد دیں
وہ ہنگے نمونے تھے گلزار کے	اور اُن پر دوپٹے وہ زرتار کے
وہ باتیں جو سنئے تو کیا بات ہے	وہ چالیں کہ کبک دری مات ہے
وہ دریا کا عالم وہ جنگل کا روپ	وہ دھانوں کے کھیتوں پہ بدلی کی دھوپ

میر حسن کا شعر یاد آگیا:۔

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ ۔ یہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

۱۲۶۷ھ میں منشی جگناتھ خوشتر لکھنوی نے رامائن کا ترجمہ کیا:۔

سروش غیب نے فرمایا سُنکر ۔ ریاض نور ہے تاریخ خوشتر

حکایتیں دلچسپ اور نتیجہ خیز تھیں۔ قافیے بھی چست تھے۔ مگر تشبیہات و استعارات کے ساتھ داستاں نگاری میں کامیابی نہ ہوئی اور سخنوروں نے اس نظم کی کچھ قدر نہ کی۔

خاتم السلاطین واجد علی شاہ اختر نے متعدد مثنویاں کہیں۔ شاہ ذیجاہ نے محاورات کے دریا بہائے۔ خدام بارگاہ نے ہر قطرہ سے تحسین و آفریں کے باغ لگائے لیکن سخن سنجوں کی بزم میں اس شعبدہ پردازی کی کچھ قیمت نہ ہوئی۔ دریائے تعشق کا قصہ دلچسپ تھا الف خاں حباب نے ڈراما بناکر شوقین نوجوانوں کو مدتوں "غزالہ ماہرو" کا شکار رکھا مگر مثنوی کے اُچھالنے کا حباب میں دم نہ تھا وہ بدستور ڈوبی رہی۔ تاہم زبان صاف و سلیس ہے۔ بیان میں درد ہے۔ "ملک الکلام" نہ سہی "کلام الملوک" ضرور ہے۔

لال پری خودکشی کے لئے طیار ہوتی ہے:۔

وہ رشکِ قمر نہا چکی جب ۔ پہنا کفن اُس نے گیروا سب
تسبیح گلے میں ایک ڈالی ۔ اور مانگ بھی بالوں میں نکالی
بالوں کو بھی کر دیا پریشاں ۔ حُسن اُس سے ہوا مگر دوچنداں
کافور لگایا سب بدن میں ۔ کچھ عطر بھی مل دیا کفن میں
عمامہ بھی باندھا اُس نے سر پر ۔ اور گیروی اوڑھی ایک چادر
جسم اپنا چھپا کے سب کفن میں ۔ وہ شمع رُخ آئی انجمن میں
اک ہاتھ میں اُس کے خنجر تیز ۔ اور ایک میں جام سم سے لبریز
اک لونڈی کے ہاتھ میں اگر سوز ۔ رومال لئے کوئی جگر سوز
واں ناچ کا شغل ہو رہا تھا ۔ غُل ساز طرب کا جا بجا تھا
مطرب سب کو رجھا رہے تھے ۔ اختر کی غزل یہ گا رہے تھے
عاشق کو نہ اس قدر ستاؤ ۔ پچھتاؤ گے اب بھی باز آؤ
ہمتو اُٹھتے ہیں اب جہاں سے ۔ چاہو جسے پاس تم بٹھاؤ

عاشق نہ ملے گا ہم سا کوئی جو کہتے ہیں اب بھی مان جاؤ

آغا حسن نظم لکھنوی نے ایک مثنوی لذتِ عشق نام سحرالبیان کے جواب میں لکھی۔ وہی بحر ہے مگر روانی زیادہ ہے۔ اُسی طرز کا قصہ ہے لیکن بے حیائی میں دس بیس قدم آگے ہے۔ مصحفی کی بحرالمحبت کو جو نسبت دریائے عشق سے تھی وہ بھی اس مثنوی کو سحرالبیان سے نصیب نہ ہوئی۔ میر حسن کی جوگن بصیرت افروز ہو چکی ہے۔ نظم کا "فقیر" دیکھئے :-

رنگا گیروا اپنا سارا لباس نبھایا کیا فقر کا سب لباس
وہ بیراگی اک بانس کی پیچدار کہیں شکل آہو کہیں شکل مار
وہ تسمہ وہ کفنی وہ پھینٹ لنگوٹ تکلف کی جس میں لگی سبز گوٹ
سمندر کا بس اک منگا نارجیل بنائی وہ کشکول اک بے عدیل

"بدرمنیر" کی بیتابیٔ فراق ملاحظہ ہو چکی ہے۔ نظم کی ہیروین کا سوگ دیکھئے :-

تلاطم میں شب بھر طبیعت رہی نہ رنگت رہی وہ نہ صورت رہی
بہت آگیا فرق اوقات میں وہ کھسیانا ہو جانا ہر بات میں
وہ گرمی سے رخ تمتمایا ہوا وہ رونے سے منھ بھر بھرایا ہوا
خوشی ہے نہ راحت نہ عیش و طرب خواصیں بھی میلی کچیلی ہیں سب
کہیں ہے جو مسند تو تکیہ نہیں کہیں فرش تک بھی بچھایا نہیں
دروں میں ہر اک جا پہ جالے لگے چھتوں میں ابابیل کے گھونسلے

کہاں سحرالبیان کی مرصع کاری اور کہاں یہ نظم بازاری !! — چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک !!

نظم کے وقت تک زبان بہت ترقی کر چکی تھی لیکن "ہنیگے" بے تکلف استعمال کرتے ہیں اور تعقید کو بھی عیب نہیں سمجھتے۔

یہ دونوں جو ہنیگے مرے میہماں بٹھا تخت پر ان کو تم ہو رواں

صرف چند شعر یاد رکھنے کے قابل ہیں :-

نیا پھول گلشن میں پھولا ہے آج مسافر کوئی راہ بھولا ہے آج
بیاں کیا کروں اُنپہ کیا روپ ہے کہ سائے میں چھٹکی ہوئی دھوپ ہے
سحر تک نہ سوئی نہ سونے دیا نہ موتی میں دھاگا پرونے دیا

لنگوٹے کو آگے بڑھا لیجئے
کرامات داتا چھپا لیجئے

آخری دو شعر اخلاقی معیار سے پست ہیں لیکن غضب کی شوخی ہے اور اُردو زبان ان کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی۔ نواب بادشاہ محل عالم نے بھی ایک مثنوی لکھی۔ بیگماتی زبان میں منجموں اور جوگیوں کی اصلاحیں اور شادی بیاہ کی رسمیں نظم کیں۔ علم نجوم و موسیقی سے واقفیت کا ثبوت پیش کیا۔ قصہ سحر البیان کے طرز کا تھا مگر دلچسپی میں اُس سے کم۔ شائستگی و متانت جنس لطیف کی تصنیف میں ہونا ہی چاہئے وہ موجود تھی مگر درد و تاثیر کا نشان نہ تھا۔ مثنوی کی کچھ قدر نہوئی۔ بیگم صاحبہ نے خاتمۂ کتاب پر دعا مانگی تھی وہ بھی قبول نہوئی روشنائی بھی خشک نہوئی تھی کہ سلطنت چھن گئی اور راج لٹ گیا۔

رہے جب تک کہ مہر و مہ میں نور
مہدی دین کا جب تلک ہو ظہور

نوجواں بادشاہ خوش اقبال
والئ لکھنؤ خجستہ خصال

جو کہ مشہور جانعالم ہے
رونق بوستان عالم ہے

رہے رونق فزائے خطۂ ہند
فخر ایراں بنائے خطۂ ہند

البتہ آفتاب الدولہ قلق نے ایک طویل مثنوی طلسم اُلفت نام لکھکر لکھنؤ کے انداز واقعہ نگاری کی آبرو رکھی۔ جس طرح شاعروں کی زبان میں زلف یار کی درازی پائے معشوق کے لئے گاہ گاہ کمند ہو جاتی ویسے ہی اس نظم کی برجستگی کو اُس کی فضول طوالت سے نقصان پہونچا۔ اگر نسیم کی طرح وہ بھی ورد یک کا قانون جاری کرتے یا غالب کی طرح کلیات کا عطر نکالتے تو شاید گلزار نسیم پر خزاں آجاتی مگر خیالات کی بے انداز وسعت۔ مضامین کے بے ضرورت پھیلاؤ نے قافیے سست کر دئے۔ "اے حور"۔ "اے ماہ"۔ "خوشخو"۔ "نیک ذات"۔ "بے پیر" وغیرہ بھرتی کے الفاظ نے آورد و تصنع کی حد کر دی اور بعض جگہ گفتگو مقتضائے حال کے خلاف ہوگئی۔

مواصلت میں عُریاں نگاری کی رسم قبیح میر اثر۔ میر حسن۔ مومن اور نسیم نے رائج کی تھی لیکن انھوں نے سارا لوک شاستر نظم کر دیا۔ اور سنجیدہ صحبتوں میں اس مثنوی کے نام پر ثقاہت کی نگاہیں نیچی ہونے لگیں۔

بااین ہمہ پر لطف بیان۔ بیگمات کی شستہ زبان۔ محلات شاہی کے نادر محاورے۔ رنگیلے جانعالم کے عہد کی معاشرت۔ عشق آباد لکھنؤ کے رسم و رواج۔ قصہ دلچسپ۔ اشعار نور آگیں۔ آبدار مضامین۔ مثنوی کو قبولیت عام کا خلعت ملا اور شاعر کی آرزو پوری ہوئی کہ بزم خوباں میں جب پڑھی جائے۔ ایک اک سُن کے وجد میں آئے۔

پہلے سرزمین عشق کی تعریف سُنئے:۔

شہر مانند لکھنؤ آباد
ہر گلی رشک گلشن شداد

مثل بازار مصر ہر بازار
یوسف وقت ساکنان دیار

تھی وہ کچھ سرزمیں بھی اُلفت خیز
کوچہ کوچہ تھا اُس کا عشق انگیز

کھیل لڑکوں کا عشق بازی تھا
شمع ساں شغل جانگدازی تھا

سب جو عاشق مزاج رہتے تھے
عشق آباد اُس کو کہتے تھے

حُسن آباد کی توصیف:-

شہر دیکھا کہ آدمی تو کیا
گر پری دیکھے تو ہو سکتا

ہے ہر اک گلفروش البیلا
پھول والوں کا روز ہے میلا

دلکش اک اک مقام ہے اُس کا
حُسن آباد نام ہے اُس کا

فرزندِ عزیز کے وداع کے وقت باپ کی حالت:-

سر کو رکھے ہوئے ہیں تکیے پر
تر ہے اشکوں سے مسند پُر زر

جب اُٹھاتے ہیں سر تو آہ کے ساتھ
وزرا رو رہے ہیں شاہ کے ساتھ

خود تو اپنے جگر کو تھامے ہیں
لوگ ان کی کمر کو تھامے ہیں

ماں کی حالت زار:-

ضعف سے دمبدم غش آتے تھے
لوگ سب لخلخے سنگھاتے تھے

گاہ صحنِ محل میں آ آ کر
کھول کر سر کے بال گھبرا کر

گود پھیلا کے مانگتی تھی دعا
یارب اس داغ سے کلیجہ بچا

کبھی در سے وہ سر ٹپکتی تھی
کبھی دیوانہ وار بکتی تھی

اب کوئی دم میں گھر اُجڑتا ہے
مجھ سے بچہ مرا بچھڑتا ہے

ماں بیٹے کو رخصت کرتی ہے:-

واری اب کیا یہی ارادہ ہے
رات ابھی تو بہت زیادہ ہے

اتنی کیوں جلدی کرتے ہو جانا
اب نہ روکیں گے بیٹے لو مانا

ہمکو تنہا ہی آپ چھوڑ چلے
ماں سے بے جرم مُنھ کو موڑ چلے

یہ تو کہدو کہ جلد آؤ گے
ہم کو تم بھول تو نہ جاؤ گے

وعدہ کر لو تو کچھ تسلی ہو
دل کو ڈھارس بندھے تشفی ہو

میرا پیش نگاہ حال رہے | واری آتنا ذرا خیال رہے
کر یہ ماں گور کے کنارے ہے | بے سہارے ہے بے سہارے ہے
تم کو تو لائے گا خدا پھریاں | میں کہاں؟ چند دن کی ہوں مہماں

معشوق کی فراق یار میں بیتابی:۔

جس قدر عرصہ ہوتا جاتا تھا | شوق دیدار اُسے ستاتا تھا
چوٹ پہلے پہل جو کھائی تھی | نئے غم سے جو آشنائی تھی
وہ گلِ تر ہزار ٹالتی تھی | لاکھ صورت سے دل سنبھالتی تھی
پر نہ دل کو قرار آتا تھا، | غم کلیجے کو کھائے جاتا تھا
حسرتِ دید بڑھتی جاتی تھی | وحشتِ عشق سر اُٹھاتی تھی
لیکن اک ایک سے چھپاتی تھی | دل ہی دل میں وہ کوفت کھاتی تھی
متحمل جو ہو نہ سکتی تھی | آپ ہی آپ پہروں بکتی تھی

باغ معشوق کی مالنوں کی شان دیکھئے:۔

مالنیں چار پانچ سو کمسن | پیاری پیاری ادا غضب کے دن
چوٹیاں نور کی گندھی ہوئیں صاف | جلوہ گر رنگ رنگ کے موباف
غارت ہوش پاؤں میں چھاگل | کتنی گورے یہ خوشنما ہیکل
لہنگے اطلس کے پاؤں میں پُرزر | سر سے پا تک جڑاؤ سب زیور
بیلچے کھرپیاں مرصع کار | شغل آرایش چمن ہر بار

مالنیں شہزادہ سے پوچھتی ہیں کہ:۔

ایسی وہ کون سی ہے مہ پارہ | جس کی اُلفت میں تم ہو آوارہ

شہزادہ جواب دیتا ہے:۔

اے جوانانِ گلشنِ شاداب | خار دیتی ہیں یہ تمھیں دو جواب
گروہ نو بادۂ ریاض جمال | وہ ثریائے آسمان کمال
حُسن میں بے مثال ہے کہ نہیں | گلِ باغ جمال ہے کہ نہیں

تمھیں غنچوں چٹک کے کچھ دو جواب ۔ دہن اُس گل کا کیا نہیں نایاب
تو ہی ان سے اُلجھ پڑا اے سنبل ۔ بوئے عارض سُنگھا دے نگہت گل

شہزادہ کو اُس باغ میں یار کی خوشبو ملتی ہے۔ وہ متحیر ہوتا ہے۔ انہیں نام و نسب دریافت کر رہی تھیں اسی عالم حیرت میں اُنکو جواب دیتا ہے۔ پورا سین ملاحظہ کے قابل ہے:-

بیٹھنے کو وہ آکے بیٹھا تھا ۔ پر دھواں سوزِ دل سے اُٹھتا تھا
چین لیتا نہ تھا دلِ مضطر ۔ چار سو دیکھتا تھا اُٹھ اُٹھکر
دل سے کہتا تھا وہ اسیر ستم ۔ یاں کہیں آج اے دلِ پُر غم
نگہتِ زلفِ یار آتی ہے ۔ بوئے شوخ نگار آتی ہے
آتشِ شوق نے جو گرمایا ۔ کھینچکر آہِ سرد فرمایا
کیا کہیں تم سے کون ہیں کیا ہیں؟ ۔ بلبلِ گلشنِ تمنا ہیں!
وطن آوارہ خانماں برباد ۔ نامراد و ستم کش و ناشاد
آہ فرہادِ کوہِ غربت ہوں ۔ قیس صحرائے درد و محنت ہوں
جھوٹ کہتا نہیں میں سچ جانو ۔ کافرِ عشق ہوں مسلمانو
یہ جو صورت ہے یہ جو وحشت ہے ۔ حضرت عشق کی بدولت ہے
کیا بتائیں تمھیں نسب اپنا ۔ ابتو ناشاد ہے لقب اپنا
کبھی انسان تھے پریزادو ۔ دلِ ناداں کے بس میں ہیں ابتو
نام ہے ابتو عاشقِ بدنام ۔ ابتو مہر و وفا سے رکھتے ہیں کام
مورد ِ ظلم حبیب کہتے ہیں ۔ عاشقِ بدنصیب کہتے ہیں
... سر گزشت بلاکشاں نہ سُنو ۔ نہ سنو میری داستاں نہ سنو
فقرہ فقرہ ہے اس کا پُرتاثیر ۔ ہو نہ جاؤ کہیں بلا میں اسیر

طلسم الفت ابھی تمام نہوئی تھی کہ لکھنؤ نواب مرزا شوق کے زمزموں سے گونجنے لگا اور حسن و عشق عیش و عشرت کے متوالے نغمہائے شوق سے پرجوش ہو گئے۔ فریب عشق نے رنگین مزاج نوجوانوں کی آتش شوق پر تیل چھڑکا۔ بہار عشق نے دردمندان محبت کے دل چھینے اور زہر عشق کی حسرتناک موسیقی نے سارے شہر کو دیوانہ بنا دیا۔ بندش کی صفائی۔ زبان کی سادگی۔ بول چال کی بے ساختگی۔

محاورات کی برجستگی نے عوام کے قلوب کو مسخر کیا۔ واقعہ نگاری اور نقش طرازی کے کمال نے خواص کی گردنیں خم کیں اور ان مثنویوں کو ایسی مقبولیت عام نصیب ہوئی کہ اگلے سخنوروں کے چراغ ٹمٹمانے لگے اور میر حسن کی سحر البیانی فراموش ہوگئی حاسدوں نے ان نظموں کی "لغزش مستانہ" کو پستی اخلاق سے تعبیر کیا، سفارشیں اُٹھوا کر برسوں ممنوع الاشاعت رکھا۔ بزرگوں کی سنجیدہ صحبتوں میں ان کا تذکرہ اخلاقی جرم قرار دیا لیکن شمع کی روشنی دامن سے اور چاند کا نور خاک سے چھپ نہیں سکتا۔ بہار عشق اور زہر عشق کو بقاء دوام کے دربار میں جگہ ملی اور نکتہ چیں مُنھ دیکھتے رہگئے۔

واجد علی شاہ کے دور میں لکھنؤ کی خانگیوں کی زبان سنئے :-

(فریب عشق)

اری تو میں کہوں سبب کیا ہے
ارے تو ہی نواب مرزا ہے

ایک ہی مرشد ہو تم قصور معاف
سُن چکی ہوں میں آپ کے اوصاف

بیوفائی میں دل جلانے میں
تو تو مشہور ہے زمانے میں

جعلسازی یہ تجھکو کیونکر آئی
ایک کو سائی دوسرے کو بدھائی

دور بھی ہو نگوڑے سودائی
موا ہر دگی چھپا ہرجائی

کس کے عاشق بنے ہو کیسی چاہ
میں کہاں تم کہاں معاذاللہ

اک ذرا ہٹ کے بیٹھو مُنھ بنواؤ
ہے جوتی بھی مجھ کو گھی سے کھاؤ

ساتھ لے دیکے اپنے یاروں کو
بینڈ کی بھی چھلی مداروں کو

مردوا ہو دے نوج اس گت کا
جیسے دھونسا نگوڑا نوبت کا

سُن کے یہ پھبتی میں نے اُس سے کہا
اب یہ نوبت ہوئی ہماری بجا

بولی چپ رہئے مُنھ کی کھائیے گا
اک ذرا سینک کر بجائیے گا

ہوش کی اپنے کچھ دوا کیجئے
مجھسے ناحق نہ چو چلا کیجئے

معشوق کا سراپا میر تقی، میر حسن اور دوسرے مثنوی نگاروں نے بھی بیان کیا تھا لیکن بہار عشق کی حسینہ کی شان ہی نرالی ہے اور یہ خشک مضمون دلچسپ ہوگیا ہے :-

حُسن یوسف بھی اُسکے آگے ماند
چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند

جلوۂ حسن رشک شعلۂ طور
چشم بد دور آنکھیں موتی چور

رخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال
رگِ گل سے وہ ہونٹ پان سے لال

بے مسی کے وہ دانت رشکِ گہر
جان عاشق نثار ہو جس پر

قد میں آثار سب قیامت کے
گوری گردن میں طوق منت کے

رخ پہ گرمی سے وہ عرق کم کم
جس طرح گل پہ قطرۂ شبنم

عکس رخ موتیوں کے دانوں میں
بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں

آڑی ہیکل گلے میں ڈالے ہوئے
پیاری پیاری کچیں نکالے ہوئے

رگِ گل سی کمر لچکتی ہوئی
چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

پائنچے ناز سے جو اُس نے اُٹھائے
میں پکارا خدا کمر کو بچائے

جس طرح سحر البیان کی ''عیش بائی'' نقاشی کا بہترین نمونہ ہے ویسے ہی بہار عشق کی ''خادمہ'' مصوری کا کمال ہے:-

اتنے میں نکلی گھر سے ایک عورت
سانولا رنگ چلبلی صورت

لال نیفہ ازار بند بڑا
گچھا ایک کنجیوں کا اُس میں پڑا

کھیلتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی
آنکھ ایک ایک سے ملاتی ہوئی

چاق چوبند سینہ زوری میں
پھول رکھے ہوئے کٹوری میں

حسن کے دن جوانی زوروں پر
رات کی باسی مہندی پوروں پر

دھیان اک اک سے بدگمانی کا
ستیاناس ہو جوانی کا

پوچھتی آئی ہے۔ یہاں تک گھر
ہاتھ رکھے کھڑی ہے کولے پر

اپنے سایہ سے بھی بھڑکتی ہے
بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے

شرم ہے آنکھ میں نہ دل میں خطر
پھبتیاں کہہ رہی ہے اک اک پر

گھڑی اک اک کا منہ چڑھاتی ہے
ہنسے دیتی ہے لوٹی جاتی ہے

چوٹی لپٹی ہے باسی ہاروں سے
لڑ رہی ہے جگت کہاروں سے

تصویر کشی کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:-

منہ دوپٹے سے ڈھانپتی اُتری
خوف کے مارے کانپتی اُتری

نیچی نظروں سے دیکھ بھال لیا
سر پہ آنچل الٹ کے ڈال لیا

سب حیا سے بدن چرائے ہوئے
پائنچے ناز سے اٹھائے ہوئے

چال اٹھکھیلیوں سے چلتی آئی
دل کو پاؤں کے نیچے ملتی آئی

گھنگھرو جوتی کے چھماتے تھے
تال میں تال اور ملاتے تھے

پانی پانی جو دل تھا سینے میں
جسم ڈوبا تھا سب پسینے میں

کچھ دکھائی رہی تھی کچھ لگاوٹ تھی
کچھ حقیقت تھی کچھ بناوٹ تھی

زہر عشق کا درس عبرت نظم اردو کا گوہر شب چراغ ہے:—

اقربا میرے ہو گئے آگاہ
تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں
بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں

وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں
جبر کیونکر یہ اختیار کریں

گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس
پر یہ کہنے کو آئی ہوں تمہارے پاس

جائے عبرت سرائے فانی ہے
مورد مرگ نوجوانی ہے

اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اس جا ہے آشیانۂ بوم

بات کل کی ہے نوجواں تھے جو
صاحب نوبت و نشاں تھے جو

آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی

جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم
ہوئے جا جا کے زیر خاک مقیم

اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہے

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج

عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے

گردش چرخ سے ہلاک ہوئے
استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے

تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے

ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ — نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے — باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے
صبح کو طائران خوش الحان — پڑھتے ہیں "کل من علیہا فان"
موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے
ہم بھی گر جان دیدیں کھا کر سم — تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو ہمجولیوں میں بہلانا — یا مری قبر پر چلے آنا
جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور — ہم جو مر جائیں تیری جان سے دور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی — ڈھونڈھنے کس طرف کو جائے گی
میرے مرنے کی جب خبر پانا — یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جمع ہو لیں سب اقربا جس دم — رکھنا اس وقت تم وہاں یہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم — ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
ہو گئے تم اگرچہ سودائی — دور پہونچے گی میری رسوائی
طعنہ زن ہوں گے سب غریب امیر — قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر
جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں — آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری میت پہ دھیان رکھیے گا — بند اپنی زبان رکھیے گا
اشک آنکھوں سے مت بہائیے گا — ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے — سب میں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے — تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
ہوتے آفت کے ہیں یہ پرکالے — تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

آ کے رو لینا میری قبر کے پاس — تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا — قبر میری گلے لگا لینا
اگر آ جائے کچھ طبیعت پر — پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا — پھول تربت پہ دو چڑھا جانا

دل پہ بجھ آنے دیجیو نہ ملال   خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال
رنج و راحت جہاں میں توام ہے   کبھی شادی ہے اور کبھی غم ہے
ہے کسی جا پہ جشن شام و پگاہ   ہے کسی جا صدائے نالہ و آہ
مرگ کا کس کو انتظار نہیں   زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو   آج دل کھول کر گلے مل لو
حشر تک پھر یہ ہوگی بات کہاں   ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں
ہم تو اُٹھتے ہیں اس مکان سے کل   اب تو جاتے ہیں اس مکان سے کل
یاد اتنی تمھیں دلاتے جائیں   پان کل کے لیے لگاتے جائیں
ہو چکا آج جو کہ تھا ہونا   کل بسائیں گے قبر کا کونا
چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن   اب کے بچھڑے ملیں گے حشر کے دن

نواب مرزا شوق کے داماد حکیم آغا حسن آزل نے ایک مثنوی سحرِ عشق نام زہرِ عشق کے طرز پر لکھی مگر سورج کو چراغ دکھانا بیکار تھا ایک شعر بھی زبان زدِ خلائق نہ ہوا اور مثنوی نایاب ہوگئی ۔

غدر کے بعد مسلسل نظموں کی طرف ملک کی توجہ بہت زیادہ ہوگئی اور بے شمار مثنویاں تصنیف کی گئیں۔ معزول شاہِ اودھ نے ٹیا برج کے مطبع سلطانی سے کئی مثنویاں شایع کیں مگر اُن میں شعریت بہت کم تھی،

مجاہد کو دولہا سے کیجیے بہم   تو ہو نام اس خوش لقب کا رقم
کروں گر مؤخر محمد سے شیر   تو ہو نام لینے میں ہرگز نہ دیر
الٰہا جو آباد ہے ایک نام   رہے آٹھ دن اسمیں اے خوش خرام

سید عبدالرزاق کلامی ساکن رائے بریلی نے فتوح الشام واقدی کا اور منشی طوطا رام شایاں نے مہابھارت کا ترجمہ شایع کیا مگر شاعری مثنویوں سے عنقا تھی، اس عہد کے اساتذہ میں سے امیر و داغ، محسن و منیر، تسلیم و شوق نے اس صنف کلام پر طبع آزمائی کی، امیر کی مثنویاں نور تجلی اور ابر کرم وغیرہ اخلاق و موعظت میں تھیں، صنمخانۂ عشق اور مرأۃ الغیب سے کچھ نسبت نہ رکھتی تھیں چند روز میں فراموش ہوگئیں ع یاد رہنے کے نہ قابل ہو تو کیا یاد رہے۔

داغ اور آفتاب داغ سے وہی نسبت تھی جو کریما کو بوستاں سے ہے، نہ قصہ میں دلچسپی تھی نہ بیاں میں اثر تاہم امیر کی

مثنویوں سے بہت زیادہ عُریانی

ساقیا میں اگر دعا مانگوں
تو بجز مے کے اور کیا مانگوں

ساتھ اس کے مری نگاہ گئی
جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی

کل جو امید تھی وہ آج نہیں
مرض موت کا علاج نہیں

جان جاتی ہے دل کے آنے سے
موت آتی ہے اس بہانے سے

پھول کلی نا گوار تھے اس کو
ہار پھولوں کے بار تھے اس کو

(سیہ فام عاشق کی تصویر سے مخاطب ہو کر)

تجھ سے رونق نہیں ہے گھر کے لئے
رکھ لیا ہے نظر گزر کے لئے

مداحِ رسولِ عربی حضرت محسن کاکوروی نے تین مثنویاں صبح تجلی، چراغ کعبہ، اور شفاعت و نجات نعت میں لکھیں اور اس خشک مضمون کو ابر گہر بار بنا دیا۔ مرزا بیدل سے بہتر معنی آفرینی ہے اور غنیمت سے بڑھ کر نقش طرازی۔ لیکن ان مثنویوں کی بلاغت پر تنقید اس مختصر تبصرہ میں ویسی ہی بے محل ہے جیسے امانت و سحر کے داسوختوں سے مرزا دبیر کے مرثیوں کا موازنہ ایک نا تمام ساقی نامہ کلیات محسن میں ہے جس کا رنگ اُن کے سب کلام سے جدا ہے۔ چند اشعار سنئے۔

زردی چھائی ہوئی رخساروں پر
سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر

یہ انگر کھے ترے گلکاری کے
جنگلی کلیوں میں چھپے ہیں کانٹے

کامدانی کا پہننا چھوڑا
لُٹ گیا تیرا سُہانا جوڑا

باتیں کرتے ہو تو رک جاتے ہو
آپ ہی چھیڑ کے شرماتے ہو

شہر کا سیر دکھانا چھوڑا
چاندنی چوک کا رستہ چھوڑا

ہوش میں آؤ بجھو دالے ہو
تم تو بے سے پیئے متوالے ہو

چاندنی پچھلے پہر کی کب تک
روشنی شمع سحر کی کب تک

جھوٹی کھاؤ نہ ہزاروں قسمیں
پھینک دو دل جو نہیں ہے بس میں

شیخ ناسخ کے شاگرد رشید سید اسمٰعیل حسین منیر نے "مثنوی حجاب زناں" لکھی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد کا ایک اخلاقی قصہ لڑکیوں کو تعلیم کا شوق دلانے کے لئے نظم کیا۔ شاعرانہ حیثیت سے اس کا درجہ خود شاعر کی زبان سے سنئے۔

حال جو کچھ سنا کیا موزوں — نہیں اس میں لطافت مضموں
اس میں اکثر نہیں ہیں وہ قیدیں — جو ہیں میرے قصیدے غزلوں میں
سیدھی سیدھی زبان ہے اس میں — سادہ سادہ بیان ہے اس میں

لکھنؤ مرحوم کی تصویر:۔

لکھنؤ کا جو شہر ہے مشہور — اب ہے ویران پہلے تھا معمور
کبھی اس شہر کا یہ تھا عالم — ڈھونڈھے ملتا نہ تھا کسی کو غم
سب وہاں تھے خوشی کے عالم میں — غم جو تھا بھی تو تھا محرم میں
شادی ارزاں تھی عیش سستا تھا — رات دن مینہ وہاں برستا تھا
ہاتھ خالی بھی جو وہاں آتے — لکھنؤ سے بھرے ہوئے جاتے
مٹ گئی سلطنت وہاں کی جب — اڑ گیا چین عیش سب کا سب
کھاتے تھے جو ہزاروں کو دیکر — پھرتے ہیں ٹکڑے مانگتے گھر گھر

گرمی کی تکلیف اور جنگل کی وحشت:۔

فصل گرمی کی اور وہ جنگل — دھوپ کے مارے ہو گیا بیکل
ہر طرف تھا غضب کا سناٹا — بن پڑا سائیں سائیں کرتا تھا
چلتی تھی لو زمین تپتی تھی — روح گھبراتی تھی تڑپتی تھی
دونوں تلووں میں پڑ گئے چھالے — کانٹے چبھتے تھے جس طرح بھالے
گرم لو تن کو بھونے دیتی تھی — بھاڑ کی طرح گرم رہتی تھی
کہیں اڑتا ہوا بگولہ تھا — کسی جانب بدار پھولا تھا
راہ کانٹوں نے ہر طرف گھیری — سوکھی سوکھی لگی تھی جھربیری
جھاڑ کانٹوں کے تھے ببول کہیں — کوئی پتا نہ بن میں پھول کہیں

ہجر کی مصیبت:۔

جب سے دولھا جدا ہوا اس کا — جینے سے دل خفا ہوا اس کا
کوئی کھانا اسے نہ بھاتا تھا — بات کرنا بھی خوش نہ آتا تھا

مِسّی مہندی بھی ترک کی اس نے　　کنگھی چوٹی بھی چھوڑ دی اس نے
ہنس کے بولے کسی سے کیا ممکن　　نہ بدلتی تھی کپڑے دس دس دن
رنگ چہرے کا زرد آنکھیں لال　　میلے کپڑے بکھرے سر کے بال

مثنوی میں زبان کی سادگی اور متانت بیان کے ساتھ درد و تاثیر بھی ہے، آخر کے دو چار شعر جو میلے ٹھیلوں میں جانیوالی عورتوں کی خدمت میں لکھے ہیں حذف کر دیے جائیں تو یہ نظم اس قابل ہے کہ لڑکیوں کے درس میں مقرر کی جائے اور زمانۂ حال کی روشن خیال خواتین اس نصیحت نامہ سے فائدہ اٹھائیں۔

منشی امیر اللہ تسلیم نے پہلی مثنوی واجد علی شاہی دور میں لکھی تھی۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد جہانداری کا ایک فرسودہ قصہ نظم کیا تھا اور اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا تھا۔ افسانہ پہلے سے مشہور تھا، انداز بیان میں ندرت نہ تھی، عیش و عشرت کے بندوں نے نالۂ تسلیم کی کچھ قدر نہ کی

عاشق کے بوڑھے باپ کی تعریف کرتے ہیں

ادب سے اس کو وقت خط کتابت　　خضر لکھتے سدا "حضرت سلامت"

معشوق کے سراپا میں فرماتے ہیں:۔

حنا کچھ پاؤں پر ایسی بسی ہے　　اسے جب دیکھو قدموں سے لگی ہے

مومن دہلوی سے بالواسطہ تعلق کا فیض ہے:۔

پریشانی اثر ہے نیم دماغی　　اجل تعبیر ہے خواب جوانی
کیا واماندگی نے دل کو بیتاب　　ہوا وقت سحر شرمندۂ خواب

دوسری مثنوی شام غریباں نام ۱۲۶۹ھ میں تصنیف کی اور ادب اردو کے دامن میں بلاغت کے موتی ٹانکے، قصہ دلچسپ تھا بیان میں شوخی نہ تھی۔ کلام کی پختگی کی کافی داد نہ ملی، عاشق عالم وحشت میں ایک درویش حق آگاہ سے ملاقی ہوا،

کہا اُس نے کہ تو آیا کہاں سے؟　　کہا "آبادیٔ ہندوستاں سے"
کہا "مقصود اس غربت سے کیا ہے"؟　　کہا "ترک تمنا مدعا ہے"
کہا "کافر ہے یا پابند اسلام"؟　　کہا "بے قید کو مذہب سے کیا کام"
کہا "کس شغل میں رہتا ہے سرشار"؟　　کہا "نفی عدو، اثبات دلدار"
کہا "کچھ تو مصیبت آشنا ہے"؟　　کہا "دل میں غم الفت بھرا ہے"

کہا "پھر کس لیے محنت سفر کی"؟ کہا "ہوں بُوئے گل، عادت سفر کی"
کہا "جائے گا آخر اب کہاں کو"؟ کہا "تقدیر لے جائے جہاں کو"

ناچ گانا ہوتا ہے:-

موافق ساز سے آواز ہو کر ہوئی پردے سے باہر راز ہو کر
وہ انگیزِ بدن انداز کے ساتھ وہ لینا منہ پہ آنچل ناز کے ساتھ

جنگل کا سماں:-

نہ سایہ تھا نہ برگ خشک و تر تھا برنگ شوخ آہو ہر شجر تھا
کفِ سائل کی صورت چشمۂ آب ہوائے گرم سے ہر مرغ بیتاب
حرارت سے دُھواں اُٹھا جگر میں تپش سے آبلہ پڑتا نظر میں
یہ عالم دیکھکر دشتِ بلا کا نظر میں پڑ گیا ساماں قضا کا

تیسری مثنوی صبح خنداں نوعمری میں دیکھی تھی، اب تلاش سے نہیں ملتی اور اس کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا، شام غریباں سے بہتر نہ تھی۔

سید مظفر علی خاں اسیر کے نامور شاگرد منشی احمد علی شوق نے ۱۳۰۵ھ میں اس دور کی بہترین عاشقانہ مثنوی لکھی، میر حسن کی مصوری نسیم کی نازک خیالی، نواب مرزا شوق کی خوش بیانی کو دلیل راہ بناکر خیالات و محاورات کا طلسم بنایا، قصۂ طلسم الفت سحر البیان اور دریائے عشق کا عطر مجموعہ تھا۔ دلچسپی میں اُن سے کم مگر تہذیب و سنجیدگی میں زیادہ نئی نئی تشبیہیں ایجاد کیں۔ محاورے خوش آیند اسلوب سے باندھے، بول چال کی صفائی اور بندش کی خوبی نے نظم میں چار چاند لگا دیے، گلزار نسیم کی بحر تھی اور اُسی کی سخن طرازی کی تقلید، اختصار کی کوشش کی مگر یہ سعی لاحاصل ثابت ہوئی، آورد و تصنع کا پردہ بُری طرح فاش ہوا اور بعض جگہ بے ضرورت طول ہو گیا، بے جان اشیاء میں جان ڈالنا اور اُن سے ہمکلام ہونا نسیم کا نیرنگ تھا۔ لیکن جو خیال حد سے بڑھا وہ مسا ہوا یہاں طوالت نے اس شعبدہ پردازی کی قلعی کھول دی، مثنوی درد سے خالی تھی۔ لبوں پر "واہ واہ" آئی مگر دل سے "آہ" نکلی پہلے تشبیہات کی بہار دیکھیے جو تمام دنیا میں شعر کی روح رواں سمجھی جاتی ہے۔

(منقبتِ اہلبیت) گویا قدِ مصطفےٰ شجر تھا اس میں کوئی گل کوئی ثمر تھا
(مناجات) ہر صفحہ کتاب کا فلک ہو نقطوں میں ستاروں کی چمک ہو
صفحے پہ ہو اُن کی ضو فشانی فرد ہی بوٹی کی کا مدانی

(سراپا)۔ پیشانی کی تعریف

کیا رنگ کہوں شگفتگی کا — اک پھول کھلا تھا چاندنی کا
گیسو تھے کہ دام تھے بلا کے — ابرو تھے کہ پیچے قضا کے
بے خود تھے شراب پینے والے — مستی میں الٹ دیے پیالے

گالوں پہ جو چھائی ہے اُداسی — دو پھول تو ہیں مگر ہیں باسی
چشمہ پر تو کسی جبیں کا — بنگلہ گھونگھٹ کسی حسیں کا
تھی بیل زمیں پہ جبال کھولے — کالی دبی تھی بال کھولے
ہلکی بہتا سی ایک تھی ناؤ — جھولا جھولو جو اس پہ چڑھ جاؤ
حیرت تھی کہ اوج کس قدر ہے — یہ بال کمانی یا کمر ہے
قد میں زیور کچھ اس قدر تھا — گھنگی کا پھیلا ہوا شجر تھا
دہانی کپڑوں میں تن کا یہ حال — مینا تو زمردیں تھا اور مے لال
تھے راہ میں جمع شہر والے — یا مانگ بھری تھی موتیوں سے
چوٹی پہ شجر کے دام رکھا — چھبکا کہنے کو نام رکھا
گلشن سے نکل سکا نہ اسطرح — گونگے کے دہن سے بات جسطرح

اب نازک خیالی دیکھیے جو انشائی شاعری کی جان ہے:۔

حیرت سے تھے اہل ہوش ششدر — بت خانہ تھا بادشاہ کا گھر
لائی قسمت فسوں کے بس میں — فیروزہ تھا خاتم قفس میں
سائے سے بدن کے دھوپ پھیلی — رخ صاف تھا آرسی تھی میلی
جو نخل تھا چپ کھڑا تھا ڈر سے — سایہ غش میں پڑا تھا ڈر سے
اختر نے حجاب کی نظر سے — در بند کیے ہوا کے ڈر سے
منظور اسے خود تھی پردہ داری — منھ پھیر کے آرسی اتاری
کہتی تھی حیا یہ ظلم ہے سخت — آتی جاتی ہے سانس کمبخت

یہ نیل اور یہ بدن کی زردی　　مینا سونے پہ لاجوردی

محاورات اور بول چال :-

تصویر کو دیکے زر خریدا　　سودا لیا دردِ سر خریدا
کیا بخت ہے اور کیا مقدر　　بجلی تو کہیں - جلے کہیں گھر

تصویر کی کون ایسی ہستی　　اللہ تم اور بت پرستی

مٹی نہ کر آبرو کو جانی　　اندھا ہے کنواں جو ہو نہ پانی

چلتی آندھی کا ٹوکنا کیا　　بہتے پانی کا روکنا کیا

بیمار کو جان کھوتے کیا دیر　　نیند آہی گئی تو سوتے کیا دیر

وہ جل گئی - دوڑی تاؤ کھاکر　　یہ ہنس پڑی بھاگی مُنھ چڑھاکر
بگڑی تو بنایا دل لگی سے　　روٹھی تو منا لیا ہنسی سے

کچھ کھیل نہیں ہے عشق کی لاگ　　پانی نہ سمجھ یہ آگ ہے آگ
چار اپنے پرائے کیا کہیں گے　　تھوکیں گے بُرا بھلا کہیں گے
چپ مرغ تھے خوف سے غضب کے　　طوطے سے اُڑے ہوئے تھے سب کے

کیسی ہے خطا معاف صورت　　دھویا کپڑا کہ صاف رنگت

چھائی تھی اُداسی سی صحن پر　　جھاڑو سی پھری تمام گھر پر

"تم" لکھتی ہوں میں بگڑ نہ جانا　　منظور ہے لطف کا جتانا

بولی کہ نہ دوں گی یوں زباں میں　　کھیلی نہیں کچی گولیاں میں

سوال جواب :-

پوچھا کہ "یہاں میں آیا کس طرح؟"　　بولی کہ "قرار دل میں جس طرح"
پوچھا "یہ ستم کیا ہے کس نے؟"　　بولی "تمھیں دل دیا ہے جس نے"
پوچھا "لشکر؟" کہا کہ "ہاں تھا"　　پوچھا کہ "ملیگا؟" کہا "نا"
بولا "یہ غضب!" تو بولی "خاموش"　　بولا کہ "پھر اب؟" تو کھولی آغوش
بولا کہ "نہیں" تو بولی "بیکار"　　بولا کہ "رہائی؟" بولی "دشوار"

بولا "کوئی پر غرور کیوں ہو؟"
بولی "کوئی ناصبور کیوں ہو؟"

بولا وہ "کسی کا دل ہو بے چین"
بولی "تو وہ ضبط کرکے بے چین"

بولا "جو ضبط نہ کر سکے وہ"
بولی "تو مرے جو مر سکے وہ"

بولا "تو ہو خون یوں کسی کا"
بولی "تو ہوا کرے مجھے کیا؟"

بولا "یہ ستم ترس کے بدلے!"
بولی "یہ کہو - ہوس کے بدلے"

بولا کہ "ہوس ہے اور ہی چیز
یہ عشق ہے عشق - قدر کی چیز

اتنا کوئی شکل پر نہ اِترائے
کس کی رہی اور کس کی رہ جائے

بولی کہ "چلو چلو ہوا ہو
میں نے تو نہیں کہا کہ چاہو

تم لاکھ چھپاؤ کھا کے قسمیں
پوشیدہ غرض تھی اس ترس میں

کیا تم مرتے ہو سچ بتاؤ
کیونکر مرتے ہو مر تو جاؤ"

مصوری :-

ہونٹوں پہ تھی اُف - جگر پہ تھا ہاتھ
تصویر یہ دل نگاہ کے ساتھ

صدمہ تھا - ملال تھا - قلق تھا
آنکھیں نیچی تھیں رنگ فق تھا

ہونٹوں پہ تھے دانت سر پہ تھے ہاتھ
سر سے جو ہٹے جگر پہ تھے ہاتھ

کانپا - سہما - ہٹا - ڈرا وہ
پھرنے کے لئے مُڑا ذرا وہ

بولا یہ جھجک کے ایں! یہ کیا ہے؟
بولی وہ تنک کے دل مرا ہے

سسکی لب پر شکن جبیں پر
آنچل منہ پر نظر زمیں پر

گردن نہ اُٹھا سکی وہ گلفام
احسان کا بوجھ شرم کا نام

(ہجر)

رنگت کہیں نام کو نہیں ہے
سادہ کاغذ ہے یا جبیں ہے

کوٹھے پہ کھڑی ہے تو کھڑی ہے
کونے میں دبکی ہے تو پڑی ہے

چوٹی جو کھُلی کھُلے بلا سے
بال اُڑتے ہیں تو اُڑیں ہوا سے

تارے گن گن کے رات کاٹی
کوئی بولا تو بات کاٹی

اختصار کی کوشش :-

لعل و زر و سیم سب منگایا — بانٹا، بخشا، دیا، لُٹایا
خسرو و شبیہہ و نامہ دینا — کہنا - سُننا - جواب لینا
آنکھیں جو کھلیں نصیب سویا — کانپا - سہما - غریب رویا
پوچھا جو مزاج کو کہا " خیر " — پوچھا سبب آنے کا کہا " سیر "
ٹھٹکی - جھجکی - زبان کھولی — بل ڈال کے تیوریوں پہ بولی
تسلیم جو کی - جواب پایا — غمدیدہ اُٹھی - ملی - بٹھایا
پوچھا کہ لقب ؟ - کہا " پریشان " — پوچھا کہ سبب ؟ کہا کہ " طوفان "
پوچھا مقصد ؟ کہا کہ " پانا " — پوچھا مطلب ؟ کہا " ملانا "
اپنے کے عوض کہی پرائی — اُلٹی گنگا غرض بہائی

واقعہ نگاری :-

گردوں نے بلائے شب جو ٹالی — چونکی طوطا پڑھانے والی
طوطا نہ ملا تو ہوگئی بھور — سمجھی وہ کرلے اُڑا کوئی چور
طوطا بھی گیا قفس بھی ٹوٹا — دل بھی دست ہوس بھی ٹوٹا
کالی آنکھیں ہوگئیں لال — انگارے ہوئے وہ پھول سے گال
چہرہ کُندن سا تمتمایا — الماس سے لعل کو دبایا
طائر کی مثال اُڑ گیا رنگ — جھنجھلائی کہ ہیں یہ کیا رنگ ؟
او سروِ چمن اودھر تو آ تو — طوطا مرا کیا ہوا بتا تو
او سوسن باغ تو بیاں کر — او چاندنی راز تو عیاں کر
بتلا تو شمیم تو کہاں تھی — سچ کہدے نسیم تو کہاں تھی
برگ گل لالہ تو ہی لب کھول — کیا تو گونگی ہے او کلی بول
طوطا صیاد نے اُڑایا — چڑیاں رہیں چپ اُڑیں خدایا
کیا باغ میں سو رہا تھا سویا — کلیاں ناداں ہی تھیں گریا

انگور تو مے پرست ٹھیرے　　کیا ان سے کہوں یہ مست ٹھیرے
آنے والی نسیم ہے بس　　جانے والی شمیم ہے بس
ہے لوث سے پاک انکا دامن　　پکڑے کوئی خاک انکا دامن

اقتباسات طویل ہو گئے اور مثنوی کے کل محاسن بیان نہ ہو سکے - آورد و تصنع کی مثالیں بکثرت ہیں - شاعر کہتا ہے :-

جتنی میرے سخن کی ہے دھوم　　سب ہے فیض اسیر مرحوم

اور رعایت لفظی کا گورکھ دھندا اس کشت سخن کی خاص پیداوار ہے - اس مثنوی سے بے لطف اشعار حذف کر کے مسلسل داستان بنائی جائے تو بیشک -

نکلے یہ زبان اہل فن سے　　لعل اُگلے ہیں شوق نے دہن سے

ترانۂ شوق کے بعد لکھنؤ اسکول کے طرز میں صرف ایک مثنوی اور لکھی گئی مگر افسوس کہ وہ ناتمام رہی - سید ولایت علی فردوس نے فسانۂ عجائب کا قصہ نظم کرنا شروع کیا تھا - اگر وہ اتمام کو پہونچتا اور شاعر کو نظر ثانی کا وقت ملتا تو ادب اُردو میں ایک گرانقدر اضافہ ہوتا - انداز بیان دکھانے کو چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

(۱) ماہ طلعت نے طوطے سے پوچھا اُس کی سی خوبصورت شکل " گزری ہے کہیں تری نظر سے "

طوطے کی ذات بے مروت　　بولا بگڑی بنا کے صورت
خوبی کیا اپنی پوچھتی ہو　　جیسا کہتی ہو ایسی ہی ہو

یہ جواب صاف سُنکر ماہ طلعت بہت جھنجھی - طوطے کو گالیاں دے رہی تھی کہ شہزادہ محل میں آگیا - دیکھا کہ بیگم طوطے سے لڑ رہی ہے اُسوقت کی تصویر یہ ہے :-

سرگرم جلال ہو رہی تھی　　فیروزے پہ لال ہو رہی تھی

(۲) ملکہ مہر نگار شہزادۂ مہمان کو اپنے پاس روکنا چاہتی ہے اور بہت گفتگو کے بعد اپنا حال زار بیان کرتی ہے :-

ہنسنا تو گیا خوشی کے ہمراہ　　رونا ہے بس اب یہی کہ ہر گاہ
پونچھیں اگر اشک غم بہیں گے　　دیکھیں گے جو لوگ کیا کہیں گے
ہنس ہنس کے مجھے رُلائینگے اور　　بگڑوں گی جو میں بنائیں گے اور
کب تک نہ یہ حال ہاں سنیں گے　　پائیں گی خبر تو سر دُھنیں گے
. . . .　　. . . . .

جب ہو گی اُنھیں حضوری شاہ | مانند قرآن زہرہ و ماہ
خلوت میں کہیں گے راز میرا | پردے میں کھُلیگا ساز میرا
جب سامنے اُن کے جاؤنگی میں | آئے گی حیا لجاؤں گی میں
لیکن تجھے کیا مری حیا سے | رُسوا ہو کوئی تری بلا سے
قربان وفائے قیس مفتوں | اپنی لیلیٰ کا تھا جو مجنوں
گو اُس کی دُلھن بنی خدیجہ | پر وصل کا ہجر تھا نتیجہ
اک جا ہوئے عروس و داماد | شادی نے کیا نہ غم سے آزاد

شہزادہ کہتا ہے کہ قیس کا جس رات کو عقد ہوا تھا ستاروں کی نظر بد تھی۔ "عقرب میں قمر تھا قوس میں تیر"۔ اس وجہ سے زوجین میں موافقت نہیں ہوئی۔ ملکہ بگڑ کر بولتی ہے:۔

سعدین کا عقد جب ہوا تھا | اور زائچہ وال طلب ہوا تھا
گوشندہٗ فرخی و شومی | سمجھی میں تمھیں تھے وہ نجومی!!

شاعر کی لااُبالی طبیعت یا زمانہ کی ناقدری سے مثنوی ناتمام رہی مگر اسی عہد میں مغربی تعلیم اور فرنگی تہذیب کے اثر سے چمنستان ادب کا رنگ بھی یکایک بدل گیا۔

اسلوب بیان کے "داخلی" اور "خارجی" پہلو دیکھے جانے لگے۔ "نفسیات" و "جمالیات" کی دھوم مچی۔ شعر کا موضوع بجائے تفریح طبع و تحریک جذبات کے فلسفہ و اخلاق کی تعلیم سمجھا گیا۔ نازک خیالی معنی آفرینی۔ سخن طرازی۔ بلند پروازی کا لغویات و ہزلیات میں شمار ہوا۔ پہلے خیال آفریں اور خلاق معانی ہونا شاعر کا کمال تھا۔ کیفیات اور تاثرات اشارات و کنایات میں ادا کرنا شعر کا حسن تھا تسلسل بیان۔ مصوری۔ اور کردار نگاری مثنوی کی خصوصیت تھی۔ اب اداشناسان فرنگ نے فتویٰ دیا کہ "مثنوی کے لئے سادگی لازمی ہے اور وہ تشبیہات۔ تمثیلات اور استعارات کا بار نہیں سنبھال سکتی"۔ یہ بالکل بجا اور درست ہے! ۔ اسی بوجھ سے یوسف زلیخا جامی دب گئی۔ سکندر نامہ نظامی کی صناعی مٹی میں ملی۔ نلدمن فیضی اور سب سے بڑھکر مثنوی غنیمت بے نشان ہوگئی۔ گلزار نسیم اور طلسم اُلفت خس و خاشاک کے انبار میں ہیں صرف میر اثر کی خواب و خیال تاریخ تصنیف سے اس وقت تک ہر لحظہ اور ہر ساعت عاشق مزاجوں کی گردن میں حمایل رہی اور یہ خوبصورت شعر زبان زد خلایق ہے:۔

دانت جب مجھ کو یاد آتے ہیں | دل کلیجا سبھی چباتے ہیں!!!

اس طرز جدید میں خواجہ الطاف حسین حالی۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ مرزا محمد ہادی رسوا۔ سرور جہان آبادی وغیرہ نے

چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں۔ پنجاب کے ایک شاعر نے کلام مجید کا ترجمہ نظم کیا۔ دوسرے بزرگ نے شاہنامۂ اسلام کی ترتیب شروع کی مگر ان نیچرل نظموں پر رائے زنی کا ابھی وقت نہیں ہے۔ آج سے پچاس ساٹھ سال کے بعد جو سخن کا کھرا کھوٹا پرکھنے والے ہوں گے وہ ان پر صحیح اور بے لوث تنقید کریں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ اُردو کی قدیم مثنویوں میں حیات جاوید صرف سحر البیان گلزار نسیم اور زہر عشق کو نصیب ہوئی، وہ بتائیں گے کہ ان طرز جدید کے "خوبند و خوشند و بوندارند" ولایتی پودھوں میں کوئی قطرۂ آب حیات کا تھا یا نہیں۔

کیا کہوں تجھسے میں اثر کرُ اُسے
کس طرح دیکھتا ہوں خواب کے بیچ

امیر احمد علوی (بی - اے کاکوروی)

لکھنؤ کا مشہور ترین شاعر (ناسخ)

(جسنے عمر بھر میں صرف گیارہ شعر کہے)

ہم ضعیفوں کو کہاں آمد و شد کی طاقت   آنکھ کی بند ہوا کوچۂ جاناں پیدا

سمجھے تھے بعد قضا پائینگے راحت ناسخ   حشر تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

گیا وہ چھوڑ کر رستے میں مجھکو   اب اس کا نقشِ پا ہے اور میں ہوں

گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج   ہم تو کہتے ہیں دُعا کرتے ہیں

اپنے کاموں میں رہو مشغول تم اے غافلو   اسکی باتوں پر نہ جاؤ ناسخ اک دیوانہ ہے

روز مرگ آرزو ہے تا بکے غم کیجئے   تا کجا دست دعا کو وقف ماتم کیجئے

تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو   ٹکڑے ہوتا ہے جگر ناسخ تری فریاد سے

خانۂ ویراں مجھے کہتا تھا ہر اک لے ناسخ   ابتو آباد ہوا خانۂ زنداں مجھسے

اُڑا کے ساتھ یہ مشتِ غبار لیتا جا   مجھے رکاب میں او شہسوار لیتا جا

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں   ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں۔

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی   عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

رنگ ناسخ کا منسوخ کرنے والا پہلا شاعر

(ضامن علی جلال لکھنوی سنہ ۱۲۵۰ھ — سنہ ۱۳۲۵ھ)

حشر میں کہتے پھرے ہم جلوہ اسکا دیکھ کر
حوصلہ یاں بھی نہ نکلا شوق خاطر خواہ کا

یاد رہ جائے گی فرقت کی یہ مجبوری بھی
دم نہ ہم توڑ سکے موت پہ قابو نہ ہوا

تغافل کے گلے سنکر جھکا لیں تم نے کیوں آنکھیں
مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بیباک ہونا تھا

آپ کو بھول گئے دیکھ کے اُس بُت کو جلالؔ
حق ادا ہو نہ سکا پھر بھی شناسائی کا

اگرچہ ایک بھی تسکین کا جواب نہ تھا
مگر کچھ آتے ہی قاصد کے اضطراب نہ تھا

کسے خبر جو ہوئیں مجھ میں یار میں باتیں
یہاں خطاب تھا کچھ وہاں جواب نہ تھا

کب آئے گا کوئی مجھ تک جواب دیتا جا
تسلیاں بھی تو اے اضطراب دیتا جا

مری داستانِ فراق نے شبِ وصل طرفہ مزا دیا
کہیں میں نے رو کے ہنسا دیا کہیں اُس نے ہنسکے رُلا دیا

نہ خوفِ آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا
بڑا کلیجہ ہے ان دل دُکھانے والوں کا

پہونچے نہ وہاں تک یہ دُعا مانگ رہا ہوں
قاصد کو اُدھر بھیج کے دھیان آئے ہیں کیا کیا

انھیں سے پوچھئے دیکھا ہو جو کچھ آنکھوں نے
ہمیں خبر نہیں کیا روزِ انتظار ہوا

ایذا وہ کوئے یار میں رہکر اُٹھائی ہے
اب ذکر سُن کے کانپتے ہیں ہم بہشت کا

عاشق کو جلالؔ آپ وہ فرما گئے ناشاد
اس پر بھی تو کمبخت کو شاداں نہیں دیکھا

دل سے تنگ آئے ہیں ہم جوش جنوں کا کیسا
یوں گریباں نہیں کیا پھاڑتے سودا کیسا

اپنا ہاتھ اپنی چھری اپنا گلا ہو اک دن
خنجر و بازوِ قاتل کا بھروسا کیسا

میں شوق دید میں کیا جانے کتنی دور آیا
کھلی کچھ آنکھ وہیں جب قریب طور آیا

تسلیاں جو وہ یونہیں دیا کریں گے جلالؔ
تو صبر پھر دلِ بیتاب کو ضرور آیا

یاد آگئیں کچھ اور جلالؔ اس کو جفائیں
بھولے سے بھی اظہار نہ کرنا تھا وفا کا

جستجو تیری دو عالم سے مجھے کھو دیگی
میں بھی تجھکو نہیں ملنے کا اگر تو نہ ملا

جہاں سُنا کوئی مجمع ہے اس کو ڈھونڈھ آئے
ذرا خیالِ پریشانیِ نظر نہ کیا

جلالؔ وصل سے ہم ہو چکے تھے نا اُمید
ستم کیا کہ پھر اُس نے امیدوار کیا

کیوں کسی کی جستجو کو دل گیا
کھوئے جانے کے سوا کیا مل گیا

ہائے قاتل نے ہمیں کو نہ کیا قتل جلالؔ
مجرم آخر وہی ٹھہرا جو گنہگار نہ تھا

دم بھر کو ترے وعظ میں ہم بیٹھ کے واعظ
برسوں نہ رہے بزمِ خرابات کے قابل

جلالؔ دل کی تڑپ یوں ہی دور ہو شاید
اُٹھائے دیتے ہیں لو اُن کو اپنے پاس سے ہم

جو دل نہ ہو گا ہوا اسکا مجھ کو غم بھی نہیں
سنا یہی ہے تری آرزو کہ ہم بھی نہیں

سیکڑوں بار اُنھیں پہنا دئے ہونگے ہم نے
کیا اگر قبر پہ دو پھول چڑھا جاتے ہیں

ہوش میں آؤ ذرا تم تو بھلا کیا ہو جلالؔ
اچھے اچھوں کو وہ دیوانہ بنا جاتے ہیں

کس کی محشر میں ہم کریں فریاد
داورِ حشر ہو تمھیں نہ کہیں

خوش نصیب اس سے زیادہ کوئی دنیا میں نہیں
پیار سے جس کو وہ کمبخت کہا کرتے ہیں

باز آئے کہ نہ آئے وہ جفاؤں سے جلالؔ
تم تو کر گزرو جو کچھ اہلِ وفا کرتے ہیں

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا راز
آنکھ کمبخت سے پہچان گئے، تم مجھ کو

کہدیں تم سے کون ہیں کیا ہیں کہاں ہیں ہم
بیخودوں کو اپنے جب تم ہوش میں آنے بھی دو

کر دے خبر اُس خانہ برانداز سے کوئی
روتا ہے کہیں درد کی آواز سے کوئی

چونکا رہا ہوں وصل کی شب چونکتے نہیں
کچھ نیند ہے شباب کی کچھ خواب ناز ہے

رگِ گلو ہے جگہ یار جاودانی کی
صدا قریب سے آتی ہے لن ترانی کی

دعوے کرتے تو ہو وفا کے جلالؔ
دیکھو وہ شوخ بے وفا نہ سُنے

تمھاری بزم میں ہم خود سنبھل جاتے یہ مشکل تھا
تمھیں بیتاب کرتے تھے تمھیں پھر تھام لیتے تھے

پھر ہم اُن کے روٹھ جانے پر فدا ہونے لگے
پھر ہمیں پیار آگیا جب وہ خفا ہونے لگے

شعراء دہلی پر لکھنؤ کا اثر

اور

ناسخ سے پہلے لکھنوی شاعری کا تصنع و ایہام

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ ناسخ و آتش کے زمانہ میں لکھنؤ "زبان کے" اعتبار سے دہلی کی تقلید سے آزاد ہوا۔ مجھے اس قول کی صحت میں تامل ہے۔ دہلی کے زوال پر لکھنؤ کا عروج ہوا۔ افلاس و پریشان حالی سے گھبرا کر دہلی کے شرفاء و اہل کمال پہلے فیض آباد پھر لکھنؤ میں امڈ آئے جہاں ایک نئی سلطنت کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ حکومت کے بانی اور اس کے متوسلین سب دہلوی تھے اور اسی کے ساتھ عالی ہمت و بلند حوصلہ اور علم و ہنر کے قدر دان و سرپرست انشا نے بالکل سچ لکھا ہے کہ لکھنؤ میں رہ کر بھی وہ دہلی کا خواب دیکھا کرتے تھے اور دہلی ہی کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ یہ حالت صرف ان لوگوں کی نہ تھی جو دہلی سے آئے تھے بلکہ ان کے بال بچے جن کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی وہ بھی اپنے تئیں دہلی سے منسوب کرتے تھے انشا کی عبارت یہ ہے۔

"ازینجا دریافت تواں کرد کہ با وصف تولد در لکھنؤ خود را دہلوی پندارند و سکنۂ قدیم را پوربی۔ دیگر اینکہ اگر کسے بپرسد کہ شما بذات خود در لکھنؤ بوجود آمدہ اید یا وطن شما ہمین است خشم آلودہ در و نگاہ کنند و گویند کہ خدا نکند کہ ما ستوطن اینجا باشیم"

(دریائے لطافت صفحہ ۹۶)

ایک تو دہلی کی محبت دوسرے فراغت اور اطمینان جو وطن آوارہ "اُس" اجڑے "نگر" سے آیا ہاتھوں ہاتھ لیا گیا فکر معاش سے آزاد ہوا اور راحت سے بسر کرنے لگا۔ اہل کمال کو آنکھوں پر جگہ دی جاتی تھی جو آپ سے نہ آئے بلائے گئے اور پھر جوش و خلوص کے ساتھ کہ سودا کو شجاع الدولہ "برادر من شفیق من" کا القاب لکھتے ہیں۔ اسی طرح آصف الدولہ کو میر کا اشتیاق تھا اور سالار جنگ کی معرفت پیام و زاد راہ بھجوایا۔

دہلی ویران تھی اور لکھنؤ آباد۔ اردو کا مرکز ثقل بھی دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ ادبی مجلسیں قائم ہوئیں۔ علوم و فنون کا بازار

گرم ہوا، خریداروں کو جوہر قابل کی تلاش رہتی تھی اور سیر چشمی و فراخدلی سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ حریفوں میں چشمکیں ہونے لگیں معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ علمی بحثیں چھڑیں۔ ہر شخص کو یہی دھن تھی کہ دوسروں کو نیچا دکھا کر اپنا سکہ جمائے اور نام پیدا کرے۔ اس جد و جہد و دوڑ دھوپ میں زبان منجھتی گئی مگر شاعری جس کا تعلق دل سے ہے اور ایسے ہنگاموں سے گھبراتی ہے کھلونا بن کے رہ گئی۔ ان دلچسپ مشاغل میں دہلی کی یاد بتدریج کم ہوتی گئی۔ لکھنؤ کی خاک نے اپنا اثر دکھلایا اور دامن دل کھینچا۔ اب لکھنؤ کو صرف وطن ہی نہیں سمجھا بلکہ دہلی سے جذبۂ رقابت مشتعل ہوا۔ ابداع و اختراع کا عمل جاری تھا۔ زبان میں تراش خراش ہوتی رہی، امنگ کے ساتھ اجتہاد کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ پیش رووں کی فصاحت و صحت گفتار پر ایراد ہونے لگے۔ اگر ایک طرف یہ اعتراف تھا کہ میر و سودا و میر درد نے گلستان ریختہ کو خس و خار سے پاک کیا اور برج، پوربی، اتیم سے عامیانہ و ناقابل پیوند الفاظ کو ترک کیا تو آنکھ مار کر یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ یہ اور بات ہے جو ان حضرات نے (سے) کے بجائے (ستی) یا (ستیں) اور (مجھ دل) بجائے (میرے دل) کے جائز رکھا،،

انقلاب کی تحریک پوری قوت سے کار فرما تھی اور علوم و فنون و تمدن و معاشرت سبھی کا جائزہ لے رہی تھی دہلی مٹ چکی تھی مگر ایسے شکستہ در و دیوار اب تک اپنی گذشتہ عظمت کا اعلان کر رہے تھے۔ گلی کوچوں میں خاک اڑتی تھی مگر پھر بھی لکھنؤ کی نئی تہذیب کو اگر کوئی مد مقابل نظر آتا تھا تو جہان آباد کے کھنڈروں میں۔ لہذا اسی پر تفوق حاصل کرنے کا شوق غالب ہوا اور ہر بات میں اسی کے علی الرغم ایک نئی صورت اختیار کی۔

دہلی میں نیچی چولی کا انگرکھا پہنا جاتا تھا۔ یہاں چولی اونچی ہو گئی اور ایک نہیں تین تین کرتیاں اضافہ کی گئیں۔ کمانیوں کا ذکر نہیں۔ وہاں صرف مغزی ہوتی تھی۔ یہاں سنجاف نے حسن دوبالا کیا "کمر چیں" ایجاد ہوئی۔ مندیل کی جگہ نکے دار ٹوپی نے لی اور چست مہری کا پاجامہ غرارے دار ہو گیا۔ سلیم شاہی جوتا گھیتلا بن گیا۔ ملائی بالائی، اندھیری اندھیارا ہو گئی اور نہ معلوم کیا سے کیا ہو گیا۔

انتہا یہ ہے کہ دلی کے شیدائی میر تقی میر علیہ الرحمہ جن کا کلام درد و خستگی و سوز و گداز کی جان ہے لکھنؤ میں ایک عرصے قیام کے بعد ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ایسے شعر بھی اُن کے قلم سے نکلنے لگے ؎

لو اُن دنوں ہم سے ایک رات جائی — کہاں ہم، کہاں تم، کہاں پھر جدائی
بسنتی قبا پر تری مر گیا ہے — کفن میر کو دیجیو زعفرانی

(از دیوان پنجم)

جرأت دہلوی تھے مگر لکھنؤ کی رنگ رلیوں اور گلچھرّوں نے کلام کو سوقیت کا عبرت ناک نمونہ بنا دیا۔ انشا پھکڑ

لڑنے لگے۔ مصحفی سے منقطع بھی خم ٹھوک کر اکھاڑے میں اتر آئے۔ جتنے تھے وہ ایک دوسرے کو ہجو نگاری اور فحاشی میں پچھاڑنا چاہتے تھے غزل گوئی کا یہ حال تھا کہ ایک حمام میں سب ننگے ——— انشا جلائے ہے

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں　　ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

جرأت نے ہاتھ مل مل کے نعرہ مارا ؎

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا　　چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

مصحفی ہونٹ چبا چبا کے گنگناتے ہیں ؎

انگڑائی لے کے اپنا مجھ پر خمار ڈالا　　کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا

اس ہنگامہ بدتمیزی کی لے بڑھتی گئی ناسخ اور آتش کے زمانے تک پورا شباب تھا ایک دن لکھنؤ کو دہلی پر رشک آتا تھا اب لکھنؤ دہلی کا محسود ہو گیا اور عبرتناک ہے یہ امر کہ اہل دہلی ناسخ کا کلمہ پڑھنے لگے۔ مومن خاں اعتراف کرتے ہیں کہ ناسخ کے رنگ میں غزل کہنا چاہی مگر ممکن نہ ہوا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جن کی سخن سنجی و سخن فہمی مسلم تھی آتش اور ناسخ کا موازنہ کرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ "مردم آں دیار آتش و ناسخ را کہ از اساتذۂ مسلم آنجا است، قریب ہم انگارند و ہر دو را ہموزن شمارند و قباحت ایں تحقیق لایخفیٰ علیٰ من لہ حظ من الفہم و مع ذلک۔ ذرکوئی طبعش سخن نیست" فاعتبروا یا اولی الابصار!

پھر ناسخ کی تعریف میں دریا بہا دیتے ہیں۔

"نسیم چمن طبعش نکہت ریز، شمیم گل فکرش دلاویز، طائر بلند پرواز غورش جز بشاخ سدرہ آشیاں نساز د، و مرغ تیز بال خیالش جز بہ بام فلک جلوہ نیندازد، والا مایہ، عالی پایہ، بلند اندیشہ نازک خیال است و در تلاش مضمون تازہ و معنی سیراب بے مثل و بے مثال .... یک دو سہ شعر از غزلہائے جدیدہ ہم کہ بعض احباز لکھنؤ ارمغاں کردہ بودند نگارش یافتہ"

انتخاب میں یہ شعر بھی ہے ؎

ہم نے جو تجھ بنائی ہے ترے موبان کی　　نافۂ مشکیں بنا ہے منھ ہر اک ناسور کا

جس کے بعد کچھ لکھنے میں کلیجے میں ناسور پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ غرضکہ آوے کا آوا بگڑا ہوا تھا۔ مومن کے دیوان سے سینکڑوں شعر پیش کئے جا سکتے ہیں جس سے مغفور کا یہ فرمانا محض انکسار رہ جاتا ہے کہ ناسخ کا تتبع نہیں کر سکے۔ کیا اور بہت کامیابی سے کیا۔ ذوق و شاہ نصیر کو تو دہلی کا ناسخ ہی کہنا چاہیے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میر، سودا اور درد کے بعد لوگوں نے شاعری کو یا تو ہوس کاری کا آلہ بنالیا یا زمین آسمان کے قلابے ملانے کا مشغلہ۔ بہت کم شاعر ایسے تھے جن کا شعر دماغ کے بجائے دل سے نکلے اور اس میں دہلی یا لکھنؤ کی تخصیص نہیں تھی۔ زبان کو صیقل ضرور ہوئی مگر تخئیل کا آئینہ گرد آلود ہو گیا۔

علاوہ بریں مجھے حسن اتفاق سے ایک ایسے شاعر کا کلام دستیاب ہو گیا ہے جو ناسخ اور آتش کا پیشرو تھا جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ و آتش کی شاعری اسی کا نقش ثانی ہے اور یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے کہ اہل لکھنؤ نے (قطع نظر اس سے کہ ابتدا میں ان کا وطن دہلی تھا یا لکھنؤ یا اور کوئی مقام) (ناسخ و آتش سے بہت پیشتر انفرادیت برتنا شروع کر دی تھی اور شاعری کی ایک جداگانہ شاہراہ نکالی تھی جس میں جذبات کی تڑپ کے بجائے شکوہ و بلند آہنگی زیادہ تھی اور صداقت کی جگہ تصنع نے لے لی تھی۔ یہ شاعر قاضی محمد صادق خاں اختر ہیں۔ ان کے حالات لالہ سری رام مرحوم کے تذکرۂ خمخانۂ جاوید میں تفصیل سے درج ہیں اور اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں۔

یہ اختر وہی ہیں جن کا یہ قطعہ ہے

کل شیخ بن کے مجتہد العصر ساقیا — دکھلا کے باغ سبز عذاب و ثواب کا
کہنے لگا ز راہ تبختر کہ بے حیا — معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا (تا اختتام)

زبان زد خاص و عام ہے۔

اختر۔ ملک الشعرا قاضی مولوی محمد صادق خاں صاحب ولد قاضی محمد لعل ہوگلی بنگالہ کے قاضی زادوں میں تھے مگر وطن چھوڑ کر لکھنؤ آ رہے تھے۔ جامع الکمالات شخص اور لکھنؤ کے مشاہیر شعرائے وقت میں شمار کئے جاتے تھے۔ مرزا قتیل کے شاگرد اور تحصیلداری کے عہدے پر مامور تھے .... طبیعت کی شوخی، کلام کی بلندی، اور حسن تشبیہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ غازی الدین حیدر والی لکھنؤ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا چونکہ ان کی عمر کا بہت بڑا حصہ لکھنؤ میں گذرا اس وجہ سے شعرائے لکھنؤ انھیں بکمال فخر اپنا ہم صفیر و ہم وطن بیان کرتے ہیں اور درحقیقت وہ اپنی قیام گاہ کے واسطے مایۂ افتخار و نازش تھے انھیں اکثر فنون میں مثلاً شعبدہ بازی میں کمال حاصل تھا۔ تبحر علمی کے علاوہ فن سخن و دقائق شعر میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ بندش مضمون، نازک خیالی، نادر الکلامی اور خوش گوئی میں لاجواب تھے۔ مصحفی، انشا اور جرات کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ آتش، ناسخ، وزیر اور صبا کے زمانہ تک زندہ رہے ...... بعد غدر ۱۸۵۸ء لکھنؤ میں وفات پائی۔ ان کا کلام عنقا کا حکم رکھتا ہے۔ بہرحال جس قدر مختلف تذکروں میں نظر سے گذرا اسی کا انتخاب درج تذکرہ کیا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کی طبعزاد کتابیں حصار مطبع کی زیر حفاظت نہ آنے پائیں اس سے کمیاب بلکہ نایاب

ہیں مگر چند غزلوں خصوصاً اس غزل (قطعہ) نے جسے ہم منتخب کلام کے شروع میں نقل کرتے ہیں فرط شہرت سے بقائے دوام کی سند حاصل کر لی ہے۔ نواب غازی الدین حیدر کی نظر عنایت نے فکر معاش سے فارغ البال کر کے عمائدین کے درجے تک پہونچا دیا تھا مگر وضع مولویانہ رہی، طالب علموں کا ساتھ نہ چھوڑا........ (از تذکرۂ خمخانۂ جاوید)

رائے بہادر مسٹر رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو سے ہماری معلومات میں اتنا اضافہ اور ہوتا ہے کہ اختر ۱۸۱۴ء میں لکھنؤ پہونچے۔ واجد علی شاہ نے بھی ان کی قدر کی پھر کسی بات پر ناراض ہو گئے اور اختر کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔

اختر کے دیوان میں جو میرے پاس ہے یہ مقطع ہے ؎

کہدے اختر کوئی اب شاہ زمن سے اتنا
نہیں لائق ہے تمھیں دعویٰ سرداری و خواب

عجب نہیں کہ اسی کی بدولت عتاب شاہی نازل ہوا ہو۔

اختر کے کردار میں یہ مقطع ہیرے کی طرح چمک رہا ہے ایک خود مختار مطلق العنان بادشاہ کو اس دھڑتے سے نصیحت کرنا مستحق ہزار ستائش و آفریں ہے۔

صاحب قاموس المشاہیر نے سال ولادت بر بنائے قیاس ۱۸۰۶ء یا ۱۸۰۸ء لکھا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا اس طرح ان کی مدت حیات اکاون سال ہوتی ہے کیونکہ سال وفات متفقہ طور پر ۱۸۵۹ء ہے۔ یہ امر بھی مسلم ہے کہ اختر کو غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ ان کا سنہ جلوس ۱۸۱۴ء ہے جس سے ۱۸۵۹ء تک ۴۵ برس ہوتے ہیں۔ گویا اختر سات برس کے تھے جب ملک الشعراء کا خطاب ملا! علاوہ بریں تذکرۂ آب حیات میں ہے کہ اختر اُن لوگوں میں تھے جنھوں نے ناسخ کے ابتدائے دور شاعری میں اس کا دل بڑھایا اور قدر دانی کی۔ اپنے زمانے کے زبردست عالم اور محقق تھے اور علمی و ادبی تنازعات میں منحصر علیہ قرار پاتے تھے۔ ان سب امور سے گمان ہوتا ہے کہ ناسخ سے عمر میں بڑے تھے۔ ناسخ کا انتقال ۱۸۳۸ء میں بعمر ۶۵ سال ہوا۔ ۱۸۱۴ء یا اس کے قریب جب اختر کو ملک الشعراء کا خطاب ملا ناسخ کی عمر ۴۱ سال ہوتی ہے۔ غالباً اس وقت اختر کی عمر بھی چالیس پچاس برس کی ہوگی۔ آدمی کی شہرت ایک دم سے نہیں ہوتی نہ اوائل عمر میں ملک الشعرا کا خطاب ملتا ہے۔ اس طرح ان کی عمر ۸۰ یا ۹۰ برس ہوتی ہے جو غیر معمولی نہیں۔

ان سب باتوں کو جانے دیجئے خود اختر کا کلام بتلاتا ہے کہ ناسخ و آتش کے دور کے پیشتر کا ہے کیونکہ انکے یہاں وہ الفاظ بکثرت ملتے ہیں جن کو ان لوگوں نے متروک کر دیا تھا۔ مثلاً نت، جاہے ہے، وغیرہ معشوق کے لئے پیارے کا لفظ آپ ناسخ یا آتش کے یہاں نہیں پائیں گے اختر نے قدما کیطرح بہت آزادی سے استعمال کیا ہے

طلب کرتا ہے دل سینے میں سو دل ہے کہاں پیارے
یہاں تو مدتوں سے ہے پڑا سونا مکاں اپنا

اسی طرح جاوے ہے ؎

اٹھ جاوے ہے غم دل سے، تو در ماں بسے ہے
صد شکر کہ یہ گھر کبھی ویراں نہیں رہتا

سمجھ کر کی جگہ محض سمجھ ؎

ہم عدم سے آئے تھے دنیا کو عشرت گہ سمجھ
تا نکلے جاتے جو دیکھے جی دہل کر رہ گیا

لفظ میاں بمعنی معشوق ؎

کیا کیا تھے میاں عہد ہمارے ترے باہم
وہ عہد کہاں اُس ترے پیماں کو ہوا کیا

جھمکی بمعنی جھلک ؎

جھمکی سی کچھ دکھا کے وہ خورشید رو مرا
پلکوں کو میری نور کا فوارہ کر گیا

نت بمعنی ہمیشہ ؎

نت رہی رخ پہ ترے ایک نظر کی امید
بر نہ آئی کبھی اس دیدۂ تر کی امید

مت بمعنی نہیں ؎

کر رحم اے تصور مژگان یار بس
نوک سناں سے مت دل زخم آشنا کو چھیڑ

اپنے کے بجائے اپنے کے ؎

ہمشکل جو داغ اپنے کے پائے پر طاؤس
دیکھے جہاں چھاتی سے لگائے پر طاؤس

مشق تپیدن ؎

کی مشق تپیدن جو زبس اس نے چمن میں
ہے نکہت گل، گرد پر افشانی بلبل

پوچھتا ہے کی جگہ پوچھے ہے ؎

زخم کیا پوچھے ہے تو تیر نگہ کا ظالم
دیکھ لے سینۂ غربال نما رکھتے ہیں

بتوں یا بتو کی جگہ بتاں ؎

کب تلک جور و جفا تم کو نہیں خوف ذرا
اے ستم پیشہ بتاں ہم بھی خدا رکھتے ہیں

جیوں بمعنی مثل ؎

عشق میں اس کے گھلا ایسا کہ جیوں روغن نفت
آتش و آب میں اب دیکھئے یکساں ہوں میں

زینت مذکر ہے

سبزہ طرف چمن ہو زیب گلشن جس طرح
خط نے یوں زینت دیا اس ماہ کے رخسار کو

جان مذکر ہے

ساتھ ہی جان نکل جائے گا تن سے میرے
کھینچو تیر کو سینے سے میاں آہستہ

مرقد مونث ہے

دامن کشاں جو گزرا تو اس طرف سے قاتل
ہے حشر یاس برپا مرقد پہ کشتگاں کی

مطلع یہ ہے

کیا خاک ہم کریں سیر اس گلشن جہاں کی
یاں برگ برگ گل سے آتی ہے بو خزاں کی

بھر نظر بجائے نظر بھر کے

مہوشوں کی بزم میں ہیں شب کا عالم کیا کہوں
بھر نظر چہرے کو اس کے جس نے دیکھا دنگ تھا

اختر کا کلام لکھنوی رنگ کا بہترین نمونہ ہے، بناوٹ ہے مگر لطف کے ساتھ۔ زبان کا چٹخارا ہے مگر سوقیت سے کوسوں دور خیال میں رفعت ہے۔ اسلوب بیان میں تازگی و دلکشی ہے شکوہ الفاظ و جزالت بھی ہے۔ دلچسپ تشبیہیں اور استعارے بھی ہیں درد سوز و گداز بھی ہے مگر کم۔ اور یہی خصوصیات ناسخ و آتش کے منتخب کلام کی ہیں، خرافات سے مطلب نہیں۔

چند شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں

فصل گل سن کے گئے سیر چمن کو لیکن
حیف واں زنگ خزاں قفلِ درِ گلشن تھا

زنگ خزاں کو قفل در گلشن کہنا کس قدر بدیع ہے۔

اسی طرح سایۂ جسم کو رہزن کہنا

منزل پر خطر عشق کا کیا حال کہوں
سایۂ جسم بھی واں اپنے لئے رہزن تھا

اور سنئے

شب جو پہلو میں نگار آتشیں رخسارہ تھا
داغ دل وقف گداز گرمی نظارہ تھا

یا

ہے بھرا دل میں جو اختر مہر آتش طلعتاں
سینہ اپنا مشرق نور محبت ہو گیا

مراعات النظیر کی دھن میں لبر (محبت) کو مذکر نظم کر گئے۔ یہی خبط بڑھتے بڑھتے انکے بعد کے شاعروں میں جنون کی حد تک پہونچ گیا

آپ کو اتنے ہی شعروں سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ زبان آہستہ آہستہ اپنا چولا بدل رہی تھی اور ناسخ و آتش سے بہت پیشتر سادگی و صدق جذبات کو چھوڑ کر تکلف و تصنع و مبالغہ و بلند پروازی کی طرف جا رہی تھی۔ مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کا جنون بھی اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ اختر کے یہاں اس کی بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ دراصل اس کے پردے میں وہی اُپج اور ایجاد کا ولولہ کہ انفرادیت کا ثبوت دیں کارفرما ہے۔ جذبات نگاری سے لوگ قطعاً بے نیاز ہو گئے تھے اور یہی دھن تھی کہ کوئی نئی بات کہیں خواہ کیسی ہی مضحک اور بعید از ہوش و خرد ہو۔ وہ بھول گئے تھے کہ راستی کو انوکھے پن سے بیان کر دینے میں جو تاثیر اور لذت ہے وہ جھوٹ کے پل باندھنے میں ہرگز نہیں۔

بات یہ ہے کہ جذبات و محسوسات کی مصوری کے لئے درد مند دل درکار ہے وہاں فارغ البالی و عیش پرستی نے بوالہوسی کے سوا کچھ چھوڑا ہی نہیں تھا۔ ہمیں اب تک صرف آتش کا علم تھا جو قریب قریب تارک الدنیا تھا اور بے حد غیور و قانع۔ یہی کردار بڑی حد تک اس کے کلام سے جھلکتا ہے اسی پایہ کے اختر بھی تھے جیسا کہ ان کے مقطع سے پتہ چلتا ہے اور اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ عیش پرست واجد علی شاہ کو نصیحت کرنے میں دریغ نہیں ہوا فطری رُجحان لوگوں کو شاعری کی طرف مائل کرتا تھا مگر کیریکٹر کے زیر اثر حقیقت سے دور ہو جاتے تھے کیونکہ متین و سنجیدہ جذبات و خیالات کی جگہ عریانی و ابتذال نے لے لی تھی اور شاعری عیاشی کی مترادف ہو گئی تھی۔ انحطاط بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ پورا مظاہرہ ناسخ آتش اور ان کے تلامذہ کے عہد میں ہوا۔

اختر نے اپنے عہد کے بعض شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں آتش یا ناسخ کا نام نہیں ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ غزلیں اس زمانے کی ہیں جب ان لوگوں کی شہرت نہیں ہوئی تھی۔ ان کے معاصرین میں کوئی فضل تھے جن کا مصرع اس طرح تضمین کیا ہے ؎

اختر تو سن لے فضل سے اب وصف موئے یار　　　خون ہزار بوسہ بدل جوش زن رہا

اس مصرعۂ فضل نیز اختر کے متعدد اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ "طرز بیدل" میں ریختہ کہنے والے غالب سے پہلے بھی تھے کوئی نور و فضل تھے۔ مقطع میں ان سے دوستانہ شکایت کرتے ہیں ؎

نور و فضل نے ہماری یاد دی دل سے بھلا　　　تھی جدائی سے مگر ان کو فراموشی غرض

ایک مقطع سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے شاگرد بہت سے تھے جن میں مدہوش کا درجہ ممتاز تھا ؎

گرچہ اختر اپنے سب شاگرد ہیں اہل سخن　　　پر جسے ممتاز کہئے سب میں وہ مدہوش ہے

تفاخر شاعرانہ سے بھی بعض اوقات شاعر کے کلام پر روشنی پڑتی ہے اور مفید و دلچسپ معلومات کا اضافہ ہوتا ہے

ایک مقطع میں اپنے وطن بنگالہ کی طرف پرلطف اشارہ کرتے ہیں

غنیمت جانئے اختر کو اے یاراں بنگالہ
یہ اپنے وقت کا ہندوستاں میں فخر رازی ہے

خاک لکھنؤ کی دامنگیری کا انھیں بھی اعتراف ہے ؎

چاہتے ہیں جائیں بنگالے کو ہم دامن فشاں
پر کریں کیا لکھنؤ کی خاک دامن گیر ہے

ایک مقطع میں فرماتے ہیں ؎

میں وہ شیریں سخن ہوں ہند و بنگالے میں اے اختر
کہ طوطی مجھ سے پڑھتا نسخۂ شکر مقالی ہے

علمیت کے اظہار میں ثقیل و نامانوس الفاظ اور ترکیبیں لانے میں ناسخ بدنام ہیں مگر اس بدعت یا بداعت کا سہرا بھی اختر کے سر ہے ملاحظہ ہو ؎

تڑپ اے ماہیِ دل اپنا بے کھٹکے جو ہے اس میں
ہوا کیا حلقۂ کاکل اسے تالاب آسائش

(زمین ہے۔ سیماب آسائش، باب آسائش)

ایضاً ؎

اختر خیال خال رخ یار کے سبب
فسحت سرائے دل ہے مرا لالہ زار فیض

ایضاً ؎

رخ پر تیرے دیکھی تھی کبھی زلف مجعد
ہے رد کش سنبل مرا دود جگر اب تک

ایضاً ؎

ملے کسی کو اگر نسخۂ حسنذا لقرار
تو اس جہاں میں وہ اختر سا کیمیاگر ہو

ایک اور بات ہے جو اختر کو ناسخ و آتش سے پہلے کا شاعر ثابت کرتی ہے ان کی بیشتر غزلیں سات یا نو شعر کی ہوتی ہیں۔ شاذ ایسی ہیں جن میں ۱۵ یا ۱۶ شعر ہیں۔ حالانکہ ناسخ و آتش کی غزلیں شیطان کی آنت ہوتی ہیں

(مرزا جعفر علی خان) اثر لکھنوی

بہاری اسکول کی اُردو شاعری اور اسکی تخلیق کے اسباب

بہار کی علمی و ادبی تاریخ اس قدر تاریکی میں ہے، کہ عام طلبہ کے لیے اس پر مبصرانہ نظر ڈالنا حیطۂ امکان سے باہر ہے زمانہ کی ناقدریاں ایک طرف، خود یہاں کے اہل کمال میں شہرت طلبی کی خو پیدا نہوئی نتیجہ وہی ہوا جو آج ہمارے پیش نظر ہے دہلی و لکھنؤ کے اکابر رجال کی تصنیفات و تذکرے پڑھ جائیے، آپ کو مشکل سے چند بہاری شعراء و ادبا کے حالات ملیں گے۔ وہ بھی اس قدر ایجاز و اختصار کے ساتھ کہ ان کا وجود و عدم برابر ہے۔

تالیفات متداولہ میں بہاریوں کی غیر موجودگی نے دوسرے صوبوں میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دیں اور اب مشکل سے بہار سے باہر یہاں کے اساتذہ کی سیادت علم و ادب تسلیم کی جاتی ہے، اکثر مشاہیر بہار بھی تذکروں اور تاریخوں میں دہلوی یا غیر بہاری مشہور رہیں حالانکہ ان کی علمی زندگی یہیں پروان چڑھی، مثال کے لئے مرزا عبدالقادر بیدل کو لیجئے، تمام تذکرہ نگار مرزا سرخوش، میر تقی، میر حسن ان کے بدیعہ شعری اور جلالت علمی کے قایل ہیں لیکن کوئی یہ نہیں لکھتا، کہ یہ بہار کے رہنے والے تھے، بلکہ سرخوش تو ان کو شاہجہان آبادی بتاتے ہیں۔

اس وقت نہ تو اس کا موقعہ ہے، کہ تفصیل و اطناب کے ساتھ بہار کی تاریخ ادب مدون کی جائے اور نہ اتنی فرصت ہے کہ عنوان کے لحاظ سے بہار میں اردو کی ترقی کے تمام ادوار پر کوئی بسیط نظر ڈالی جائے، اسلئے مختصراً ان ابتدائی مرحلوں کا تذکرہ کیا جائے گا جو ایک محقق کے لئے اس وادی خار زار میں بدرقۂ راہ کا کام دے۔

سب سے پہلے ضروری ہے کہ مختصراً علم و ادب کے ان مخفی وفائن کا تذکرہ کیا جائے جن پر ایک نظر ڈالے بغیر بہار کے شاہد علم و ادب کے صحیح خط و خال نمایاں نہیں کئے جا سکتے، اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل نظرئے قابل غور ہیں۔

صوفیہ۔ چھٹی اور ساتویں ہی صدی ہجری سے یہاں مختلف صوفی خانوادوں کی خانقاہیں موجود ہیں مدالزاں اور منیر میں بڑے بڑے صوفی علما عرب و عجم سے ہجرت کر کے آئے، یہ اولیائے کرام جب یہاں آباد ہوئے تو جین مذہب، بودھ مت اور برہمنیت کا زور تھا، بالخصوص جین اور بدھ مذہب کی خانقاہوں نے سارے صوبہ کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا

چنانچہ مشہور چینی سیاح ہین سنگ نے یہیں "سیل بھدر" کی خانقاہ میں پندرہ ماہ تک قیام کرکے "یوگ شاستر" کی تکمیل کی، کوہ برابر، گوواڈول، گرولا پربت، لوماس آشرم، روہن نالا، رشیاسرنگ آشرم، مندار گیری، کنڈگام (مولد مہاویر جی) سمید ھ سکر، (جینی تری تھنکروں کے "موکش" کا مشہور مقام واقع ضلع ہزاری باغ) وکرم سیلا دہار، وغیرہ جو اب جینی اور بدھ مذہب کے آثار قدیمہ میں ہیں اسوقت فروغ پرتھے اور سنیاسی اور تارک الدنیا فقرا ان میں ذکر و شغل کرتے تھے۔ جنیوں کی مذہبی کتابیں عموماً مگدھی، سنسکرت، پراکرت، کنھڑی اور تامل میں پائی جاتی ہیں۔ اسیطرح بودھ مذہب کی کتابیں پالی اور سنسکرت میں ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ بہار میں مگدھی زبان کے اندر سنسکرت، پراکرت، کنھڑی اور تامل کے عناصر شامل تھے، جس طرح عربی زبان پر بابلی و آرامی، عبری و حبشی زبانوں کا اثر پڑتا ہے، اور بہاری مذہبی ادبیات سے اس کا ثبوت ملتا ہے اسی طرح جینیوں اور بودھوں کے مذہبی اذکار و وظایف نے بہار میں مگدھی زبان کے اندر سنسکرت، کنھڑی، تامل اور پالی وغیرہ زبانوں کا اثر ڈال رکھا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ پہلے پہل جب صوفیہ یہاں بغرض تبلیغ و ارشاد تشریف لائے تو انھوں نے اسی مخلوط مگدھی زبان میں وعظ و پند شروع کیا، اور یہیں سے مقامی زبان پر عربی و فارسی کا بھی اثر پڑا۔ بہار کے صوفی خانوادوں کے حالات ابھی دنیا کی نظروں سے محجوب ہیں خود اہل بہار بھی اپنے بزرگوں کے حالات سے نابلد ہیں، آج کتنے بہاری ہیں جو حضرت مولنا جمال الدین قدس سرہٗ اور حضرت شیخ شہاب الدین جگجوتؒ (جو پھلی میں آسودہ ہیں) کے حالات زندگی سے واقف ہیں، اسی طرح یہاں کے صوفی ادب کا بڑا خزانہ یا تو غیر مطبوعہ ہے، یا امتداد زمانہ نے اس کو تلف کردیا پھر بھی حضرت شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیری قدس سرہ کی تصنیفات اور منیر، پھلواری اور بہار کے بعض صوفیہ و محدثین کے علمی کارنامے محفوظ ہیں، حضرت شرف منیری رحمۃ اللہ سلسلۂ فردوسیہ کے بزرگ تھے، لیکن آپ نے شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردیؒ (سلسلۂ سہروردیہ کے بانی) کی مشہور کتاب آداب المریدین کی جو فارسی شرح لکھی ہے، وہ تصوفی ادب کا ایک شاہکار ہے، مولنا سید کمال علی صاحب (معاصر شیخ علی حزیں) نے مولنا محمود شبستری کی کتاب "گلشن راز" کی شرح لکھی، مولنا عبدالغفار پھلواری نے ادب المفرد بخاری کا اردو میں ترجمہ کیا، کیفیت العارفین اور کنز الانساب مولفہ مولنا سید عطا حسین منعمی، اور الدر المنثور مصنفہ مولنا عبدالرحیم صادق پوری کو بھی اس سلسلہ میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا صوفیہ کی خدمات رشد و ہدایت نے ہماری زبان پر گہرا اثر ڈالا، "کنز الانساب" اور "الدر المنثور" سے پتہ چلتا ہے کہ بہار کے صوفی علماء عرب و عجم سے آئے، یقیناً ان کے ساتھ مذہبی اور ادبی کتابوں کا ذخیرہ بھی ہوگا۔ انکی زبان عربی رہی ہو یا فارسی لیکن انکی تصنیفات عموماً فارسی میں ہیں، باہمی میل جول اور ارتباط و تعلقات نے ایک نئی زبان

پیدا کر دی، اور یہ زبان دہلی اور لکھنؤ کی زبانوں سے یقیناً مختلف تھی، اس لئے آج بھی بہار کے دور دراز دیہاتوں میں مسلمانوں کے معززا ور تعلیم یافتہ خاندانوں میں بھی ایسی اردو بولی جاتی ہے جو لکھنؤ اور دہلی کے روزمرہ کی بول چال سے مختلف ہے، اور یہ اثر ہے اسی مخلوط گنگرہی زبان کا جو ان کے آباؤ اجداد باوجود علم وفضل تبلیغ وارشاد کی غرض سے بولتے آئے۔ اس سلسلہ میں اتنا اور عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس وقت جتنے بڑے بڑے صوفیہ و بزرگان دین تشریف لائے انھوں نے مقامی زبان میں زیادہ تر عربی زبان کے عناصر شامل کئے حضرت تاج فقیہہ کیؒ کے ورود بہار سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

ایرانی شعراء اور فارسی ادبیات

افاغنۂ دہلی کے عہد میں بھی بہار میں ہمیشہ ایک عامل آیا گیا۔ اور اس کے ساتھ فارسی زبان کی بھی ترویج ہوتی رہی۔ ضیاء برنی، فیروز شاہی، فرشتہ، اور روضۃ الصفا کے صفحات کا جائزہ لیا جائے۔ تو پتہ چلے گا، کہ افغانی عامل نے یہاں اپنے عہد حکومت کے کتنے نقوش چھوڑے ہیں۔ افاغنۂ دہلی کے زوال کے بعد جب مغلوں کی حکومت قائم ہوئی۔ تو ایرانی ذوق کے مختلف اصناف کی تقلید شروع ہوئی۔ چمن وحدیقہ کی آرائشیں، نقوش ونگارش کی دلآویزیاں۔ خطاطی ومصوری، ادب وشعر، سارے شعبے ایرانی مذاق کا پتہ دیتے ہیں۔ متقدمین صوفیہ کی کتابیں فارسی میں تو پہلے ہی سے موجود تھیں اب ایرانی شعراء کی آمد شروع ہوئی "صبح صادق" کے اوراق میں آپ کو کافی تعداد ان ایرانی شعرا کی ملے گی جو عظیم آباد میں آئے اور یہاں فارسی شاعری کا ایک ایسا بلند ذوق پیدا کر دیا کہ دہلی کے سوا اس کی نظیر کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ "صبح صادق" کا مصنف مرزا محمد صادق بن محمد صالح اصفہانی ۱۱۹۱ھ سے ۱۲۰۳ھ تک پٹنہ میں مقیم رہا۔ مصنف نے تبریز، لاہجان، یزد، گیلان وغیرہ کے بہت سے شعراء کا تذکرہ کیا ہے، جو عظیم آباد کو رشک ایران بنائے ہوئے تھے مثلاً مولنا نادم گیلانی، حکیم عارف لاہجی مولانا امعزالدین یزدی مولنا محمد حسین تبریزی وغیرہ۔ یہ انھیں شعراء کے قدوم کی برکت کا نتیجہ ہے کہ شاہ ابوالحسن فرد، شاہ علی حبیب نصر، مولنا محمد سعید حسرت، شاہ الفت حسین فریاد جیسے بلند پایہ فارسی شعراء کے علاوہ صرف پھلواری میں فارسی زبان کے تقریباً پچاس صاحب دیوان شعراء گزرے ہیں، ایرانی شعراء کی آمد کا سلسلہ "صبح صادق" کے مصنف ہی تک ختم نہیں ہو گیا۔ بلکہ سید شاہ الفت حسین فریاد (متوفی ۱۲۹۰ھ) کے زمانہ تک سید محمد اشرف کا مقبرہ (واقع عظیم آباد) ایرانیوں کا ماویٰ وملجا تھا، اور یہیں طالب ملاطوقی، اور حاجی ملا بابا جیسے اساتذۂ ایران مشاعرہ میں شریک ہوا کئے۔ شیخ علی حزیں بھی راجہ شتاب رائے عظیم آبادی کے یہاں ٹھہرے، خان آرزو نے "مجمع النفائس" میں اس پر تعریض بھی صرف کی ہے۔

صوفی مہاجرین اور ایرانی شعراء نے صرف بہار ہی میں زبان پر اثر نہیں ڈالا، بلکہ سارے ہندوستان پر یہی اثر

تاثر تھا، پنجاب واودھ، دکن وبنگالہ ہر جگہ انھیں عناصر کے اختلاط نے مقامی زبان میں ایک تغیر پیدا کر دیا دہلی میں اکبر اعظم اور عبدالرحیم خانخاناں کی ادبی سرپرستی اور بارش کرم نے بے شمار ایرانی شعرا کا ایک وسیع حلقہ بنا لیا تھا۔ دکن میں سلاطین بہمنیہ، عادلشاہیہ، قطب شاہیہ اور نظام شاہیہ نے بہت سے ایرانی شعرا کی سرپرستی کی، بعض دکنی سلاطین خود بھی بلند پایہ شاعر گزرے ہیں۔ مثلاً فیروز شاہ عروجی، یوسف عادل شاہ، یوسف، اسمٰعیل عادل شاہ وفائی وغیرہ، وفائی اپنی شاعرانہ متانت ولطافت اور شگفتہ بیانی کے لئے تمام دکنی بادشاہوں میں ممتاز ہے۔ فرشتہ نے ان تمام سلاطین کا کلام درج کیا ہے۔ سلاطین کے اسی ادبی ذوق نے دکن کو رشک ایران وتوران بنا دیا چنانچہ عہد بہمنیہ میں ملک الشعرا شیخ آذری اسفرائنی۔ ملا عبدالکریم ہمدانی۔ ملا سامعی وغیرہ نظر آتے ہیں خواجہ حافظ اور مولنا جامی کو ایران میں دعوت نامہ جاتا ہے۔ اسی طرح عہد عادل شاہی میں مولنا ملک قمی۔ ظہوری ترشیزی۔ رضائی مشہدی، اور دور نظام شاہی میں ملک قمی اور ظہوری کے علاوہ میرزا صادق کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح آدان قطب شاہی میں میر محمد مومن استرآبادی، نے جو محمد قلی قطب شاہ کے درباری شاعر وندیم خاص تھے، دکن کو نوازا، ان کے علاوہ مولنا اشرف ماژندرانی، میر معز فطرت، مولنا نظیری، نیشاپوری، تقی اوحدی نے بھی دکن میں قیام کیا اور یہاں کے باشندوں کو اپنے افکار عالیہ سے اثر پذیر کیا۔ دکن کی اردو شاعری پر ان ایرانی شعرا کا اثر پڑا جس طرح اہل بہار کے روزمرہ کی زبان میں مگدھی زبان کا اثر پایا جاتا ہے، لیکن فرق یہ ہے، کہ بہار کا ادبی خزینہ مقامی زبان کے ثقل وضغطہ سے زیادہ تر پاک رہا، اور دکن میں مقامی زبانوں۔ تامل، کنھڑی، تلنگی وغیرہ نے ادب دانشا پر بھی اثر ڈالا، دکن میں ریختہ کے کثیر التعداد شعرا گذرے ہیں اور یقیناً انھوں نے ایرانی شعرا سے استفادہ کیا پھر بھی نقلی، سید حمزہ، فراقی، فخری، لطفی، غوثی حیدر آبادی، صبائی احمد آبادی، سعدی دکھنی، سراج اورنگ آبادی نقیر اللہ آزاد، ولی وغیرہ کے کلام کا جائزہ لیا جائے، تو ان میں مقامی بول چال کا کافی اثر پایا جاتا ہے، برخلاف اس کے بہار کے قدیم شعرا، سید عماد، غلام نقشبند سجاد، مرزا بیدل، محمد روشن جوشش، جذب، انتظار، فغاں وغیرہ کے کلام میں زیادہ صفائی اور فصاحت پائی جاتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کیا بہار کا ادبی خزینہ دہلی ولکھنؤ سے مستغنی ہے؟ دہلی کے متعلق تو ذیل میں تفصیل کیساتھ عرض کیا جائیگا، لیکن لکھنؤ کے باب میں تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ بہار کی قدیم اردو شاعری پر اسکا اثر پڑا، ہاں عہد متاخرین میں ناسخ اسکول کی شاعری نے شیخ امان علی سحر، رشک، وزیر، اور برق کی وساطت سے بہار پر اثر ڈالا، چنانچہ شیخ علی حسن جویا عظیم آبادی (صاحب دیوان) رشک کے شاگرد تھے، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نے سحر سے، اور مولنا شاہ رشید حسین کامل، دربھنگوی، اور سید احمد حسین ہما نے خواجہ وزیر سے اصلاحیں لیں

مولنا ظہیر احسن شوقؔ نیموی (متوفی ۱۳۲۲ھ) اور ہمارے عہد میں مکرم حضرت تمنا پھلواروی مدظلہ' اور مولنا حکیم ضمیر الحق قیسؔ آروی (جن کا دیوان طبع ہو رہا ہے) اسی اسکول کے پیرو ہیں، میر انیس اور مرزا دبیر بھی آئے اور اپنے مراثی سے عظیم آباد کی مجالس ذکر کو رشک اودھ بنا دیا اور اپنے تلامذہ بھی چھوڑے، حضرت امیر مینائی نے بھی قدم رنجہ فرمایا لیکن یہ سب آخر عہد کی باتیں ہیں بہار میں تو میرؔ سے بہت پہلے اردو شاعری کا رواج ہو چکا تھا اور مختلف تذکروں اور تاریخوں میں اس عہد کا کلام مذکور ہے

آب آیئے اس اہم مسئلہ پر غور کریں کہ کیا بہار کی اردو شاعری دہلی اسکول کی پیرو ہے؟ اس میں شک نہیں کہ دہلی اور عظیم آباد کے درمیاں ربط و اختلاط بہت قدیمی ہے۔ لیکن اگر یہی دہلی اسکول کے تفوق کا سبب ہو سکتا ہے تو پھر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ خود دہلی اسکول پر بہار نے بھی اثر ڈالا، مذاہب فلسفہ میں اسکندریہ کے یہودی اسکول اور فلسفہ اشراقی میں جو مماثلت پائی جاتی ہے، اہل نظر جانتے ہیں فلسفہ کا ایک طالب العلم حیران رہ جاتا ہے، جب وہ فلسفہ اشراقی کے مشہور قاید فلاطینوس اور اسکندریہ کے یہودی فلسفہ کے علمبردار فیلو کے نظریات میں یگانگت پاتا ہے ایک عرصہ تک یہ موضوع محل نظر تھا کہ انہیں کون مقدم کون موخر ہے اور کسنے کس پر اثر ڈالا، ولیت کا فخر فلسفہ اشراقی کو ہے یا یہودی فلسفہ کو، یہ تو ظاہر ہے کہ یہودیوں کو مشرکین یونان سے تنفر تھا اور یونانی علما بھی ان کو حقارت ہی کی نظر سے دیکھتے تھے، پھر فلاطینوس، اور فیلو کی یہ ہم نوائی کیسی؟ آخر کار یہ تسلیم کرنا پڑا، کہ انہیں باہمی اثر و تاثر نہیں ہے بلکہ دونوں نے ایک ہی ماحول میں ایک ہی قسم کے اثرات کے ماتحت آزادانہ ترقی کی، میرا خیال بھی دہلی اسکول اور بہاری اسکول کے متعلق یہی ہے، ہرگز بہاری اسکول دہلی اسکول کے تتبع کا نتیجہ نہیں۔ ہاں شعرائے دہلی سے یہاں کے بعض اکابر رجال نے اصلاحیں لیں مثلاً میر حسن کے استاد میر ضیا دہلی سے عظیم آباد چلے آئے۔ اور یہیں راجہ شتاب رائے کے لڑکے کے یہاں وظیفہ یاب ہوئے جس کا خود میر حسن نے تذکرہ کیا ہے اسی طرح علامہ سید کمال علی صاحب عظیم آبادی کے دونوں صاحبزادوں اشکی و جمالؔ نے خواجہ میر دردؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا (ملاحظہ ہو حیات فریاد صفحہ ۱۵۷) لیکن اس کو کیا کیجئے خود میر تقی میر جعفر عظیم آبادی کے شاگرد تھے، غالب نے بیدل کا کلام سامنے رکھ کر مشق سخن کی "نسخہ حمیدیہ" میں غالب کے بیسوں اشعار بیدل کے ساتھ ارادت و نیاز کیشی میں پائے جاتے ہیں مرزا بیدل (متوفی ۱۱۳۳ھ) اور غلام نقشبند سجاد (متوفی ۱۱۲۷ھ) کے اردو اشعار دہلی اسکول کے کس شاعر کے تتبع کا نتیجہ ہیں نکات الشعرا میر تقی، تذکرہ میر حسن، مخزن نکات قایم چاندپوری میں بیدل کے صرف دو شعر پائے جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

سید صفیر بلگرامی نے بھی تذکرہ "جلوۂ خضر" میں بیدل کا ایک اردو شعر لکھا ہے۔

بیدل کا بقیہ اردو کلام یا تو ضایع ہو گیا یا کہیں گمنامی میں پڑا ہے۔ سید خواجہ عماد الدین عماد (۱۰۶۵ھ - ۱۱۲۴ھ) اور سید غلام نقشبند سجاد (۱۱۱۶ھ - ۱۱۷۳ھ) کا کلام پھلواری میں حضرت مکرم مولنا تمنا مدظلہ کے پاس محفوظ ہے۔ "معارف" پھلواری (بابت صفر ۱۳۳۲ھ) میں حضرت تمنا مدظلہ کے قلم سے غلام نقشبند سجاد کی زندگی پر ایک بسیط مقالہ شایع ہو چکا ہے۔ خواجہ عماد کا کلام ملاحظہ ہو۔

جب بیچ چمن کے فصل بہاری آوے ہے
تب جوش جنوں تلوا میرا کھجلائے ہے

بیچ نظر کے ایدھر اودھر ہر دم آئے جاوے ہے
بل بے ظالم تس پر بھی ٹک دیکھے کو ترسائے ہے

جب سی چھوڑیس کھانا پینا تیر ادوانہ الفت میں
خوں جگر کا پیوے ہے۔ اور غم غصہ کو کھاوے ہے

آئے اپنے ہاتھ وہ مورکھ نہیں عماد اب اسکی آس
اسکے کارن کون جتن ہم کیا جو نہیں آوے ہے

تذکرہ نگاروں کی کثرت رائے کے مطابق غلام نقشبند سجاد میر تقی سے پہلے پیدا ہوئے۔ آپ کے کلام میں ایک ایسا سوز و درد ہے کہ پڑھنے کے بعد ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بھٹی کو چلا گیا ہوتے سحر پوچھو تو کوئی سجاد ستی
تھارات تلک تو کام اس کو اشغال ستی اور اد ستی

ٹک میری طرف سے باد صبا کہتی جا کر صیاد ستی
اب جاں لبوں پر بلبل کے پہونچی تیری بیداد ستی

تنہائی فرقت میں اپنا کیا کیا نہ یہ دل گھبراوے ہے
بہلے ہے جو یہ ٹک نا شدنی تو صرف تمھاری یاد ستی

جب آگ دھندہکتی ہو اس پر مت چھینٹو تیل خدارا تم
کیا دل کی خوشی کو پوچھو ہو یارو تم اک ناشاد ستی

اے باد سحر اے موج صبا لے جلد ہماری آکے خبر
نکلا ہے ہمارا کام سدا تیری ہی فقط امداد ستی

سن پایا ہے اس نے دل میرا کعبہ ہے یہ گھر اللہ کا ہے
اب کھود کے اس کو پھینکوائے وہ بت نہ کہیں بنیاد ستی

جو دیکھ کے ہم کو ہاتھ ملے پچھتاوے اور افسوس کرے
بتلاؤ کوئی شکوہ کریں کیا ایسے ستم ایجاد ستی

ٹھانا تو بہت اب جاوینگے ہرگز نہ کسو کے کوچہ میں
ہر بار مگر مجبور رہے ہم اپنے دل ناشاد ستی

توڑا ہے وہ کب کا تقوی کو بھٹی میں تو اسکی گزرے ہے
سجادہ و مسجد کی بابت مت پوچھو اب سجاد ستی

اب آئیے اس مسئلہ پر غور کریں کہ بہاری اسکول پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک محقق کو کن مراحل سے گزرنا ہوگا ہر چند یہ مسئلہ شرح و بسط کا طالب ہے۔ لیکن مختصراً ان ماخذ کا تذکرہ کیا جائے گا جن کو پیش نظر رکھنے کے

بعد کوئی صحیح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے شعرائے ریختہ کے متعلق تو عموماً فضلائے دہلی، اودھ اور دکن کے تذکرے نظر آتے ہیں ان میں نکات الشعرا۔ میر تقی، مخزن نکات قائم چاندپوری، تذکرہ میر حسن، چمنستان شعرا شفیق، تذکرہ مصحفی، آب حیات آزاد گلشن بیخار شیفتہ زیادہ مشہور ہیں افسوس ہے بہار کے اردو فارسی شعرا کی طرح بہاری تذکرہ نگاروں کو بھی زمانہ نے فراموش کر دیا حالانکہ محمد روشن جوشش (معاصر میر حسن) عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل مولف "گلزار ابراہیمی" ناظر وزیر علی عبرتی (متوفی ۱۲۹۹ھ) مولف تذکرہ "معراج الخیال" سید علی محمد شاد۔ مولف "حیات فریاد"، نواب سید امداد امام اثر مولف تذکرہ "کاشف الحقایق"، تمام حضرات بہار کے بہت ہی بلند پایہ تذکرہ نگار گزرے ہیں لیکن ان میں چند حضرات تو مجمل طور پر ادبی دنیا میں روشناس ہیں بقیہ گمنامی میں ہیں، بہار میں فارسی شعرا کے بھی بعض مستند تذکرے پائے جاتے ہیں مثلاً نواب آغا علی خاں مولف تذکرہ "نشتر عشق" کا وطن بہار ہی تھا "سفینۂ خوشگو" کے مصنف بندرابن داس نے یہیں عظیم آباد میں وفات کی، دونوں تذکروں کے مخطوطات، پٹنہ اورینٹل لائبریری میں موجود ہیں) تذکرہ نگاروں کے علاوہ نواب غلام حسین خاں مولف "سیر المتاخرین" بھی یہیں کے رہنے والے تھے، مصنف نے اس کے ایک حصہ میں بہار کے صوفیہ وغیرہ کا حال لکھا ہے۔ ابراہیم خاں خلیل نے گلزار ابراہیمی کے علاوہ فارسی شعرا کا بھی ایک تذکرہ لکھا تھا جو بہت ہی مشہور ہے۔ اس کا نام "صحف ابراہیم" ہے اس کتاب کا ایک مخطوطہ پٹنہ لائبریری میں ہے۔ جوشش کا تذکرہ ناپید ہے اس کے متعلق صرف تذکرہ میر حسن سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ میر حسن جب اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے، تو عظیم آباد میں جوشش بھی اپنا تذکرہ تالیف کر رہے تھے۔ عبرتی راجہ پیارے لعل الفتی کے شاگرد تھے، الفتی کے خاندان میں میر حسن کے خاندان کی طرح نسلاً بعد نسل شاعری کا رواج رہا چنانچہ انکے لڑکے کنور بہیر لعل ضمیر اور پوتے کنور سکھراج بہادر رحمتی بھی بلند پایہ شاعر گزرے ہیں۔ ضمیر تو زبان عربی کے بہت بڑے ادیب تھے، ایکدفعہ اعداد و ہندسہ کے متعلق علامہ سید غلام حسین مشہور ریاضی داں سے اور ضمیر سے عربی زباں میں خوب مباحثے ہوئے، کنور سکھراج بہادر رحمتی نے چند بار عظیم بالشان مشاعرے کئے چنانچہ صفیر بلگرامی (ساکن آرہ) نے بھی تذکرہ "جلوۂ خضر" (جلد ۲) میں ایک مشاعرہ کا تذکرہ کیا ہے جسمیں وہ خود ۱۲۹۶ھ میں مدعو تھے۔ اور گلدستہ موسوم بہ "تحفہ انجمن رحمتی" میں انکی غزل بھی چھپی تھی۔ عبرتی مرحوم نے دو تذکرے لکھے ایک معراج الخیال، دوسرا ریاض الافکار، معدل الذکر میں شعرا کا تذکرہ ہے ثانی الذکر میں نثر نگاروں سے بحث کی ہے۔ لیکن ضمناً شعرا کا بھی تذکرہ آگیا ہے۔ صفیر بلگرامی .... بہت بڑے محقق زبان، اور مختلف فنون ادبیہ کے ماہر تھے۔ ان کی ایک تالیف "جلوۂ خضر" بہت مشہور ہے۔ یہ بڑی محنت و کاوش، تحقیق و استقرا کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ اس کی دو جلدیں ہیں ایک دہلی اسکول کی شاعری اور اس کے اساتذہ و متبعین کے متعلق ہے

دوسری جلد میں لکھنوی شاعری بالخصوص ناسخ و آتش کے اسکولوں کا فرق و امتیاز دکھایا گیا ہے، ناسخ کی حسن کاری و ایجادات پر مکمل بحث کی گئی ہے، یہ بحث اس قدر فاضلانہ و محققانہ ہے، کہ شاید ہی اتنا بڑا ذخیرہ معلومات کہیں اور جگہ دستیاب ہو سکے آج ہر عامی بھی غریب ناسخ کی شاعری پر علی الرغم طبع آزمائیاں کیا کرتا ہے، جہاں تک شاعرانہ شگفتگی و برجستگی، احساسات و تاثرات کا تعلق ہے، یقیناً ناسخ کی شاعری میرے لئے بھی کوئی دلچسپی نہیں رکھتی، بہاری شعرا میں میر ضیا، شیخ راسخ، عطا بہاری اور غیر بہاریوں میں میر و درد، میر حسن و قائم، سودا و غالب کا کلام مجھے زیادہ محبوب ہے، عہد حاضر میں جہاں تک انفرادی پسند کا تعلق ہے، اصغر گونڈوی کے شاعرانہ افکار میرے لئے حد درجہ دلاویز ہوتے ہیں لیکن پھر بھی میں ناسخ کو زبان اردو کا بہت بڑا افادہ و مصلح خیال کرتا ہوں، جن نقاد نگاہوں نے بصیرت و تعمق کے ساتھ ناسخ کی لسانی خدمات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے - کہ اردو کو اس منزل ترقی پر پہونچانے میں ناسخ اور آپ کے تلامذہ نے بڑی جگر کاویاں کی ہیں میرا خیال ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا، جبکہ لسانیات کے محققین ناسخ کی خدمات زبان پر فلسفیانہ روشنی ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ ناسخ اسکول کا مطالعہ کئے بغیر اردو کی صحیح تاریخ مرتب کرنا احاطۂ امکان سے باہر ہے جہاں تک جذبات کی برانگیختگی، پیام اور اثر آفرینی کا تعلق ہے، ناسخ اسکول نے کوئی اہم خدمت انجام نہیں دی. لیکن زبان کا خط و خال کچھ اس طرح درست کیا کہ اردو شاہد رعنا بن گئی۔

اب چند الفاظ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے، کہ بہار میں اردو شاعری کے کتنے اسکول ہیں؟ بہار کے باکمال شعرا کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ ہے، اور جو کچھ طبع ہو چکا ہے، وہ بہت مختصر ہے، پھر بھی شعرائے بہار کے افکار عالیہ کا جتنا حصہ ہمارے احاطہ معلومات کے اندر ہے، ان کی بنا پر ہم بعض قیاسی نتائج مرتب کر سکتے ہیں ہر چند ابھی تحقیق و استقرار کا میدان وسیع ہے اور امتداد زمانہ ہماری بہت سی قیاس آرائیوں میں تبدیلیاں پیدا کرے گا۔

(۱) دہلی اور دکن میں فارسی شاعری کا شباب ہے، عہد جہانگیر سے لے کر دور عالمگیری تک تمام اکابر رجال فارسی میں شعر کہتے ہیں، دور جہانگیری کے شعرا ابو طالب کلیم، ملا سرابی، ملا شیدا، طالب آملی، حکیم رکنائے کاشی، عہد شاہجہانی کے مرزا رضی دانش، محمد قلی سلیم، سالک یزدی، صائب تبریزی، میر صیدی، قدسی مشہدی، عصر عالمگیری کے محمد سعید اعجاز ملا سعید اشرف، محمد زماں راسخ، ناصر علی، علی، محمد علی ماہر، مرزا سرخوش، موسوی خاں فطرت وغیرہ نے ۱۰۱۴ھ سے ۱۱۱۸ھ تک نہ صرف دہلی بلکہ سارے ہندوستان میں فارسی ہی کا ذوق پیدا کر رکھا تھا لیکن شعرائے عالمگیری کے دور میں ایک ایسا بہاری شاعر تھا جس کی حسیات لطیف، وجدانات شعری، الہامات صوفیانہ، اور کشف حقایق نے اس کو ردی کے دوش بدوش لا کھڑا کیا بلکہ آج ہندوستان کے بے مثل نقاد ادب، حضرت مولانا نیاز فتحپوری مدظلہ

تو اس کو تمام شعرائے ایران سے ممتاز بناتے ہیں یہ مرزا عبدالقادر بیدل کی ذات ہے، اس میں شک نہیں بیدل کے معاصر مرزا مظہر فطرت کے فارسی اور مخلوط اشعار نکات الشعراء اور تذکرہ میر حسن میں پائے جاتے ہیں لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو بیدل کے اردو اشعار پڑھیے پھر بہاری اردو کی فوقیت کا اندازہ لگائیے، فطرت کہتے ہیں۔

از زلف سیاہ تو بہ دل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

بیدل کہتا ہے۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے جسم میں

بیدل کے اردو اشعار میں بھی اس کی وہی شاعرانہ قادر الکلامی اور رفعت فکری کارفرما ہے جو اس کے فارسی کلام میں ہے اور جس نے اس کو تمام فارسی شعرا میں ممتاز بنا دیا ہے، زبان کی صفائی صاف بتا رہی ہے، کہ بیدل نے اردو میں بھی اس سے پہلے بہت کچھ کہا ہوگا۔ شاید زمانہ نے اس کو برباد کر ڈالا، یا پھر کہیں "تبرکات خاندانی" میں ہو، بہر حال دور عالمگیری کے اس بہاری شاعر نے اپنی ندرت افکار کے بہت کچھ نمونے چھوڑے۔ اور مقامی لوگوں میں ذوق تتبع پیدا کر دیا ہر چند بیدل کے عہد میں یا اس سے پہلے بہار کے اندر اردو شاعری کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ابھی اس عہد کا کلام غیر مطبوعہ ہے اور بہاری اہل قلم پوری طرح زور بازو صرف کر کے ان اکابر کے حالات و کلام فراہم کر رہے ہیں غلام نقشبند سجاد اور اشرف علی خان فغاں وغیرہ کی شاعری بیدل اسکول سے اثر پذیر ہوئی، ہر چند میر تقی نے نکات الشعراء میں فغاں کو قزلباش خاں امید کا شاگرد بتایا ہے لیکن امید تو فارسی کے شاعر تھے، اردو میں انھوں نے صرف دو شعر موزوں کئے میر صاحب نے ان کے دونوں شعر نقل کئے ہیں جو امید نے میر صاحب کو سید حسن رسول نما بنارسی قدس سرہ کے عرس کی تقریب میں بمقام بنارس سنایا تھا فغاں بہار کے رہنے والے تھے، میر صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں "بندہ بخدمت او بسیار مربوطم"، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فغاں نے میر صاحب کے دل پر کون سا نقش ارادت چھوڑا تھا۔

(۲) بیدل کی وفات کے تقریباً چونتیس سال کے بعد مضافات عظیم آباد کے ایک قریہ "سائیں" میں شیخ غلام علی راسخ پیدا ہوئے نصف صدی کے اس درمیانی زمانہ میں بہار کے اندر اردو شاعری نے کافی ترقی کر لی تھی بیدل اور سجاد کے نقوش میں زیادہ جلا ہو رہی تھی، میر ضیا، فغاں، اشکی اور جمال نے عظیم آباد کو "دامان بہار" بنا رکھا تھا میر ضیا دہلی سے آگئے تھے اشکی و جمال نے خواجہ میر درد کی شاگردی اختیار کر لی تھی، اسی دور میں راسخ نے بھی شعر کہنا شروع کیا۔ آب حیات آزاد اور حیات فریاد علامہ شاد میں ان کا وہ مشہور شعر درج ہے، جو انھوں نے میر تقی کو سنایا تھا، اس میں شک نہیں راسخ کے ذوق شعری کو میر صاحب کی شاعری سے خاص مناسبت تھی، اسی لئے وہ میر صاحب کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کرنے کے لئے گئے

راسخ، میر صاحب کی شاگردی پر فخر بھی کرتے ہیں خود میر نے ان کو "فخر میر" کا لقب دیا لیکن تلمذ سے پہلے راسخ کے کلام میں کافی پختگی آچکی تھی، فرماتے ہیں۔

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے　　مژہ پر اپنے آنسو صبح پیری کا ستارہ ہے

راسخ کے اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بہار میں میر صاحب کی شاگردی سے پہلے فروغ پاچکی تھی، راسخ ۱۱۶۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۳ھ میں وفات کی اس عہد کے تمام اکابر بہار الفتی، اشکی، جمال، عبرتی، فرد سب ہی راسخ کی شاعری کو زیادہ فروغ ہوا، شاہ ابو الحسن فرد (متوفی ۱۲۶۸ھ) اور غلام علی راسخ دونوں حضرت شاہ نور الحق تپاں کے شاگرد تھے، شاہ نور الحق صاحب بڑے محدث بھی تھے، شاہ عبد العزیز صاحب نے "عجالہ نافعہ" آپ ہی کے لئے لکھی تھی تپاں پھلواری کے رہنے والے تھے، آپ نے ۱۲۳۷ھ میں انتقال کیا اس لئے راسخ اسکول بلا واسطہ بہاری اسکول ہے راسخ کے تلامذہ میں مفتی انور علی یاس آروی (متوفی ۱۲۶۲ء) بہت اہمیت رکھتے ہیں فرماتے ہیں۔

یاں طرز سخن میں اے یاس　　راسخ کے یادگار ہیں ہم

یاس مرحوم ایک جید عالم اور فارسی کے مستند شاعر تھے، آپ کا دیوان ۱۲۹۸ھ میں طبع ہوا تھا یاس کے سوانح حیات اور شاعری پر سالنامہ ساقی (۱۹۳۲ء) میں ایک تبصرہ ہوچکا ہے۔

(۳) بہار میں تیسرا اسکول سادات بلگرام کا ہے، یہ لوگ بلگرام سے آرہ اور گیا چلے آئے چنانچہ سید خو، سید علی خورشید بندہ علی بندہ غلام یحیٰی یحیٰی، سید محمد مہدی خبر، میر امامی، سید فرزند احمد صفیر اس خانوادہ کے اہل کمال گزرے ہیں صفیر (متوفی ۱۳۰۴ء) سے پہلے آرہ میں مولنا انور علی یاس آروی کی شہرت ہوچکی تھی، اسی زمانہ میں سید سلطان عالم صاحب مارہروی آرہ تشریف لائے، لیکن صفیر نے اپنے عہد میں مجالس ادبی کی جو یادگاریں چھوڑی ہیں اس کی نظیر ان سے قبل نہیں ملتی، صفیر نے دلی اسکول اور لکھنؤ اسکول دونوں سے استفادہ کیا چنانچہ جہاں انھوں نے غالب کو اپنا کلام دکھایا وہاں ناسخ کے شاگرد رشید شیخ امان علی سحر سے بھی اصلاح لی، دبیر کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا لیکن غالب، سحر، اور دبیر سے مشورہ سخن کرنے سے بہت پہلے ان کی شاعری کا آغاز ہوچکا تھا خود گھر میں سید صاحب عالم صاحب عالم، میر امامی، سید محمد مہدی خبر موجود تھے میر امامی کا دیوان گم ہوگیا اور آرہ کے بعض حضرات کے یہاں آج بھی دستیاب ہوسکتا ہے میر امامی کی شاعری بہار ہی میں پھولی پھلی، اس لئے وہ بہاری تاریخ ادب کے ایک اہم باب ہیں صفیر نے اپنی تالیفات وتصنیفات کے علاوہ بہت سے باکمال شاگرد چھوڑے جن میں مولنا اسمعیل تمنا قاضی واجد حسین وجد، سید امیر حسن بدر (صاحب خمخانہ) کا نام لیا جاسکتا ہے، یہ سب ملکی محلہ آرہ کے رہنے والے تھے۔

(۴) ماضی قریب اور عہد حاضر میں شمشاد کے شاگردوں نے بہار پر زیادہ اثر ڈالا، شمشاد لکھنوی ناسخ اسکول کے مشہور قائد ہیں، فرنگی محل کے جید عالم تھے، اس لئے طبقہ علما میں آپ کی زیادہ پذیرائی ہوئی۔ چنانچہ مولنا شوق نیموی مولنا ضمیر الحق قیس آروی، حضرت تمنا پھلواروی، اسی اسکول کے علمبردار ہیں، مولنا شوق بہت بڑے علامہ تھے، حدیث میں آپ کی تالیف "آثار السنن" نہ صرف ہندوستان بلکہ حجاز میں بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اور داخل نصاب ہے آپ کی ایک مثنوی سوز و گداز بہت ہی مقبول ہوئی۔

ہمارا زمانہ اردو ادب کے لئے دور نہضت ہے، اس وقت قدیم عربی اور یوروپی شعرا کی طرح علمی، سیاسی اور معاشرتی نظم نگاری کا ذوق پیدا ہو رہا ہے، پنجاب نے اقبال، اودھ نے جوش اور دکن نے علی اختر اختر پیدا کئے بہار بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہا آج ہم اپنے وطن کے مایہ ناز بزرگ ڈاکٹر عظیم پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں، اس سلسلہ میں سید عبد الغنی شمس اور احمد آرزو ایم اے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شمس صاحب کی نظمیں ندیم، فطرت وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں، آپ کی بہت سی نظمیں غیر مطبوعہ ہیں، آپ کی ذات سے اہل بہار کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں جامعہ شمس الہدی (پٹنہ) کا یہ عالم اپنی انشائے عالیہ، اور ادب لطیف کے لئے نقاد نگاہوں میں گھر کر چکا ہے، شمس کی موجودہ زندگی سراپا شعر ہے، موسیقیت ہے ایک ایسی لطیف زندگی ہے جہاں عبوشا قطر میلا قسم کا کوئی مولوی مشکل ہی سے پہونچ سکتا ہے، اگر بہار کے اس نوجوان شاعر نے اپنی مشق سخن جاری رکھی تو پھر وہ دن دور نہیں جبکہ ہندوستان ایک قومی شاعر کی حیثیت سے ان پر فخر کرے گا۔

عبد المالک (آروی)

ا۵ اس مضمون میں اساتذہ بہار کے متعلق محض اشارے کر دیے گئے ہیں ہمارے عہد میں بہار کے اندر بڑے بڑے شعرا موجود ہیں افسوس ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح شہرت و نمود سے یکسر علیحدہ ہیں حالانکہ اجتماعی مفاد کے لیے افراد میں ان خیالات کا ہونا ضروری ہے، مگر کیا کیجئے بہار کے خمیر ہی میں زہد گزینی کا مادہ ہے، حضرت فضل حق آزاد، حضرت شفق عماد پوری، حضرت عرش گیاوی، شاہ نصیر عظیم آبادی، جناب نصیر (بیرسٹر)، جناب تبدل (پروفیسر)، ہمارے زمانہ کے صاحب کمال بہاری شعرا ہیں ان کے علاوہ گیا، عظیم آباد، پھلواری آرہ تمام شعر و سخن کا پاکیزہ مذاق ہے، اور ہر جگہ ماہران علم و ادب کی کافی تعداد موجود ہے؛

دکن اور اُردو شاعری

(سلطنت آصفیہ سے پہلے دکن کی اُردو شاعری پر ایک نظر)

شاعری کا انسانی ترقی میں خاص حصہ رہا ہے۔ اخلاق کی تہذیب اور تمدن کی اصلاح میں جو کارہائے نمایاں اس سے ظہور میں آئے وہ اور وسائل سے نہیں آئے۔ نظم کے باعث ہی فطری ولولے جوش میں آتے اور قدرتی جذبات کو حرکت و جنبش ہوتی ہے اس امر کا ٹھیک پتہ لگانا نہایت دشوار ہے کہ پہلے کس زبان میں نظم کی ابتدا ہوئی لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں جس قدر زبانیں عالم وجود میں آئیں ان میں اول نظم ہی کا رواج ہوا ہے کیونکہ نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے۔ اسی لئے قدیم زمانہ میں مذہبی کتابیں نظم ہی میں قلمبند ہوا کرتی تھیں۔ سنسکرت میں عرفان حقیقی اور فلسفہ و حکومت کا اشراقی کام نظم کے ذریعہ ہی سے وابستہ تھا۔ زمانہ جاہلیت میں جبکہ عرب میں کتابت کا دستور نہ تھا سیکڑوں ہزاروں اشعار عرب یاد رکھتے تھے۔ اسی طرح فارسی زبان میں شاعری سے بڑے بڑے کام لئے گئے اور شاعری کو بادشاہوں کی خلوت جلوت، رزم بزم سے خاص تعلق رہا۔ شاعروں کی کافی طور سے عزت افزائی کی گئی اور انھیں ملک الشعرا کا خطاب دیا جانے لگا۔

گر دکھنی زبان میں ایسا نہیں ہوا یہاں نظم کی ابتدا نثر کے بعد ہوئی اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تحریر کی ابتدا چونکہ ترجمے سے ہوئی اور نظم کے بہ نسبت نثر میں ترجمہ کرنا آسان اور سہل تھا اس لئے غالباً نظم کی ابتدا نہیں ہوئی بلکہ نثر سے ابتدا کی گئی۔

یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ دکھنی زبان کا پہلا شاعر کون تھا؟ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسینی کی طرف بھی اشعار منسوب کئے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے کلام کے متعلق کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے اس لئے سردست ہم کوئی فیصلہ کن خیال ظاہر نہیں کر سکتے۔

ایک زمانہ تھا کہ اہل علم ولی اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا شاعر تصور کرتے تھے اب جدید تحقیقات اور مزید معلومات

کی بنا پر سلطان محمد قلی قطب شاہ المتوفی ۱۰۲۰ھ کو پہلا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سلطان کے کلام سے خود اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ اردو کا بالکل ابتدائی کلام نہیں ہے۔

جہاں تک ہم نے اب تحقیقات کی ہے اس کے لحاظ سے "نظامی" پہلا شاعر ہے جو سلطان احمد شاہ بہمنی المعروف نظام شاہ ۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ کے دور حکمرانی میں موجود تھا۔

نظامی کی مثنوی "کدم راؤ و پدم راؤ" دستیاب ہوئی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ دکھنی شاعری کا ابتدائی نمونہ ہے بہمنی حکومت (۷۴۸ھ تا ۹۳۴ھ) کے کسی اور شاعر کا اس وقت تک کوئی کلام نہیں ملا ہے بہمنی حکومت کے زوال پر ۹۱۸ھ میں گولکنڈہ پر قطب شاہی اور ۸۹۵ھ میں بیجاپور پر عادل شاہی پرچم لہرانے لگا اور تقریباً دو سو سال کے بعد دونوں علم سرنگوں ہو گئے اس طرح ۱۰۹۷ھ اور ۱۰۹۸ھ میں بیجاپور اور گولکنڈہ پر مغلیہ جھنڈا بلند ہو گیا

اس عرصہ میں ان دونوں سلطنتوں نے علم ہنر کی ترویج اور تمدن و تہذیب کے رواج دینے میں جو کچھ سعی کی تھی وہ ہرگز فراموش نہیں ہو سکتی۔ جب ہم ان کے مختصر رقبہ مملکت کو پیش نظر رکھ کر ان کی شان و شوکت اور دبدبہ طمطراق کو دیکھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنی عظیم الشان دولت و ثروت اور بیش قرار لشکر کس طرح فراہم ہوتا تھا جس طرح ان کی دولت مندی اور ان کے زر و جواہر کی فراوانی بادی النظر میں افسانہ معلوم ہوتی ہے اسی طرح ان کی علم دوستی اور اہل کمال کی قدردانی بھی حیرت انگیز ہے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور علم و ہنر کے مرکز اور تمدن و تہذیب کے گہوارے تھے۔ دور دور کے اہل علم و فضل یہاں کی قدردانی کا شہرہ سنکر آتے اور اپنی محنت و مشقت کا کافی صلہ پا کر نہال ہو جاتے تھے۔ یہاں کے چشمہ ہائے فیض کی آبیاری سے چمنستان علم و فضل سرسبز اور شاداب تھے۔ مے خانہ علم و فن معمور شعر و سخن کی مجلسیں آباد تھیں۔ گھر گھر مشاعروں کے جمگھٹے ہوتے تھے۔ غرضکہ بیجاپور اور گولکنڈہ کو اگر زمانہ سلف میں قرطبہ اور بغداد سے مماثل سمجھا جاتا تھا تو اب لندن اور برلن کو اس کے مقابل لا سکتے ہیں۔

عربی و فارسی سے قطع نظر ہم دکھنی بہ الفاظ دیگر اردو کی ترقی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ یہ امر ہم کو معلوم ہے کہ اردو کی ابتدا دکن میں ان دونوں سلطنتوں کے قیام کے بہت پہلے ہو چکی تھی اور وہ اگرچہ عام بول چال کے درجے گزر چکی تھی اور پھر نثر و نظم کے مدارج بھی طے ہو چکے تھے مگر پھر بھی نثر فقہ و تصوف کی ایک دو کتابوں تک محدود تھی اور نظم کے بھی ایک آدھ نمونہ کا پتہ چلتا ہے ان دونوں سلطنتوں نے اردو کی سرپرستی فرمائی اور اس کو ترقی دیکر بارور اور شمر کر دیا۔ اس کو اپنی سرکاری زبان قرار دے کر عزت دی۔

ان خاندانوں کے خود کئی ایک تاجدار اچھے شاعر تھے انکا کلام آج تک موجود اور اپنے مصنفوں کی اعلیٰ قابلیت کی زندہ گواہ ہے

سلطان محمد قلی اور سلطان محمد اور عبداللہ قطب شاہ کے کلیات اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے اردو کے جواہر پارے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح ابراہیم عادل شاہ کا شہ کار "نورس" اور علی عادل شاہ کا کلیات اور مثنوی بدری الجمال درحقیقت کلام الملوک ملوک الکلام کے مصداق ہیں۔

ان حکمرانوں کے دور کے مسلسل اور طویل نظموں کے نمونے موجود ہیں جو صرف کسی اور زبان کے ترجموں تک محدود نہیں ہیں بلکہ [illegible] اور طبع زاد بھی ہیں صنف شاعری کے متعدد اقسام مثلاً مثنوی۔ قصیدہ۔ غزل۔ رباعی اور قطعہ میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور اپنی یادگاریں شعر و سخن کے بہتر سے بہتر نمونے چھوڑے ہیں۔

ان کی شاعری میں رزم و بزم۔ واقعہ نگاری۔ مرقعہ نگاری۔ عشق و محبت، تصوف و فلسفہ۔ روزمرہ و اخلاق سب کچھ موجود ہے۔ اسلوب بیان کی جدت تخیل کی بلند پروازی خیالات کی ندرت اور سادگی و صفائی، تسلسل اور پاکیزگی انکے کلام کے خاص جوہر ہیں۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کے جن جن شاعروں اور ان کی تصانیف کا پتہ اب تک چلا ہے ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

گولکنڈہ

شمار	نام شاعر	زمانہ	تفصیل تصانیف
۱	فیروز	سنہ ۹۲۵ھ	؟
۲	محمود	سنہ ۹۷۵ھ	؟
۳	وجہی	سنہ ۹۸۸ھ	مثنوی قطب مشتری۔ مرثیہ
۴	سلطان محمد قلی	سنہ ۹۸۸ھ	کلیات
۵	احمد	سنہ ۹۹۰ھ	لیلیٰ مجنوں۔ مصیبت اہل بیت
۶	سلطان محمد	سنہ ۱۰۲۰ھ	کلیات
۷	غواصی	سنہ ۱۰۲۰ھ	سیف الملوک
۸	قطبی	سنہ ۱۰۳۰ھ	مثنوی تحفۃ النصائح
۹	جنیدی	سنہ ۱۰۳۵ھ	مثنوی ماہ پیکر
۱۰	سلطان عبداللہ	سنہ ۱۰۳۵ھ	کلیات
۱۱	ابن نشاطی	سنہ ۱۰۳۶ھ	مثنوی پھول بن

شمار	نام شاعر	زمانہ	تفصیل تصانیف
۱۲	طبعی	۱۰۵۰ھ	مثنوی بہرام وگل اندام
۱۳	ابن	۱۰۵۷ھ	قصہ ابو شحمہ
۱۴	خواص	۱۰۷۵ھ	قصہ حسینی
۱۵	غلام علی	۱۰۷۵ھ	مثنوی پدماوت
۱۶	سیوک	"	
۱۷	فائز	"	
۱۸	لطیف	۱۰۸۰ھ	ظفرنامہ
۱۹	افضل	"	محی الدین نامہ
۲۰	نوری	"	
۲۱	کاظم	"	
۲۲	مرزا	"	
۲۳	شاہی	"	

بیجاپور بیجاپور کے شعرا اور ان کے تصانیف کی فہرست یہ ہے:-

شمار	نام شاعر	زمانہ	تفصیل تصانیف
۱	شاہ میران جی	۹۰۲ھ	خوش نامہ۔ خوش نغز۔ شرح مرغوب القلوب
۲	ابراہیم	۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ	نورس
۳	برہان الدین جانم	۹۷۵ھ	وصیت الہادی سکھ سہیلا۔ وغیرہ
	آتشی	۱۰۵۰ھ	؟
	مقیمی	۱۰۵۰ھ	مثنوی چندر بدن و مہیار
	امین	"	بہرام و حسن بانو
	شوقی	"	فتح نامہ نظام شاہ - میزبانی نامہ
	صنعتی	"	قصہ تمیم انصاری
	ملک خوشنود	"	مثنوی ہشت بہشت

عربی و فارسی

اردو کی ابتدا دکن میں،

گزر چکی تھی اور پھر نثر و نظم۔

اور نظم کے بھی ایک آدھ نمونہ کا

شمر کر دیا۔ اس کو اپنی سرکاری ز

ان خاندانوں کے خود کئی ایک

شمار	نام شعر	زمانہ	تفصیل تصانیف
۱۰	رستمی	۱۰۵۵ھ	مثنوی خاور نامہ
۱۱	دولت	۱۰۵۵ھ	تکمل بہرام وحسن بانو
۱۲	علی عادل شاہ شاہی	۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ	کلیات اور مثنوی الجمال
۱۳	نصرتی	۱۰۶۰ھ	گلشن عشق۔ علی نامہ۔ تاریخ سکندری
۱۴	شاہ ملک	۱۰۶۰ھ	شریعت نامہ
۱۵	امین الدین علی	۱۰۷۵ھ	رموز السالکین۔ محبت نامہ وغیرہ
۱۶	ہاشمی	"	یوسف زلیخا
۱۷	مرزا	"	مرثیہ
۱۸	ایاغی	"	نجات نامہ
۱۹	سیوا	"	روضۃ الشہدا
۲۰	شغلی	"	
۲۱	مومن	۱۰۸۰ھ	اسرار عشق
۲۲	قادر	"	غزل
۳۳	شاہ من عرف	"	"
۳۴	معظم	"	شجرۃ الاتقیا۔ گنج مخفی

ادہر گولکنڈہ میں وجہی کی قطب مشتری۔ غواصی کی سیف الملک۔ ابن نشاطی کی پھول بن طبعی کی بہرام وگل اندام۔ غلام علی کی پدماوت اور لطیف کا ظفر نامہ شہ کار ہیں تو ادہر بیجاپور میں صنعتی کا قصہ تمیم انصاری۔ رستمی کا خاور نامہ۔ نصرتی کی گلشن عشق اور علی نامہ۔ اپنی خوبیوں سے ادب اردو کے جگمگاتے نگیں ہیں۔

ان دونوں سلطنتوں میں مرثیہ گوئی کا بھی آغاز ہوا۔ اس وقت کے مرثیے اپنے سوز وگداز سے خاص اثر پیدا کرتے۔ اس زمانہ کے مرثیوں سے مجلس عزا میں حقیقی طور پر اشک باری ہوا کرتی تھی۔ ان کا جوہر مرثیہ پن تھا۔ غواصی۔ کاظم۔ مرزا شاہی اور ہاشمی کے مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور اور ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈہ فتح ہو کر سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گئے۔ اس طرح

عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کا خاتمہ ہوگیا اور اب عالمگیر کی جانب سے یہاں صوبہ دار مقرر ہونے لگے۔ اور پھر سلطنت مغلیہ کا بھی دکن ہی مستقر ہوگیا۔

قطب شاہی پایۂ تخت گولکنڈہ اور عادل شاہی دار الحکومت بیجاپور شاعری کے مرکز تھے تو اب مغلیہ دور میں اورنگ آباد نے اس کی جگہ لے لی اس طرح اورنگ آباد نہ صرف سلطنت مغلیہ کا دار الحکومت ہونے کے لحاظ سے امراء اور علماء و شعراء کا مرکز بن گیا بلکہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے باکمالوں کا بھی ملجا ٹھر گیا

گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں سے شعراء اردو کے ساتھ بیحد مراعات کئے جاتے تھے انھیں ان کی تصانیف کا معقول صلہ دیا جاتا تھا نہ صرف سلاطین بلکہ امراء دکن بھی اردو کی سرپرستی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جایا کرتے تھے۔ لیکن مغلیہ دور میں اس قسم کی قدردانیوں کے کم ہوجانے کے باوجود قابل افراد بلا کسی صلہ یا قدردانی کی امید کے اردو میں شعر و سخن کی داد دینے لگے تھے۔ علاوہ ازیں عالمگیر نے بھی فتح بیجاپور کے بعد دکھنی شاعری کی قدردانی کی اور نصرتی کو ملک الشعراء کے خطاب سے مشرف کیا تھا[1]۔

اورنگ آباد کو اورنگ زیب عالمگیر نے سنہ ۱۰۶۲ھ میں اپنا صدر مقام قرار دیا تھا اسی وقت سے اس کی رونق زیادہ ہونے لگی تھی۔ فتح گولکنڈہ و بیجاپور کے بعد اس کی ترقی میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ تمدن و تہذیب کے ساتھ علم و فن میں بھی ترقی ہونے لگی۔ شعر و شاعری کا بھی چرچا بڑھا۔ اس طرح اردو شاعری کے بھی قدم یہاں اچھی طرح جم گئے اور شعراء نے اپنی یادگار میں بہترین کلام کو یادگار زمانہ چھوڑا۔

سنہ ۱۰۹۸ھ میں تقریباً پورا دکن قلمرو مغلیہ میں شامل ہوا تھا اور سنہ ۱۱۳۶ھ میں حضرت آصفجاہ اول نے اپنی حکومت کی بنا ڈالی اس (۳۸) سالہ مدت میں بھی اردو کے کئی ایک شعرا مشہور ہوئے جن کی مثنویاں۔ دیوان اور مرثیے آج تک موجود ہیں

اس زمانہ کے شعراء جن سے ہم واقف ہیں یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

شمار	نام	زمانہ	تفصیل و تصانیف
۱	عاجز	سنہ ۱۱۰۰ھ	مثنوی ملک مصر
۲	ضعیفی	سنہ ۱۱۰۰ھ	عشق صادق - ہدایت نامہ
۳	امین	سنہ ۱۱۰۹ھ	یوسف زلیخا

[1] تذکرہ فتوت موسوم ریاض حسنی مخطوطہ دفتر دیوانی و مال سرکاری نظام

شمار	نام	زمانہ	تفصیل و تصانیف
۴	ذوقی	سنہ ۱۱۱۰ھ	عزت نامہ ۔ مرثیے
	وجدی	سنہ ۱۱۱۵ھ	تحفہ عاشقاں، منطق الطیر
۵			باغ جانفزا
۶	بحری	سنہ ۱۱۱۶ھ	من لگن
۷	اشرف	سنہ ۱۱۲۵ھ	جنگ نامہ حیدر
۸	عشرتی	سنہ ۱۱۲۵	دیپک پتنگ ۔ نیم درپن وغیرہ
۹	مجرمی	سنہ ۱۱۳۰ھ	
۱۰	طالب	"	
۱۱	بیچارہ	"	
۱۲	شمیم احمد	"	
۱۳	فراقی	"	
۱۴	ندیم	"	
۱۵	ولی ویلور	"	رتن و پدم ۔ روضۃ الشہدا
۱۶	ولی اورنگ آبادی	سنہ ۱۱۱۹ھ	کلیات

سلطنت آصفیہ کے زمانہ میں اردو کی ترقی کے متعلق یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ ہماری کتاب دکن میں اردو کے تیسرے اڈیشن میں جو زیر طبع ہے اس کے متعلق پوری وضاحت کی گئی ہے۔

نصیر الدین (ہاشمی)

تخلیق اُردو

پوچھنا تاریخ سے پیدائش اردو کا حال
کم سنوں سے ہے بزرگوں کی ولادت کا سوال
جس زباں کی آفرینش کا تجھے آئے خیال
اور سکے اسباب و علل اور فلسفے کو دیکھ بھال
ملک میں اردو زباں افواج کی بھرتی نہ تھی
یہ بیک الفاظ کی بارش ہوا کرتی نہ تھی

ہند تیرہ سو برس سے مسلموں کا ہے مقام
تاجروں اور صوفیوں اور لشکروں کا ہے قیام
کس زباں میں ہندیوں کے ساتھ ہوتا تھا کلام
کاروبارِ باہمی کا کس طرح چلتا تھا کام
کیا سوال آنکھوں سے ہوتا اور ابرو سے جواب
گفتگو ہند اور عجم کی تھی کوئی گونگے کا خواب؟

عقل و تہذیب و تمدن متحد تھے سب بہم
مجتمع تھے اہل ہند اہل عرب اہل عجم
دلفریبی سے بتانِ ہند پہنچے تا حرم
ہو گئے تھے ایک مل کر کعبہ و بیت الصنم
لائے سوغاتیں وہ اور ان سے مداراتیں ہوئیں
پہلے مستعمل ہوئے الفاظ پھر باتیں ہوئیں

چند تاجر آئے پھر درویش پھر فوجی نشان
کچھ عرب، کچھ ترک، بعد ان کے مغل تھے پھر پٹھان
پہلے ہی پنجاب ان چاروں کا لیتا امتحان
پاس جب سب یہ ہوئے پیدا کی ایک جامع زبان
اس زباں کا نام ہندی ہو گیا پھر ہندوی
بعد ازاں ہندوستانی، آخرش اردو ہوئی

اہل دیں نے کی اسی ہندی میں خدمت دین کی
اور اسی میں سعد نے دیوان کی تدوین کی!
پند اک منظوم ہے حضرت فرید الدین کی
نظم خسرو میں بھی ہے ترکیب اسی آئین کی
بڑھ کے مخطوطات یورپ کیجئے گا غور بھی
کیا نہیں ممکن کہ ہو اس کے سوا کچھ اور بھی

الغرض اردو کا اول مستقر پنجاب تھا
کیونکہ قصر ہند کا پہلا ہی در پنجاب تھا
نقطۂ مردم پئے اہل نظر پنجاب تھا
دائرہ تھا دور تک مرکز مگر پنجاب تھا
جیسے خط رخ کا بڑھے ابرو کی جدول چھوڑ کر
بڑھ چلا یوں نقش ثانی نقش اول چھوڑ کر

تخم جو الفاظ کے بوئے گئے پنجاب میں
ہر طرف بہتے پھرے وہ جنگ کے سیلاب میں

تھے قلم اس کے بھی تلواروں کیساتھ اسباب میں
وہ بہارِ جاں فزا جب دولت آباد آ گئی

ہند کے پودوں میں کچھ ایران کے پیوند تھے
مختلف سب مذہب و تہذیب میں ہر چند تھے
تھے جو دونوں صورتِ شیر و شکر آمیختہ

بات جو تھی بند بند، اب دوبدو ہونے لگی
بات میں اک بات ہو یہ آرزو ہونے لگی
نثر ہی کے سلسلوں سے نظم کی کڑیاں بنیں

اہلِ جوہر گوندھ کے اس کو نفس کے تار میں
قدر و قیمت اسکی روز افزوں تھی ہر بازار میں
یہ جواہر قابلِ انگشتری ہونے لگے

انقلابِ دہر نے بدلا جو رنگ آسماں
مثنوی پر مرثیہ پڑھنے لگے جب نوحہ خواں
ضبط رہتا کب تک آخر، اور کیوں رہنے لگا

حسن نے جرأت دلائی، عشق کے دفتر کھلے
منظرِ اردو پہ جب نظارے کے زیور کھلے
ساغرِ اردو میں اب خطِ جلی پیدا ہوا

ہاں ولی کے دل پہ سایہ تھا علی کے نور کا
ظرفِ موسیٰ کا دیا تھا حق نے، دلِ منصور کا
ایسی معراج ایسے اعجاز، ایسی امت پا گئے

اہلِ دہلی کو ولی سے تھے ملا حسنِ بیاں
شاہ سعد اللہ گلشن نے کئے نکتے عیاں
مثل رنگین و فغان و شاہ حاتم آبرو

سینچا دہلی کی فضا نے شبنمِ شاداب میں
بیل ادبکی بڑھ کے گجرات و دکن پر چھا گئی

جوڑ ان دونوں میں گویا نیشکر کے بند تھے
پھر بھی انسانی تمدن کے تو سب پابند تھے
مدھ بھرے ہونٹوں سے رس ٹپکا تو وہ تھا ریختہ

بے تکلف بیجا با گفتگو ہونے لگی
قیدِ آزادی میں ہو یہ جستجو ہونے لگی
اس قدر بکھرے یہ موتی خود بخود لڑیاں بنیں

لے گئے بھر بھر کے موتی دامنِ گفتار میں
تھی رسا دربار میں پوچھی گئی سرکار میں
عادلی و قطب شاہی مشتری ہونے لگے

اٹھ گئے دنیا سے گجرات و دکن کے قدرداں
سوز سے پیدا کیا جذبات نے سازِ فغاں
حسن اپنے عشق میں خود ہی غزل کہنے لگا

عشق نے کھولی زباں تو حسن کے جوہر کھلے
پھر دلی جذبات کے بھی میکدے کے در کھلے
میکشانِ ریختہ میں ایک ولی پیدا ہوا

رشتۂ الہام تھا جبریل سے بھی دور کا
اور ادھر معمورۂ دلی پہ عالم طور کا
آ کے دہلی میں ولی گویا نبوت پا گئے

اہلِ دہلی سے ولی کو کچھ ہوا فیضِ زباں
ہم سخن تھے دہلوی و اکبر آبادی وہاں
اور مظہر ناجی و یکرنگ و مضمون آرزو

سادگی تھی ریختہ کی مقتضائے کمسنی
بھولی بھالی شکل و صورت سیدھی سادی بات تھی
بندشوں سے عہدِ طفلی تک تو آزادی رہی
پھر جوانی کا جنوں ہمراہ لایا قید بھی
ولولے سودا کے تھے سب سلسلے زنجیر کے
عشق کی دیوانگی تھی اور نشتر میر کے

مثنوی کہدی حسن نے بے نظیر و بے بدل
درد نے موزوں کئے پُر درد نالے بر محل
ذوق کا شوق زباں دانی ہوا ضرب المثل
کعبۂ معنیٰ بنا مومن کا ہر بیت الغزل
پھیر کے غالب نے رُخ سجادۂ تخئیل کا
اک نیا میخانہ کھولا بادۂ تخئیل کا

دیگئے تھے کیا سبق وہ شاعرانِ ماسبق
ان ادیبوں پر جو روشن کر گئے چودہ طبق
لیکن افسوس، اب جو الٹا دورِ گردوں نے ورق
ہو گیا برباد دہلی کا وہ سب نظم و نسق
منتشر اہلِ سخن، اہلِ زباں ہونے لگے
طائرانِ خوش نوا بے آشیاں ہونے لگے

خاک و خوں میں مل گیا اس طرحِ دہلی کا چمن
رہ گئے گلہائے خلعت پوش بے گور و کفن
شامِ غربت سے بھی کچھ تاریک تھی صبحِ وطن
شمعِ کشتہ بن کے نکلے بزم آرائے سخن
کرچکا تھا رد شجاع الدولہ کی جو آرزو
آہ وہ سودا خود آیا بن بلائے لکھنؤ

جب یہاں یہ لوگ آئے اور رہی کچھ رنگ تھا
دیکھ کر ہر جوہری رنگینیوں کو دنگ تھا
سادہ کاری کا نگیں بے نقشِ زینت تنگ تھا
صیقل و مینائے اب خورشید کا ہمرنگ تھا
یہ نگینہ جب ترشوایا تو ضو دینے لگا
لکھنؤ کی بزم میں آیا تو لَو دینے لگا

جس قدر پہلو تھے اس کے سب کے سب روشن ہوئے
رہ گئے تھے رُخ جو تاریکی میں اب روشن ہوئے
خال و خط اسبابِ زینت کے سبب روشن ہوئے
آئینہ دیکھا تو رخسارِ ادب روشن ہوئے
خود نمائی کے لئے خود بینیاں پیدا ہوئیں
سادگی جاتی رہی رنگینیاں پیدا ہوئیں

گو یہاں موجود تھے پہلے سے چند اہلِ کمال
مصحفی کا ذکر ہے مشہور اور انشا کا حال
میر کو بھی کھینچ لایا قدر دانی کا خیال
یہ وہی تھے میر جن سے بات کرنی تھی محال
اپنی اُردو کے تحفظ میں تھے گویا کم سخن
کس کی منھ میں تھی زباں، انسے جو ہوتا ہم سخن

میر پر گزرے تھے اتنے حادثاتِ رنج و غم
تھے بجائے روح و دم رگ رگ میں اب درد و الم
ہر نظر اک متنِ غم تھی، ہر نفس شرحِ ستم
ہر سخن اک نامہ بر تھا دردِ دل کا تازہ دم

رنگ شوخی لائے وہ کیا شعر کے مضمون میں
جس کا دل ڈوبا ہوا ہو آپ اپنے خون میں

لکھنؤ اس وقت تھا عیش و طرب کا نغمہ گاہ
زمزموں میں ان کے نالوں کو کہاں ملتی پناہ

عاقبت بینی سے لیکن قدرداں تھا بادشاہ
میر کی نازک مزاجی سے بھی کرتا تھا نباہ

پھر جب آ پہونچی یہاں بھی گردشِ لیل و نہار
ہے جبھی سے شورِ بلبل جوشِ گل کی یادگار

انتزاعِ ملک پر جن کو ہوا رنج و تعب
انکے رنج و غم پہ بیدردوں کو ہے غیظ و غضب

نخلِ ماتم سے جو بیگانہ ہے گلچینِ طرب
پوچھتا ہے سن کے ہنس ہنس کر وہ نالوں کا سبب

یہ وہ سمجھے ہمنشینوں سے ہو جو چھوٹا ہوا
گل ہے کیوں افسردہ اپنی شاخ سے ٹوٹا ہوا

الغرض اب لکھنؤ کیا تھا، ادب کا اک چمن
کھل گیا گویا نیا اک درس گاہ علم و فن

کیوں نہ کھلتا، جمع تھے جب ایسے ایسے اہلِ فن
سوز و انشا، مصحفی و میر، سودا و حسن

ان ادیبوں کا جہاں مسکن بنے مدفن بنے
کیا عجب گر وہ ادب کا مرکز و مخزن بنے

اس فضا میں طائرانِ فکر کے پر کھل گئے
پر کھلے کیا۔ وسعتِ اردو کے دفتر کھل گئے

فطرتِ سادہ پہ اب صنعت کے زیور کھل گئے
کھل گئی قسمت جواہر کی کہ جوہر کھل گئے

چشمے جو پنجاب کے دریا تھے دلی کے لئے
لکھنؤ والوں نے اس دریا سے موتی لے لیے

جو پرکھتے تھے انھوں نے دیکھ کر کھوٹے کھرے
سکے سب ٹلے کے دار الضرب کو واپس گئے

ایسے چند الفاظ تھے معیار سے اترے ہوئے
جائے ہے اور آئے ہے یا جا پڑے اور آوے

اس سے ثابت ہے کہ یہ داخل فصاحت میں نہیں
نج میں مستعمل ہیں تصنیف و اشاعت میں نہیں

دیکھی انگریزوں نے جب یہ معرکہ آرائیاں
جی میں سوچے گھیرے گی ملک بھر کو یہ زباں

قلعۂ ولیم میں اب کرنے لگے صف بندیاں
ہو چکا تھا زورِ نظم و نثر پہلے ہی یہاں

فوج انشا کی کماں انشا کو اول دے گئی
لکھنؤ میں پہلے اردو سے قواعد لی گئی

میر مجلس نثر کا تفضلی تھا وہ مجلس لکھی
باغ اردو کی بہار آرائش محفل ہوئی

چار درویشوں کی بیتی میر امن سے سنی
اک عجب افسانہ تھا نثرِ سرورِ لکھنوی

ناشر اتنے ہو گئے اخبار ناشر ہو گئے
آخرش اردو میں سرکاری دفاتر ہو گئے

لکھنؤ والوں نے جو اصلاح میں تقدیم کی
جس نظامِ خاص پر جس طرح کی تنظیم کی

مصحفی نے اپنے شاگردوں کو جو تعلیم کی
ملک کے ہر ناظم و نثار نے تسلیم کی

صاف ہو کر اب زباں کے فیصلے دلکش ہو گئے
جملہ منسوخاتِ ناسخ نذرِ آتش ہو گئے

موجد اپنے رنگ کے تھے شاعرانِ بےنظیر
بات میں بیباک جرأت - فکر میں آزاد میر

بندشِ مضموں میں ناسخ اور بنوٹ میں وزیر
عشق میں سرگرم آتش جامعیت میں امیر

مرثیے کے مجتہد مرزا دبیر و میر انیس
اک بلاغت میں لطیف اور اک فصاحت میں نفیس

تھے روانی کے مجدد بحر اور کیف و صبا
درد اصغر اثر میں ہمسر تعشق کا نہ تھا

فرد تھے رنگ تغزل میں رشید با صفا
قابل ذکر اور بھی استاد ہیں ان کے سوا

رند و برق و درخشاں مہر، نجم، قلق، فضل، نسیم
عاشق و منظر، جلال و شاد و جاوید و حکیم

اور شہروں میں بھی تھے اہل سخن شہرت پذیر
جیسے فرد کانپوری - اکبر آبادی نظیر

شیفتہ سالک یقین - ممنوں، شہیدی و صفیر
قدر و مجروح و حضور و داغ و شاد اکبر منیر

نظم ہوں کس طرح موتی اس قدر بکھرے ہوئے
کس سے کہیے لٹ گئے کتنے گہر بکھرے ہوئے

جب ہمارے ہاتھ سے ہندوستاں جاتا رہا
مثل سکوں کے ہمارا ہر نشاں جاتا رہا

جوشِ دل جاتا رہا - زورِ زباں جاتا رہا
گم ہوا عشق ادب، حسن بیاں جاتا رہا

وہ ستارے کیا چھپے وہ رات ہی جاتی رہی
وہ سخنور کیا گئے وہ بات ہی جاتی رہی

شاعری کچھ کم نہیں لیکن اثر کچھ بھی نہیں
ہے بہ ظاہر علم، باطن میں ہنر کچھ بھی نہیں

زوردار الفاظ ہیں معنی مگر کچھ بھی نہیں
چشمِ تصویر آنکھ ہے گویا نظر کچھ بھی نہیں

ذکر کے قابل نہیں ناواقفوں کے تذکرے
شاعری پر غیر شاعر کر رہے ہیں تبصرے

ہاں مگر ہے رازدارانِ زمانہ کا خیال
کرتی ہے تاریخ بیمارانِ ماضی کو بحال

پہونچے دربارِ دکن میں کچھ حکیمانِ شمال
کھل گئے ہیں چند اردو محکموں کے ہسپتال

ضعف میں اس چارہ سازی سے کمی تو ہو گئی
صحت کامل نہو، پر زندگی تو ہو گئی

اس طرف تو زندہ کرتا ہے دکن مردہ علوم
اس طرف پنجاب میں ڈوبے ہوئے نکلے نجوم

شاعرانِ قدرتی و نثر خود رو کی ہے دھوم
اور اردو کی کمک پر ہے رسالوں کا ہجوم

عشق علمی کہئے یا حسن تجارت مانئے
کچھ بھی ہو ناطق مگر یہ بھی غنیمت جانئے

ناطق - لکھنوی -

لکھنؤ کی شاعری لکھنؤ اسکول کے قیام سے قبل

(یعنی)

اودھ کا سب سے پہلا جذبات نگار شاعر

(نواب آصف الدولہ بہادر)

ولادت ۱۱۶۱ھ تخت نشینی ۱۱۸۸ھ وفات ۱۲۱۲ھ ہجری

نواب آصف الدولہ، فرمانروایان اودھ میں اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے بہت مشہور فرمانروا ہوا ہے لیکن یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اسکی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اسکا پاکیزہ ذوق سخن تھا

پانچ لاکھ روپیہ خرچ کرکے نجف اشرف میں نہر آصفی جاری کرانا، شریف مکہ کی ایک لاکھ روپیہ سے مدد کرنا، اسی طرح بیشمار دولت انعام واکرام میں تقسیم کردینا غلط بخشیوں کی تاریخ میں اسے خلعت دوام بخش سکتا ہے اور لکھنؤ کا وہ عظیم الشان عزاخانہ جو اسکے نام سے منسوب ہے ممکن ہے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی اس کی یاد کو کبھی فراموش نہ ہونے دے، لیکن جو چیز حقیقی معنی میں اس کے نام کو زندہ رکھنے والی ہے وہ اسکی سخن سنجی ہے جسکا ذکر اور تو اور خود حضرات لکھنؤ نے بھی کبھی نہیں کیا،

شاہ عالم بادشاہ دہلی کے پندرھویں سنہ جلوس میں اودھ کی مسند وزارت پر ۱۱۸۷ھ میں متمکن ہوا اور ۱۲۱۲ھ بعارضۂ استسقا انتقال کیا اس چھبیس ۲۶ سال کے طویل عہد وزارت میں اُس نے کیا کیا حرکتیں کیں، کن کن خباثت میں مبتلا رہا، عیش وعشرت کی بدمستیوں میں ملک کی دولت کس بدتمیزی سے اڑائی، ہمیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ان سے بحث کرنا موضوع زیر بحث سے علٰحدہ ہے لیکن یہ جستجو ہمارے لیے ضروری ہے کہ سرزمین اجودھیا میں جہاں اسکے باپ شجاع الدولہ کے زمانہ میں بھی کوئی شاعر پیدا نہ ہوا تھا اس میں یہ اہلیت کیونکر پیدا ہو گئی؟

دہلی ونواح دہلی کے شعراء میں سب سے پہلے اشرف علی خاں نے ہجرت اختیار کی اور ۱۱۶۸ھ میں اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشدآباد گئے وہاں سے لوٹے تو فیض آباد آئے (شجاع الدولہ کا زمانہ تھا) اور پھر عظیم آباد چلے گئے جہاں ۱۱۸۶ھ میں یعنی آصف الدولہ کی تخت نشینی سے

ایک سال قبل انتقال کیا، ان کے بعد ضیاء الدین ضیا کا شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد جانا پایا جاتا ہے لیکن یہاں انکی کس مپرسی کا حال اس سے ظاہر ہے کہ وہ نہ فیض آباد میں رہ سکے نہ لکھنؤ میں بلکہ عظیم آباد جاکر شتاب رائے کے بیٹے کا دامن پکڑا اور وہیں انکا انتقال ہوا، ضیاء کی ولادت و وفات کی کوئی تاریخ تذکروں میں درج نہیں ہے لیکن یہ ثابت ہے کہ میر ضیا سودا کے ہمعصر تھے میر حسن کے استاد سودا کا سنہ ولادت ۱۱۲۵ھ ہے اس لیے اگر میر ضیاء کا سنہ ولادت زیادہ سے زیادہ ۱۱۵۰ھ قرار دیا جائے اور ۱۱۸۷ھ میں فیض آباد آنا تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آصف الدولہ کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ چودہ سال کی رہی ہوگی۔

میر ضیا کے بعد میر حسن فیض آباد گئے اور لکھنؤ بھی آکر رہے لیکن شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی کوئی توجہ حاصل نہ کرسکے کیونکہ انکا تعلق اگر رہا بھی تو لکھنؤ میں نواب سالار جنگ یا اُن کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں سے اور وہ بھی اسد رجہ تنگی و عسرت کیساتھ کہ وہ خود لکھتے ہیں

"تاحال بہر نوع گزراں می نمائیم"

اس لیے ظاہر ہے کہ آصف الدولہ کو ان تینوں شاعروں میں سے کسی کی صحبت نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے بعد جب وہ تخت نشین ہوا تو بیشک سودا، میر، سوز، مصحفی، انشاء سبھی لکھنؤ پہونچے لیکن اس کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نہ سودا کا رنگ ہے نہ میر کا نہ مصحفی کا اتباع ہے نہ انشاء کا، البتہ سوز کی خصوصیات ضرور پائی جاتی ہیں سو ان کو بھی ہم سوز کا فیض صحبت اسلیے نہیں کہہ سکتے کہ یہ استادی شاگردی رہی کتنے دن!

سوز کا سنہ ولادت کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا لیکن تاریخ وفات ۱۲۱۳ھ پر سب کا اتفاق ہے بعض نے عمر ۷۰، ۸۰ کے درمیان بتائی ہے بعض نے ۸۲ سال، بہرحال یہ یقینی ہے کہ تقریباً ۸۰ سال کی عمر انھوں نے پائی تھی اور اسی لیے ۱۱۳۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہونگے سوز اول لکھنؤ کب پہونچے اسکی بھی صحیح تاریخ متعین نہیں ہوسکتی آزاد نے لکھا ہے کہ ۱۱۹۱ھ میں لباس فقر اختیار کیا اور لکھنؤ چلے گئے، آزاد نے غالباً میرزا علی لطف کے تذکرہ کو دیکھ کر لکھا ہے لیکن لطف کے بیان سے یہ کہیں واضح نہیں ہوتا کہ وہ اسی سال لکھنؤ گئے البتہ لباس فقر اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے بظاہر یہ تو صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سال دلی سے روانہ ہوئے اور سب سے پہلے فرخ آباد مہربان خاں رند کے پاس گئے لیکن فرخ آباد سے لکھنؤ و مرشد آباد کب گئے اس کا پتہ کچھ نہیں چلتا بعض تذکروں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۱۲ھ میں مرشد آباد گئے اور اسی سال لکھنؤ واپس آئے تو آصف الدولہ شاگرد ہوئے اور چندماہ کے بعد انتقال کرگئے بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخ آباد چھوڑ کر یہ لکھنؤ آئے اور جب انکا رنگ یہاں نہ جما تو مرشد آباد چلے گئے اور وہاں سے پھر ۱۲۱۲ھ میں واپس آئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آصف الدولہ نے سوز کی شاگردی اسی وقت اختیار کرلی تھی جب وہ فرخ آباد سے پہلی مرتبہ لکھنؤ پہونچے تھے تو اس کا یقین نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اگر نواب ان کا شاگرد ہو جاتا تو یہ بددل ہوکر مرشد آباد کیوں چلے جاتے،

میرزا علی لطف نے اپنے تذکرۂ گلشن ہند میں جو اُس عہد کا نہایت مستند تذکرہ ہے نہ سوز کے تذکرہ میں آصف الدولہ کے استاد

ہونے کا ذکر کیا ہے نہ آصف الدولہ کے بیان میں سوز کے شاگرد ہونے کا۔ انھوں نے سوز کے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے کہ شاہ عالم کے اٹھارویں سنہ جلوس میں لباس فقر اختیار کیا۔ لکھنؤ میں توکل وقناعت کی زندگی بسر کرتے تھے ۱۲۱۳ھ میں مرشدآباد گئے اور اسی سال لکھنؤ واپس آکر انتقال کیا۔ اسی طرح تذکرۂ بزم سخن (عوض علیخاں) میں بھی آصف کی شاگردی کا ذکر نہیں پایا جاتا

الغرض مجھے اسکے ماننے میں تامل ہے کہ آصف الدولہ سوز کے شاگرد تھے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آصف الدولہ ان کے کلام کو پسند کرتا تھا اور انکی شاگردی اختیار کرنے سے قبل اسکا انتقال ہو گیا۔ یا یہ کہ اگر شاگردی کا سلسلہ رہا بھی تو صرف چند دن جو ہونے کے برابر ہے یہ درست ہے کہ اسکا کلام سوز کے رنگ کا ہے اور ممکن ہے اس بنا پر کوئی شخص یہ کہے کہ آصف الدولہ کا سارا کلام سوز ہی کا کلام ہے اور اسی لیے اب سوز کا کلام بہت کم نظر آتا ہے لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کیونکہ سوز نے جب کہا ہمیشہ سہل زمینوں میں اور مشکل ردیف وقوافی اختیار ہی نہیں کیے۔ برخلاف اسکے آصف الدولہ کے یہاں ایسی ایسی مشکل زمینیں نظر آتی ہیں کہ شاید ہی کسی اور شاعر کے کلام میں نظر آئیں۔ اور میرے نزدیک یہ اثر تھا مصحفی اور انشاء کی صحبت کا۔

بہر حال آصف الدولہ نے سوز کی شاگردی اختیار کی ہو یا نہ کی ہو یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ قدرت کی طرف سے نہایت پاکیزہ ذوق سخن لے کر آیا تھا اور اس میں سوز یا کسی اور کی صحبت کو دخل نہ تھا۔

آصف الدولہ کی ماں تاریخ اودھ کی وہ مشہور خاتون ہے جسے بہو بیگم کے نام سے آج لکھنؤ کا ہر وثیقہ دار جانتا ہے۔ بہو بیگم سسرال کا لقب تھا ورنہ انکا نام امۃ الزہرا بیگم تھا اور موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں شوستری کی بیٹی تھیں۔ موتمن الدولہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانے میں میر آتش کی خدمت پر مامور تھے اور بادشاہ نے ان کی لڑکی امۃ الزہرا بیگم کو اپنی بیٹی بنایا تھا اور شجاع الدولہ کے ساتھ بیاہ دیا تھا امۃ الزہرا بیگم کا نشو ونما محمد شاہ کے اس دور میں ہوا تھا جب ہاں کے ذرہ ذرہ سے رنگینی وشاعری ابلتی تھی اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس ماحول سے متاثر نہ ہوئی ہوں اور ان کے بیٹے آصف الدولہ میں یہ اثر منتقل نہ ہوا ہو

آصف الدولہ کی شاعری کی عمر کیا تھی یا یہ کہ کس عمر میں انھوں نے شاعری کی ابتدا کی اسکے متعلق تاریخیں اور تذکرے ساکت ہیں لیکن کلام کی کثرت کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ شوق انھیں عنفوان شباب ہی سے شروع ہو گیا ہوگا

اُن کا جو قلمی کلیات میری نظر سے گزرا ہے بڑی تقطیع کے سیکڑوں صفحات کو محیط ہے اور تمام اصناف سخن اس میں پائے جاتے ہیں سب سے پہلے تقریبًا ایک ہزار سے زیادہ اشعار کی مثنوی، حمد اور نعت ومنقبت میں ہے، اس کے بعد چوبیس پچیس غزلیں فارسی کی ہیں اور مختلف اساتذہ فارسی واردو کی غزلوں پر تضمینیں۔ جن شعرا کی غزلوں کی تضمین کی ہے ان میں خاص خاص یہ ہیں میلی، سعدی، نظیری حافظ، سودا، سوز، احسن، قہر، جرأت، درد، مصحفی، ضیاء، اور سوزاں[1]،

[1] تخلص تھا نواب احمد علی خاں شوکت جنگ کا جو نواب افتخار الدولہ مرزا علی خاں کا بیٹا اور نواب سالار جنگ کا بھتیجا تھا

اس کے بعد ایک نظم مسلسل "مثنوی حضور" کے نام سے ۲۶ اشعار کی ہے جس میں کسی لشکر کا حال بیان کیا گیا ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے

آصف اک جی میں آئی ہے یہ چھل
لکھیے لشکر کا حال جستہ و رُکل

ایک مثنوی مرزا وزیر علی خاں بہادر کی شادی پر ہے جس کو انھوں نے اپنا بیٹا بنایا تھا اور دوسری مختصر مثنوی وزیر باغ کی تعریف میں ہے۔ ایک حصہ ہزل و ہجو کا بھی ہے جس میں میر بجھو، میر بہتوا اور کریلا بھانڈ کا خاکہ ایسے فحش الفاظ میں اڑایا گیا ہے کہ ان کو کوئی سنجیدہ شخص پڑھ نہیں سکتا۔

کریلا کی ہجو کے چند اشعار جو بہت سنجیدہ ہیں نمونتاً ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

نقل طرفہ ہے اک کریلا کی آئی بے اختیار جس پہ ہنسی
یاک ساون کی رات اندھیاری جا پڑا اپنی ماں پہ یکبارگی
ٹانگیں لیں اس چڑیل کی جو اٹھا بولی وہ تجھ کو خیر ہے بیٹا
تب وہ ماں کا فلانا یوں بولا میں جو تیری ازار کو کھولا

نہ بگڑ مجھ سے میں سنورتا ہوں
باپ اپنے کی نقل کرتا ہوں

خیر یہ ہزل و ہجو تو کوئی ایسی چیز نہیں جس پر حیرت کی جائے کیونکہ آصف الدولہ کی عمر ہی اس قسم کی بیہودگیوں میں صرف ہوئی لیکن تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب اس کے بعد غزلیات کا حصہ سامنے آتا ہے کہ شروع سے لیکر آخر تک سلاست و روانی کے سوا اور کچھ ہی نہیں

فارسی غزلیں کم ہیں لیکن جس رنگ کی ہیں اس کا حال ذیل کے اشعار سے واضح ہوگا۔

بیوستہ کسے کہ کامران است آں آصفِ خسروِ زمان ست
دل بُردن و باز روند ادن ایں رسم کدام دلستان ست

تاثیرِ آہ بالبِ افغاں رسید و ماند دستِ جنوں بچاک گریباں رسید و ماند

تضمینوں کے لیے جن اساتذہ اور ان کی جن غزلوں کا انتخاب کیا ہے اس سے تو خیر آصف الدولہ کی پاکیزگی ذوق ظاہر ہوتی ہی ہے لیکن تضمینیں جس خوبصورتی سے کی ہیں ان کی داد نہیں دی جا سکتی۔

میلی کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو۔

بتیرا چاہا دل سے بھلاوں ٹک اسکی یاد　　جیوں جیوں خیال کم کیا الفت ہوئی زیاد
جوں راہ میں دیکھا اسے کرکے دل کو شاد　　گفتم بیا بوعدہ وفا کن جواب داد
خوش بر فریب وعدۂ ما دل نہادۂ

سعدی کے ایک شعر پر فارسی کی تضمین دیکھیے:-

صد حیف بر ز خم خود کشودیم　　بر پائے تو روئے عجز سودیم
بیجانہ چنیں وفا نمودیم　　آخر من و تو نہ دوست بودیم
عہدِ تو شکست و من ہمانم

حافظ کی غزل پر تضمین کی ہے، اس کے ایک شعر پر فارسی کے مصرعے ملاحظہ ہوں:-

اگرچہ پیشِ تو مجنونِ بیخود و رندم　　مزن بغفلت من طعنہ ناسزا بیہم
خوشم ز بیخودی خویشتن کہ ای ہمدم　　سحر کرشمۂ وصلش بخواب می دیدم
زہے مراتب خوابیکہ بہ ز بیداریست

حافظ کی ایک اور غزل پر تضمین کی ہے ایک شعر کے مصرعے ملاحظہ ہوں:-

چہ گویم از من احوال خاک گردیدن　　سر از جفائے تو اے جان من نہ پیچیدن
عجب ست ز من سرگزشت پرسیدن　　ز نقش چہرۂ عاشق ہمی تواں دیدن
کہ ساکنانِ درِ دوست خاکسارانند

سوز کی بہت مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے،

مرا جان جاتا ہے سنبھالو!　　کلیجہ میں کانٹا لگا ہے نکالو!

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے

کہو ایک بندہ تمہارا مرے ہے　　اسے جان کندن سے چلکر بچالو

آصف الدولہ نے پوری غزل تضمین کی ہے لیکن تذکرۂ بالا دو شعروں پر جو گرہیں لگائی ہیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں

ارے مجھسے اُو دوستی کرنے والو　　کسی سے مرے درد دل کی دوا لو
کسی طرح اب کی مجھے تم بچالو　　مرا جان جاتا ہے یارو سنبھالو
کلیجہ میں کانٹا لگا ہے نکالو

کہو کوئی جی تم پہ صدقے کرے ہے ۔۔۔ کہو کوئی تمہارا ہی دم بس بھرے ہے
کہو کوئی مرنے پہ دل کو دھرے ہے ۔۔۔ کہو ایک بندہ تمہارا مرے ہے

اسے جان کندن سے چلکے بچا لو

تضمین کی خوبی یہ ہے کہ وہ اصل شعر کے ساتھ مل کر بالکل ایک چیز ہو جائے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ آصف الدولہ اسمیں کتنا کامیاب ہوا ہے۔ سادگی و بے تکلفی، روانی و بیساختگی آصف کے ہر کلام میں نظر آتی ہے چند رباعیاں ملاحظہ ہوں :۔

✓ جب کوئی کسی کو یار کلپاوے گا ۔۔۔ یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا
اس دور مکافات میں سُن اے غافل ۔۔۔ بیداد کرے گا آج کل پاوے گا

کیا تجھ سے کہوں کہ کسطرح گزرے ہے ۔۔۔ کیا دوں میں پتہ کہ جسطرح گزرے ہے
بالفرض اگر کہا تو پھر کیا حاصل ۔۔۔ گزرے ہے خیر جسطرح گزرے ہے

آصف جو گلی صنم کی ہم آتے ہیں ۔۔۔ ظلم و ستم و جور اور آفاتیں ہیں
ہر شب یہی عہد ہے کہ جانا چھوڑیں ۔۔۔ پر تحفگی یہ کہ روز پھر جاتے ہیں

یوں جی میں تمہارے ہو سمائی تو خیر ۔۔۔ ہم جانتے ہیں آپ ہی یہاں کیجے سیر
خلقت ساری پڑی بھرے میں ہی جائے ۔۔۔ اللہ رے تیرا بُغض! اللہ رے بیر

فرقت کا ستم تو مجھ سے سہنا معلوم ۔۔۔ جو گزرے ہے دل پہ تجھسے کہنا معلوم
وابستہ ہے تجھسے زندگانی اپنی ۔۔۔ گر تو ہی چلا تو جی کا رہنا معلوم

ہر روز شب ہجر کا وسواس رہے ۔۔۔ ہر رات کو روز ہجر کا پاس رہے
یہ بے چینی تو اپنی جاتی ہے ابھی ۔۔۔ آصف کنے سے نہ جائے تو یاس رہے

ذیل کی دو رباعیاں کس قیامت کی لکھ گیا ہے:۔

ہر لحظہ تری گلی میں رو جاتا ہوں　　صبر و دل و دین و ہوش کھو جاتا ہوں
دیکھوں ہوں ادھر ادھر کو جب کوئی نہیں　　چپکے سے کہیں بیٹھ کے رو جاتا ہوں

آصف مرا عشق جوں جوں مشہور ہوا　　توں توں بت مغرور وہ مغرور ہوا
میں کاہے کو چاہتا تھا رسوا ہونا　　پر کیا کروں دل کے ہاتھوں مجبور ہوا

آپ نے دیکھا کہ رباعیوں میں کتنا پختہ رنگ تغزل رچا ہوا ہے اور زبان کی خامی بعض بعض جگہ کتنا لطف دیجاتی ہو اگر انہیں اشعار کو اُٹھا کر آپ ان کی غزلوں میں شامل کر دیں تو کوئی فرق محسوس نہ ہوگا

جیسا کہ ہم نے ابھی ظاہر کیا، آصف کی زبان نہایت سلیس، انداز بیان حد درجہ سادہ، جذبات ہلکے قسم کے عاشقانہ ہیں اور اس کا رنگ شاعری "گفتگو کرنے" کی حد سے آگے نہیں بڑھتا اور ظاہر ہے کہ ایسے شاعر کے کلام میں دقت مضامین یا بلندی مفہوم ڈھونڈھنا بیکار ہے لیکن ردیف و قوافی کے سلسلہ میں اس نے اپنی دشوار پسند طبیعت کے سارے حوصلے نکال لیے چنانچہ بعض ردیف و قوافی ملاحظہ ہوں جواب تلخ، حساب تلخ، لیکن شعر میں وہی سادگی ہے:۔

کم ہووے یا الٰہی کہیں یا یہ مرد ہے　　لگتا ہے اب تو نالۂ دل بےحساب تلخ

صنم یا قسمت، عجم یا قسمت، اس زمین کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

کوچہ گردی سے اسے شوق ہو لیکن گھر سے　　اس طرف کو نہیں رکھتا وہ قدم یا قسمت

گفتگو آتش کا پرکالہ، روبرو آتش کا پرکالہ، اس سخت و سنگین زمین میں کاوش دیکھیے:۔

عجب شوخی، عجب گرمی عجائب حسن ہی واللہ　　نہ آتش تو، نہ شعلہ تو، نہ تو آتش کا پرکالہ

بادام لذیذ، ناکام لذیذ، اس زمین کا ایک شعر ہے:۔

دوستو عشق میں کچھ چیز نہیں بھاتے ہے　　ورنہ کس کو نہ لگے خواب اور آرام لذیذ

اسی ردیف میں بحر و قافیہ بدل کر لکھتے ہیں:۔

جو غمزدہ ہو ترے عشق کا وہی جانے　　کہ کیا مزہ کی ہے غم کی بھی داستان لذیذ

اسی طرح کی سنگلاخ زمینیں خدا جانے کتنی اس نے پیدا کیں اور کسی ایک میں بھی اپنا رنگ نہیں چھوڑا غزلوں کا حصہ کئی سو صفحات پر حاوی ہے اور مشکل سے کسی غزل میں دو چار شعر ایسے ہونگے جو انتخاب میں نہ آسکیں

یقیناً آصف کے کلام میں درد کے جذبات کی گہرائی یا میر کے سوز و گداز کی برشتگی نہیں پائی جاتی، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ حالات محبت اور واردات الفت سے وہ کسی جگہ نہیں ہٹا۔ وہی سہل و سرسری اظہار الفت وہی سادہ بیان ہجران اور وہی تمام باتیں جو عام طور پر دنیائے محبت میں شکر و شکوہ کے طور پر بیان کی جاتی ہیں آصف کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

محبوب کے سامنے حرف مدعا لب تک نہ آسکنے کا ذکر تمام شعراء نے کیا ہے چنانچہ میر کا یہ شعر مشہور ہے

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا　　　کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

آصف نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

سب مجھی سے کہتے ہیں تو اسے مطلب عرض کر　　　جب زباں یاری نہ دے تو عرض مطلب کیا کروں

اس غزل کا مقطع ملاحظہ ہو:-

جان و دل تیار کر رکھوں نثار اس کا وے　　　بے خبر آصف وہ آجاوے ادھر جب کیا کروں

کس قدر لطیف جذبہ ہے اور کتنے پر لطف پیرایہ میں ظاہر کیا ہے،

غیر کے ساتھ محبوب کو دیکھنا عاشق کے لیے ستم ہے لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اسکو دیکھے نہیں آصف اس کشمکش کو یوں ظاہر کرتے ہیں

جو دیکھوں غیر سے باہم تو غیرت مارے ڈالے ہے　　　اگر آنکھیں چرا تا ہوں تو الفت مارے ڈالے ہے

اس غزل کے مقطع میں شدائد محبت سے گھبرا کر بیتاب ہو جانے کی کیفیت ملاحظہ کیجیے:-

کہاں کی یہ بلا پیچھے پڑی یارب کہاں بھاگوں　　　مجھے تو رات دن یارو محبت مارے ڈالے ہے

ہجر کی تنہائی بہت کٹھن ہوتی ہے لیکن جب محبوب آکر چلا جائے تو یہ تنہائی سے بھی زیادہ کچھ اور رجنیز ہو جاتی ہے، اور اس خلا کو محسوس کر کے جو بیتابی پیدا ہوتی ہے اسکی تکلیف کی کوئی انتہا نہیں، آصف اس کیفیت کو کس قدر سادہ لیکن دلدوز انداز میں ظاہر کرتا ہے سے

کیا حقیقت پوچھتا ہے میری تنہائی کی تو　　　جب کہ میرے پاس سے پیارے ترا جانا ہوا

محبت کی فتادگیاں جن میں کچھ کچھ تمنا بھی شامل ہو قیامت کی ہوتی ہیں اسکی چند مثالیں ملاحظہ ہوں!

کوچے سے اپنے تو نے مجھ کو عبث اٹھایا　　　سب تو چلے گئے تھے اک میں ہی رہ گیا تھا

کیسا رو رو کے وہ شب کرتا تھا مذکور ترا　　　وہی بیمار ترا خستہ و رنجور ترا

ہم نے قصہ بہت کہا دل کا　　　نہ سنا تم نے ماجرا دل کا

یہی حسرت ہیں اے جان رہی مرگ تلک — ایک دن تم نے نہ کی ہنس کے کبھی پیار کی بات

معشوق کی اداؤں کا ذکر ہلکی سی کیفیت محاکات کے ساتھ، تغزل کی جان ہے، آصف کے یہاں اس کی بھی بعض مثالیں بہت پاکیزہ ملتی ہیں:-

میں پوچھا اس سے کچھ تجھ میں وفا ہے — تو مڑ کر، دیکھ کر، ہنس کر کہا "ہے"

مرے احوال کو سُن سُن کے یہ بولا آخر — خوش نہیں آتی ہے آصف مجھے تکرار کی بات

تشبیہ واستعارہ سے ان کا کلام پاک ہے لیکن اگر کبھی کوئی شعر ایسا نکل گیا ہے تو بھی لطف سے خالی نہیں مثلاً ؎

عجب عالم نظر آتا ہے معشوقوں کے رونے میں — ذرا دیکھو تو آصف شمع کے آنسو ڈھلکنے کو

فارسی ترکیبیں ان کے کلام میں کہیں نہیں پائی جاتیں اگر کبھی کوئی ترکیب استعمال بھی کی ہے تو نہایت ہی ٹھیک وصاف مثلاً ؎

ہوا ہے جب سے تو اوجھل ہماری نظروں سے — بسانِ خانۂ غارت زدہ سدا ہیں باز

چونکہ سادگی ان کے ذوق کی خصوصیت ہے اس لیے چھوٹی بحروں میں ان کی کامیابی عجیب ہوتی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہائے کیا آصف کو وہ دُکھ دے گیا — لے گیا دل لے گیا دل لے گیا

کھل گیا باراں برس کر لاکھ بار — پر یہ اشکِ چشم نت برسے گیا

اب کوئی لمحہ میں آتا ہے وہ یار — دل سے سارا دن یہی کہتے گیا

مومن کی غزل "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" دنیائے تغزل کی نہایت ہی مشہور و مقبول چیز ہے اور اس میں کلام نہیں کہ مشکل ہی سے دوچار چیزیں کلام اساتذہ میں ایسی نظر آئیں گی، آصف الدولہ نے بھی اسی بحر میں لیکن بہ تبدیل ردیف و قافیہ ایک غزل لکھی ہے اسے بھی دیکھ لیجئے

مرے یار کیسی ادا ہے یہ، کہ چمن میں جس گھڑی آ گئے — کبھی گل کو آکے ہنسا گئے، کبھی بلبلوں کو رُلا گئے

مرے آگے سے جو گزر گئے، تو پلک سے لاگی نہ پھر پلک — وہ جو ضبط کر کے رہا تھا میں، مرے اشک آکے بہا گئے

جو گزرتی ہے مجھے رات دن، ترے اشتیاق وصال میں — سو کہوں گا حالتِ ہجر سب، کبھی روبرو جو تم آ گئے

نہ وصال ہی میں قرار تھا، نہ فراق ہی میں قرار ہے — وہ وصال کیسا دکھلا گئے، یہ فراق کیسا لگا گئے

یہ جو کہتے ہو کہ بتا سبب، ترے لگتے کیوں نہیں لب سے لب — اُسی روز سے مجھے بڑ گئی، جو تم اپنی باتیں سنا گئے

یہ پیام دو مجھ وفا صبا، کہ خرابی اور تو کیا کہوں — رہ جو جائے امن تھا اک دل، غم و درد اس میں بسا گئے

مجھے آصف آہ یہ کیا ہوا کہ مدام نالۂ و آہ ہے — میاں یہ فسانۂ عشق ہے ترا بھید ہم بھی تو پا گئے

آپ دیکھیں گے کہ کلام آصف میں بہت سے وہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو اس وقت متروک ہیں مثلاً کنے (بمعنی قریب) تئیں۔ کوئی دکئی، میاں، تلک، جیدھر، ایدھر، وغیرہ لیکن اس نوع کے الفاظ اس عہد کے تمام شعراء میں پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ میر، درد، سودا اور سوز سب نے انھیں استعمال کیا ہے

اخیر میں ان کے چند منتخب اشعار درج کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں لیکن میرا یہ انتخاب کسی مکمل استقصا کا نتیجہ نہیں ہے اس لیے یہ سمجھ لینا درست نہ ہوگا کہ آصف کے کلیات میں اتنے ہی شعر کام کے ہیں، حالانکہ اگر صرف اتنے ہوں تو بھی بہت ہیں اس انتخاب میں وہ اشعار شامل نہیں ہیں جو اصل مضمون میں آگئے ہیں

یہ نہ آنے کے بہانے ہیں سبھی ورنہ میاں ۔۔۔ اتنا تو گھر سے مرے کچھ نہیں گھر دور ترا

قصۂ فرہاد و مجنوں رات دن پڑھتے تھے ہم ۔۔۔ سو تو وہ ماضی پڑا، اب اپنا افسانہ ہوا
رات دن یہ سوچ رہتا ہے مرے دل کے تئیں ۔۔۔ اے خدا یاں سے وہ جا کر کس کا ہمخانہ ہوا

قاصد تو لیے جاتا ہے پیغام ہمارا ۔۔۔ پر ڈرتے ہوئے لیجیو واں نام ہمارا
آغاز نے تو عشق کے یہ حال دکھایا ۔۔۔ اب دیکھیو کیا ہووے گا انجام ہمارا

نامہ ترا میں لے کر منھ دیکھ رہ گیا تھا ۔۔۔ کیا جانیے کہ قاصد کیا تجھ کو کہہ گیا تھا
کوچہ سے اپنے تو نے مجھ کو عبث اٹھایا ۔۔۔ سب تو چلے گئے تھے اک میں ہی رہ گیا تھا
کچھ بھی نہ سوجھتا تھا اُس بن مجھے تو آصف ۔۔۔ جس روز ہائے یاں سے وہ رشک مہ گیا تھا

اس ادا سے مجھے سلام کیا ۔۔۔ ایک ہی آن میں غلام کیا
یارو اس گلبدن کے تئیں ہمنے ۔۔۔ کل صبا سے بھی کچھ پیام کیا
قصۂ جاں گداز اے آصف ۔۔۔ تھوڑی سی بات میں تمام کیا

درد دل ہے تو یار کے باعث
غم ہے تو اس نگار کے باعث
ایک کروٹ سے سو نہیں سکتا
اس دلِ بیقرار کے باعث
چھاتی بادِ صبا نے کیا کیا خاک
میری مشتِ غبار کے باعث
دم رکا جائے ہے مرا آصفؔ
گریۂ بیقرار کے باعث

رو رہا ہے جیسے یہ دلِ زار و نزار آج
ایسا تو روتے دیکھا نہ ابرِ بہار آج
آصفؔ کو منہ لگایا ہے آج اُس نے ظاہرا
جاتا ہے دوڑ دوڑ جو واں بار بار آج

دردِ دل اپنا میں اس شوخ سے کہتا لیکن
جو چھپانے میں مزہ ہے نہیں اظہار کے بیچ
گریہ نالے ہیں اے دل تو تری شورش سے
رہنے پاویں گے نہ ہم کوچۂ دلدار کے بیچ

کوئی بات تو ہماری بھی مان اب خدا سے ڈر
کب تک دیا کرے گا ہمیں تو جواب تلخ
پھرتا ہوں کوہ و دشت میں روتا میں زار زار
تجھ بن ہوا ہے گھر مجھے خانہ خراب تلخ
آصفؔ کو عشق ہے وہ نہ مانے گا ایک بات
کیوں اس سے زیست کرتے ہو اے شیخ و شاب تلخ

بڑا چرچا پڑے گا اُس کا آصفؔ
ہر اک بیدرد کو تو مت سُنا درد

ہم نہ سمجھتے تھے یار آصفِ شوریدہ بھی
عاشقوں میں اُس کے ہے عاشقِ فیروزمند

گزری جو تیرے غم میں دلِ نیم جان پر
کچھ پوچھ مت میں لا نہیں سکتا زبان پر
آصف کو جس نے عشق میں دیکھا ترے کہا
آتا ہے رحم میرے تئیں اِس جوان پر

دل آصف پہ کوئی نہ رکھیو ہاتھ
جل رہا ہے وہ خاکسار ہنوز

یہ تو ری بات کا کرنا لگا کے ہاتھ پہ ہاتھ — رہے گا حشر تلک دوستی کی دستاویز

جو نالہ تھمتا ہے تو گریہ جوش کرتا ہے — غرض چھپائے سے چھپتا نہیں ہے عشق کا راز

کل تلک ہوتی تھی کچھ نبض میں گرمی محسوس — آج تو نبض ہی ہوتی نہیں اپنی محسوس
بات جو دل میں کھٹکتی تھی، ہوئی ظاہر آج — موت اس شخص کی مدت سے ہمیں تھی محسوس

نہ بیٹھو یارو کوئی مجھ سے بیقرار کے پاس — کہ خوار ہے جو کوئی بیٹھے بیقرار کے پاس
کسی کے پاس نہ تو دل سے بیٹھ اے ظالم — مضائقہ نہیں یوں بیٹھ تو ہزار کے پاس
اُٹھا کے پہنچا ہے کیا کیا خرابیاں تجھ تک — ذرا تو بیٹھ کبھو اپنے سوگوار کے پاس
یہ کون دوست ہے میرا جو تجھ کو منع کیا — نہ بیٹھ آصفِ غم خوار و غم گُسار کے پاس

ناکردں جفا و جور سہے اُس کے لیک آہ — جاتی نہیں ہے دل سے مرے چاہ کیا کروں

اتنا تو کیا کہ اس کا اُدھر کو گزر نہیں — اے آہ! تجھ میں اتنا بھی ظالم اثر نہیں
رکھتے ہیں دو جہان کے اسرار کی خبر — گو ہم کو اُس کے عشق میں اپنی خبر نہیں
ہر دم کی آہِ سرد، رُخِ زرد و چشمِ تر — آصفؔ یہ کیا ہے تیرے تئیں عشق اگر نہیں

ناصح ترے کہے سے نہ اس سے ملا کروں — لیکن جو دل ستائے تو پھر اس کو کیا کروں

کب تلک تیرے جدا رہنے کا غم کھاتے رہیں — کب تلک باتوں میں اپنے دل کو بہلاتے رہیں
گو برا مانے نہیں تو، اپنا اب یہ دھیان ہے — دل ترے کوچہ میں چھوڑیں اور ہم جاتے رہیں
تیرے رونے سے اب آصفؔ لوگوں کو تکلیف ہے — بس نہ رو، کب تک بچارے کپڑے سکھلاتے رہیں

ہمنشیں پوچھے ہے کیا افسانہ میرے غم کا ہائے
غور کر ٹک، دیکھ میں خود صورت افسانہ ہوں

جس سے میں اپنا حال کہا اس نے یوں کہا
تو نے تو مجھ سے حال کہا میں کہاں کہوں

مرتا ہوں اب، تو جان ہی جاتی ہے دوستو!
لے آؤ اس کو جلد کوئی تو، مناں منوں

چشم عاشق میں یار و خواب کہاں
دل عاشق میں صبر و تاب کہاں

تجھ سے کیونکر کہے وہ اپنا عشق
آصف اتنا وہ بے حجاب کہاں

کیا کریں کہنے میں ناصح یہ دل زار نہیں
ورنہ ترک اس سے تو اتنا کوئی دشوار نہیں

یوں تو دیوانہ ہوں کیا کیا نہیں بکتا رہتا
سامنے اس کے مگر طاقت گفتار نہیں

آصف اس وقت میاں کچھ متردد ہے تو
آج سچ بولیو گھر میں ترے مہمان ہے کون

یہ ساری شیخیاں ہیں سن لو یارو، سامنے ہوکر
کرے گر بات کوئی اس ستمگر سے تو ہم جانیں

فرہاد تھا یا مجنوں، پھر اچھا زمانہ تھا
اب لطف نہیں آصف کچھ الفت خوباں میں

نہ جی چاہے تھا جسکے پاس سے اکدم سرکنے کو
سو اسکے در پہ اب رخصت نہیں ہے سر ٹپکنے کو

جاتا تو ہوں ہزار خرابی سے واں تلک
کیا جانیے وہ گھر میں بھی ہو اپنے یا نہ ہو

وہ ہوا حال سے مرے آگاہ
میرے حق میں تو کچھ نہ ہوئی واللہ

دل تو جاتا ہے اسکے کوچہ میں
جا مری جان، جا خدا ہمراہ

عشق کر کے تو یہ کیا آصف ہے پر اس کا خدا کے ہاتھ نباہ

کیا فاش کر دں غم نہاں کو پایاں نہیں میری داستاں کو
آصف ابھی میں نے کیا کہا تھا تک بند نہیں مری زباں کو

جی نکل جائے گا ظالم مرا اب جانے سے یاں نہ آنا ہی بھلا تھا ترے اس آنے سے

ملنے کو تجھ سے دل تو مرا بے قرار ہے تو آ کے مل نہ مل یہ ترا اختیار ہے
تم زخم دل کی میرے خبر پوچھتے ہو کیا تیر نگاہ دل کے تو اب آر پار ہے
یہ کچھ تو حال تیرے دِوانے کا اب ہوا جیدھر کو جائیے، آہ، اسے ارمار ہے

سبھوں سے بولتا ہے پر مجھی سے نہیں کچھ بولتا کیا جانے کیا ہے

کیا سبب آصف گئے جونہی، چلے آئے وونہی آج کیوں صحبت میں اسکے یار کچھ تم کم رہے

کہتے ہیں سبھی گئے گلی سے اک آصفِ نوحہ گر رہا ہے
جب تب اسے دیکھتا ہوں در پر لے شام سے تا سحر رہا ہے

جان کیوں کھاتے ہو گھر بھی جاؤ گے ناصحو! کب تک مجھے سمجھاؤ گے

لینا خبر تو اس کی جس کا ہے نام آصف مدت سے وہ گلی میں تیری رہا کرے ہے

اور آخر کار آج میں نے اس کی خبر لے ہی لی گو وہ کبھی میری گلی میں آکر نہیں رہا

نیاز

لکھنؤ کے موجودہ لکھنوی شعراء

انور حسین **آرزو** (عمر تقریباً ۶۰ سال)
دو یہ گھٹتے ہوئے نظر آئے
کیوں جی پھر تم ہمارے گھر آئے

محمد علی خاں **آزاد** (عمر تقریباً ۵۰ سال)
بال بھی تم سے مری لاش پہ کھولے نہ گئے
بے اثر تھا اثر خواب پریشاں دیکھو

حکیم سید علی **آشفتہ** (عمر تقریباً ۴۴ سال)
بڑے تم بوجھنے والے بنے ہو
جبھی جانیں بتاؤ دل میں کیا ہے

مہدی حسن **احسن** (عمر تقریباً ۶۵ سال)
اک جلوۂ روشن ہے مری نزع کا عالم
میں شعلۂ آخر ہوں چراغ سحری کا

مرزا جعفر علی خاں **اثر** (عمر تقریباً ۴۵ سال)
جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں
سلگیے پھول ترے بستر کے

پیارے نواب **برق** (عمر تقریباً ۴۰ سال)
اب تو اکثر کوئی راتوں کو کہا کرتا ہے
یہ صدا کس کی چلی آتی ہے ویرانے سے

سید حسین **بیتاب** (عمر تقریباً ۶۰ سال)
لینا ہے آج مشق تصور سے ایک کام
تصویر کھینچنا ہے تری جلوہ گاہ کی

نواب بنے صاحب **سحر** (عمر تقریباً ۴۲ سال)
نہ سنو میری داستان طویل
کہ یہ حسرت بھرا فسانہ ہے

سراج الحسن **سراج** (عمر تقریباً ۴۰ سال)
آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

ننھو میاں **شفیق** (عمر تقریباً ۷۵ سال)
اے شفیق اپنے کو بھر رشک سکندر سمجھوں
آئنہ دل کا اگر اُن کی نظر تک پہونچے

ابوالفضل **شمس** (عمر تقریباً ۵۰ سال)
بروز حشر شہیدوں کو ہے بڑا دعویٰ
مزہ تو ہو جو نہ ثابت ہو جرم قاتل پر

علی نقی **صفی** (عمر تقریباً ۶۰ سال)
دل سے نزدیک ہیں آنکھوں سے بہت دور نہیں
مگر اس پر بھی ملاقات انھیں منظور نہیں

الطاف حسین **عالم** (عمر تقریباً ۵۲ سال)
سب ہیں آمادہ طرفداری پر اسکی خبر ہیں
ایسا مجمع اور میرا ہم زباں کوئی نہیں

مرزا محمد ہادی **عزیز** (عمر تقریباً ۵۵ سال)
اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

خواجہ عبدالرؤف **عشرت** (عمر تقریباً ۷۰ سال)
پانی پانی ہوئے غیرت سے پریرو غنچے
بے بلائے ہوئے شبنم جو چمن میں آئی

حکیم منے آغا **فاضل** (عمر تقریباً ۷۵ سال)
اُن کی ہنسی پہ آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
اب دل خوشی کا بھی متحمل نہیں رہا

قدیر احمد **قمر** (عمر تقریباً ۴۲ سال)
اب سر نہیں اُٹھنے کا سنگ در جاناں سے
میرا یہی قبلہ ہے میرا یہی کعبہ ہے

چھبن صاحب **گوہر** (عمر تقریباً ۴۵ سال)
کوئی پوچھے مرنیوالا کون تھا کیا نام تھا
یہ نہ کہہ دینا کہ میرا عاشق ناکام تھا

کاظم حسین **محشر** (عمر تقریباً ۷۰ سال)
اے چارہ ساز اتنی ہی مدت ہے زیست کی
جب تک کہ درد عشق ہمارے جگر میں ہے

جعفر حسین **منظر** (عمر تقریباً ۴۲ سال)
حسب منشا دل پُرشوق کی باتوں کا جواب
دے دیا شرم میں ڈوبی ہوئی انگڑائی نے

لکھنؤ کے موجودہ غیر لکھنوی شعراء

عبدالباری آسی میرٹھی (عمر تقریباً ۴۵ سال)	اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھ کو	میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشان ہوں میں
حامد اللہ افسر میرٹھی (عمر تقریباً ۴۴ سال)	رو رو کے انتظار کی گھڑیاں گزار دیں	یہ بھی خطا ہوئی ترے امیدوار سے
محمد حسین اختر موہانی (عمر تقریباً ۴۵ سال)	بہار آنے سے پہلے اک پریشاں خواب دیکھا تھا	کہ جیسے چھٹ رہا ہے فصلِ گل میں آشیاں ہم سے
محمد علی امید امیٹھوی (عمر تقریباً ۶۵ سال)	چار دن کی تھی زندگی لیکن	یہ بھی اُن کی خوشی نہیں، نہ سہی
محمد حسن امین سلونوی (عمر تقریباً ۳۵ سال)	آپ عیسیٰ نفس سہی لیکن	میرے جینے کا کیا سہارا ہے
محمد احمد بیخود موہانی (عمر تقریباً ۴۵ سال)	تری غیرت کو اے نازِ ستمگر کیا ہوا آخر؟	ترے ہوتے ہوئے ممنونِ جورِ آسماں ہوں میں!
علی سکندر جگر مرادآبادی (عمر تقریباً ۴۵ سال)	الٰہی ترکِ محبت بھی کیا محبت ہے	بھلاتے ہیں اُنھیں وہ یاد آئے جاتے ہیں
آل رضا رضا نیوتنوی (عمر تقریباً ۳۵ سال)	چلے تھے ایک نظر تیری بزم دیکھ آئیں	یہاں جو آئے تو بے اختیار بیٹھ گئے
محمد زماں زماں الٰہ آبادی (عمر تقریباً ۵۵ سال)	اے غمِ دوست یہ تو سمجھا دے	کتنا اندوہناک ہونا ہے
شمس الحسن شمس فرخ آبادی (عمر تقریباً ۲۵ سال)	یوں یکایک نظر اُٹھی اُن کی	ہم نے جانا کہ کامیاب ہوئے
محمد عمر شوکت تھانوی (عمر تقریباً ۳۴ سال)	موت برحق تھی مگر کاش نہ آتی شبِ ہجر	یہ تو کہنے کو نہ ہوتا کہ اک ارماں نکلا
نواب علی حسن خاں طاہر فرخ آبادی (عمر تقریباً ۶۰ سال)	اُس کا ہر جلوہ حجابِ ناز سے کچھ کم نہیں	پردہ گرتا جائے ہے جتنا کہ اُٹھتا جائے ہے
مقبول عظیم عرش میرٹھی (عمر تقریباً ۵۵ سال)	اُن کے ہی ہو جائیں گے سب اُن کی صورت دیکھ کر	کون میرا ہم خیال و ہم زباں رہ جائے گا
محمد حسین عرشی لکھیم پوری (عمر تقریباً ۴۰ سال)	کیوں سہارا دے رہی ہے موجِ دریا تو مجھے	لطفِ ساحل سے سوا نظارۂ ساحل میں ہے
واجد علی فرخ بنارسی (عمر تقریباً ۳۵ سال)	وہ آئے بھی تو دید کا موقع کہاں نصیب	ہم سے تو اپنے ہوش میں آیا نہ جائے گا
ظفر مہدی گوہر جائسی (عمر تقریباً ۳۵ سال)	لے دہ تمہارا ایک لفظ موتِ دلِ حزیں سہی	کچھ تو کہو جواب میں ہاں نہ سہی، نہیں سہی
محمد حسین نازش بدایونی (عمر تقریباً ۷۰ سال)	ہوں جادۂ ناکامیٔ اُلفت میں سبک گام	شاید کبھی اس راہ سے امید گزر جائے
نیاز محمد نیاز فتح پوری (عمر تقریباً ۴۵ سال)	گھڑی گھڑی نہ ادھر دیکھیے کہ دل ہے مجھے	ہے اختیار پر اتنا بھی اختیار نہیں
محمد احسن وصل بلگرامی (عمر تقریباً ۵۰ سال)	ہائے وہ بزمِ ناز میں جلوۂ حسنِ خودنما	چہرے پہ اک تمکنت، آنکھ میں کچھ غرور سا
یونس حسین نفیس زید پوری (عمر تقریباً ۴۰ سال)	اب نہ کیجیے گا تو کل قدرِ وفا کیجیے گا	یاد رکھیے کہ کہا تھا کسی سودائی نے

غزلگوئی اور ترقی زبان پر عہد بہ عہد تبصرہ

لفظ "غزل" کے لغوی معنی اس قدر عام و مشہور ہو چکے ہیں کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ جس نے محبت کی ہے اُسے تو خیر جاننا ہی چاہیے لیکن جو اس کوچہ سے نابلد ہے اس کو بھی سماعی یا قیاسی طور پر معلوم ہو گا کہ "محبوب سے باتیں کرنے" کا نام غزل و تغزل ہے یا مغازلہ اگر یہ گفتگو باہمد گر ہو۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ "محبوب سے ایک عاشق کیا باتیں کر سکتا ہے اور ان باتوں کا انداز و لب و لہجہ کیا ہونا چاہیے"

محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اسی احساس و تاثر کے اظہار کا نام شعر ہے، ہم کسی پھول کو دیکھتے ہیں اور اس کے رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے، ہم شفق کی رنگینی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے، ہم قوس قزح کو دیکھتے ہیں اور بے اختیارانہ کلمات تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں یہ بھی شعر ہے، اسی طرح کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر و آثار ہیں وہ سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے اس کو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس اظہار میں ترنم کو قایم رکھا جائے اور اسی ترنم کے پیدا کرنے کے لئے مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اوزان وضع کئے گئے ہیں۔

پھر اگر یہی جذبۂ پسندیدگی افرادِ نوع انسانی میں سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے، لیکن جس محبت کا تعلق غزلگوئی سے ہے وہ مخصوص ہے اس جذبہ سے جو جنسی کشش و خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ محبت ماں، بھائی، اولاد اور اعزہ و احباب سے بھی ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی غزل کا موضوع نہیں اس کا تعلق صرف ایسے فرد سے ہوتا ہے جس سے انسان میں جنسی ہیجان پیدا ہو سکتا ہے بعض احباب کو میں نے کہتے ہوئے سُنا ہے کہ علاوہ اس جنسی محبت کے ایک چیز ذہنی و روحانی محبت بھی ہے جسے وہ "Intellectual love" کہتے ہیں، لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں اور اس کا وجود جنسی کیفیت سے علحدہ میری سمجھ میں نہیں آتا تاہم اگر تھوڑی دیر کیلئے مان لیا جائے کہ اس عنقا کا وجود ممکن ہے تو بھی اس کا غزلگوئی سے کوئی واسطہ نہیں۔

الغرض تغزل کا تعلق میرے نزدیک صرف ان جذبات محبت سے ہے جو اس گوشت پوست کی دنیا میں گوشت پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بظاہر معلوم ہوگا کہ یہ نہایت محدود چیز ہے عاشق نے کہا "میں تم پر جان دیتا ہوں"، معشوق نے کہا "میری بلا سے"۔ چلئے قصہ ختم ہو گیا لیکن اگر آپ اس سلسلہ میں اُن تمام کیفیات وجزئیات پر نگاہ ڈالیں جو اسی ایک خواہش جنسی سے متعلق ہو سکتے ہیں تو آپ کو اس کی وسعت کا اعتراف کرنا پڑیگا۔

جذبات محبت کا تجزیہ کیا جائے تو پہلے دو بڑی بڑی تقسیمیں وہ ہوں گی جن کا نام ہجر و وصال ہے اور پھر ان دونوں کے ماتحت جدا جدا کیفیات و تاثرات نظر آئیں گی۔ مثلاً ہجر کے بیان میں دل کی بیتابی، تمناؤں کا ہجوم، غم والم کی فراوانی، بیچارگی و بے بسی، جنون و دیوانگی، حیرانی و مجبوری، بیماری، نزع اور موت سبھی کچھ شامل ہے۔ اسی طرح وصل میں، کامرانی و سرمستی، نشاط و ازخود رفتگی، شکرِ وصل و شکوۂ ہجراں، عدو کی بُرائی، اپنی تعریف، اور پھر فراق کے اندیشہ سے آیندہ کے لئے پیش بندیاں وغیرہ سیکڑوں باتیں شامل ہیں۔ لیکن یہ درست ہے کہ وصل کا میدان اتنا زیادہ وسیع نہیں ہے اور اسی لئے غزلگوئی کی وسعتیں زیادہ تر ہجر و فراق کی دنیا سے متعلق ہوا کرتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک اور موضوع محبوب کے حسن وجمال کی تعریف بھی ہے جسے آپ چارہ و تدبیر کے سلسلہ میں شمار کر سکتے ہیں یا پھر انھیں ہجر و وصال کی مختلف کیفیات میں کسی کیفیت سے بہرحال غزل کا دائرہ دنیائے شاعری میں ایک لحاظ سے بہت محدود ہے اور دوسری حیثیت سے حد درجہ وسیع۔ وہ اسلئے کہ شاعر محبت جنسی کے داعیات سے علٰحدہ ہو کر کوئی اور میدان اختیار نہیں کر سکتا اور یہ اس لئے کہ اس محبت کی کیفیات گو محدود ہوں، لیکن اُنکے اظہار کے طریقے غیر محدود ہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ جنھوں نے "عشق حقیقی" کی مہمل اصطلاح وضع کی ہے یا جو شاعری میں تصوف کو شامل کر کے صنم اور صمد کا امتیاز اُٹھا ڈالنے پر مُصر ہیں، انھیں مجھ سے اختلاف ہو لیکن میری حقیقی رائے یہی ہے کہ "حقیقی عشق" بالکل بے معنی چیز ہے اور غزلگوئی سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ تغزل میں اصل چیز صرف جذبات نگاری ہے اور ان کے مقابلہ میں الفاظ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کیونکہ جذبات و تاثرات کے اظہار کا ذریعہ صرف الفاظ ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ الفاظ کے تغیر و تبدل یا اُن کے حُسن وقبح کا کوئی اثر مفہوم و مدعا پر نہ پڑے۔ اندازِ بیان ہی ایک وہ چیز ہے جس سے مخاطب کو متاثر کیا جاتا ہے اور گفتگو کا لب و لہجہ پیدا کرنا مخصوص الفاظ کی مخصوص ترکیب ہی سے ممکن ہے۔ علاوہ اس کے جذبات کی بلندی و سخافت سب الفاظ و انداز بیان پر منحصر ہے۔

مثلاً خواہش وصل کے مسئلہ کو لیجئے جو دنیائے شاعری کا نہایت پیش پا اُفتادہ مسئلہ ہے، اور مختلف شعرا کے مختلف انداز بیان پر غور کیجئے:۔

ایک کہتا ہے:۔　اتنا بھی منھ چھپانا کچھ خوشنما نہیں ہے

دوسرا کہتا ہے:۔　آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب

بلکہ اس سے بھی زیادہ کھُلم کھُلا یوں کہہ اُٹھتا ہے:۔　دو بوسے لونگا جانِ من ایک اِس طرف ایک اُس طرف

اگر یہ فرق مراتب اندازِ بیان سے پیدا نہیں ہوا تو پھر کس چیز کا کرشمہ ہے۔

انقلاب زمانہ اور بے ثباتی عالم کا بیان تقریباً تمام شعراء نے کیا ہے لیکن اندازِ بیان کے تفاوت سے اثر و مفہوم کے ارتقار کا فرق ملاحظہ کیجئے: مصحفی کہتا ہے:۔

سایہ میں یاں پلے تھے جو ناز و نعم کے ساتھ ✓ کیسی اب انکی دھوپ میں جلتی ہیں تربتیں

حاتم کا پاکیزہ انداز ملاحظہ ہو:۔

جو آیا اور کوئی بزم میں ہم ٹک سرک بیٹھے ✓ ہمیں پوچھو تو ہستی اور عدم میں کیا تفاوت ہے

اکبر الہ آبادی کی نازک تعبیر اس سے بھی بڑھ گئی:۔

وہ کیا ہو اک جھلک ہی ہم کیا ہیں اک نظر ہیں ✓ دُنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق

لیکن ان سب میں اک کیفیت حزن و مایوسی تو ضرور ہے لیکن کوئی درس و ولولہ نہیں۔ حالی کہتا ہے:۔

کل بتا دیگی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے ✓ کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے

دیکھا صرف اندازِ بیان نے بات کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

عاشق کی حالت ہمیشہ دردناک رہا کرتی ہے اور اس کو شعراء نے بے شمار طریقوں سے ظاہر کیا ہے مثلاً ایک کہتا ہے:۔

✓ حال بیچارہ کا بہت خراب ہے آج

دوسرا اس کے وقت آخر کی خبر اس طرح دیتا ہے:۔

✓ سحر کرنا بہت دشوار ہے بیمار ہجراں کو

ذیل کے مصرعہ میں ہر چند نزع و موت کسی چیز کا ذکر نہیں لیکن دردناک حالت کی تصویر بہت زیادہ مکمل طور پر پیش کی ہے:۔

✓ حال اس غمزدہ کا ہم سے تو دیکھا نہ گیا

مومن، میر، اور درد نے ایک ہی مضمون کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا ہے، لیکن اندازِ بیان کا تفاوت ملاحظہ ہو:۔

مومن کہتا ہے:۔

تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے ✓ میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ

مدعا یہ ہے کہ جو دردناک حالت میری ہے وہ سب تمھارے ہی حُسن فتنہ پرور کا کرشمہ ہے اس لئے اسے نہ دیکھو ورنہ ممکن ہے تمھیں نظر لگ جائے۔ اس میں شک نہیں کہ نہایت لطیف بات کہی ہے، لیکن الناکی کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

میر کہتے ہیں:۔ انقلابات ہیں زمانے کے میرے تغیر حال کو مت دیکھ

دوسرے مصرعہ سے شاعر نے ایسے بلیغ انداز میں اپنی عبرتناک حالت پیش کی ہے کہ اس میں کسی اضافہ کی گنجایش نہیں معلوم ہوتی، تاہم ایک کمی پائی جاتی تھی، وہ یہ کہ اس تغیر حال کا کوئی تعلق محبوب سے ظاہر نہ ہوتا تھا اور اسی لئے تغزل سے شعر ہٹ گیا تھا۔ درد نے اس سقم کو بھی دور کر کے شعر کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیا:-

میرے تغیر حال پر مت جا		یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے

لفظ مہربان کے لطیف اشارہ سے اس شعر کو جس انداز سے حدودِ تغزل میں لایا گیا ہے، وہ شاعرانہ بلاغت کی آخری حد ہے۔

الغرض اس طرح کی صدہا مثالیں ہیں جن سے اندازِ بیان کا اثر مفہوم و معنی پر بخوبی ثابت ہو سکتا ہے۔ اور اندازِ بیان کا تنوع منحصر ہے صرف الفاظ و ترکیب الفاظ کے اختلاف پر۔

اس سلسلہ میں یہ امر ضرور توجہ طلب ہے کہ جب ہر شاعر اس سے واقف ہے تو کیوں باہمدگر اس قدر فرق مراتب ہے، یعنی کسی شاعر کا کلام دلکش اور کسی کا غیر دلچسپ کیوں ہوتا ہے حالانکہ الفاظ وہی ہیں اور ان کا مفہوم بھی پوشیدہ نہیں۔ یہی وہ بات ہے جہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص شاعر پیدا ہوا ہے اور فلاں نہیں:-

جس طرح ایک نقاش کا کمال یہ ہے کہ وہ خطوط کے امتزاج سے اصل منظر آپ کے سامنے لے آوے، اسی طرح ایک شاعر کا کمال یہ ہے کہ جو تاثرات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ان کو ایسے الفاظ و انداز سے ظاہر کرے کہ دوسرا بھی وہی کیفیت اپنے اندر محسوس کرنے لگے اور اسی کا نام ذوق سلیم ہے۔ پھر جس طرح ہر نقاش کامیاب نقاش نہیں ہو سکتا، اسی طرح ہر شاعر کامیاب شاعر نہیں ہو سکتا کیونکہ نہ نقش صرف مو قلم کی جنبش کا نام ہے اور نہ شعر محض الفاظ کے اجتماع کا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تاثرات و جذبات میں پستی و بلندی ضرور ہوتی ہے اور اسی لحاظ سے ایک شعر کے پست و بلند ہونے پر حکم لگایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محبت کا وہ جذبہ جس پر غزل کی بنیاد قائم ہے اپنے مقصود و مدعا کے لحاظ سے گو غیر فطری نہ ہو، لیکن اس کا غیر سنجیدہ ہو جانا یقینی ہے اگر اس کے اظہار میں احتیاط نہ کی جائے اور اسی احتیاط نے تشبیہہ، استعارہ، کنایہ وغیرہ بہت سی صورتیں اندازِ بیان کی پیدا کر دی ہیں، ورنہ یوں اگر نہایت معمولی الفاظ میں اس کو ظاہر کر دیا جائے تو پھر غزلگوئی کا بھی وہی عالم ہو جائے جو آج کل روس میں شادی کا ہے کہ راستہ چلتے میں نے ایک عورت کو دیکھا اور کہا "کیا تم مجھ سے نکاح کرو گی"، اور اگر اس نے جواب میں کہدیا کہ "ہاں" تو گویا عقد ہو گیا ورنہ چلئے محبت ختم ہیں کھیت کاٹنے چلا گیا اور وہ کپڑا بننے۔

اول اول جب دکن میں اردو غزلگوئی کی ابتدا ہوئی تو جذبات محبت کو نہایت سادہ طور پر ظاہر کیا گیا کیونکہ اول تو اس نوزائیدہ زبان میں الفاظ کا ذخیرہ بہت کم تھا اور دوسرے یہ کہ جس چیز کو سامنے رکھکر شاعری کی گئی وہ زیادہ تر ہندی گیت تھے جن کی سادگی آج بھی اسی حال پر قائم ہے، لیکن چونکہ فارسی کے اثرات بھی کچھ کچھ اس میں شامل ہو چلے تھے اس لئے ہندی گیتوں سے اتنا تفاوت ضرور ہو گیا کہ عشق کا

اظہار بجائے عورت کے مرد کی طرف سے مرد ہی کے لئے ہونے لگا اور بحر و وزن بھی فارسی شاعری کے اختیار کئے گئے، تاہم ہندی زبان کے اثر کی وجہ سے جذبات میں فی الجملہ سادگی بھی تھی اور مقامی رنگ بھی زیادہ جھلکتا تھا۔ چنانچہ معشوق کو سجن یا پیا کہنا، بجائے بلبل کے پپیہا کا ذکر کرنا، اور تشبیہات وغیرہ میں ملک کی وضع و معاشرت، اور ملک کی پیداوار کو سامنے رکھنا، اُردو کی قدیم شاعری کی نمایاں خصوصیت تھی۔ مثلاً ولی دکنی کا شعر ہے:-

اے صنم تجھ جبین اوپر خال
ہندوی ہر دوار باسی ہے

یا داؤد دکنی لکھتا ہے:-

رات دن ہے پکار میں داؤد
جیوں پپیہا پیا پیا تجھ بن

اسی کے ساتھ الفاظ بھی خصوصیت کے ساتھ خالص ہندی الاصل استعمال کئے جاتے تھے اور فارسی ترکیب کی آمیزش سے بالکل پاک ہوتے تھے۔ چنانچہ فغاں کا ایک مصرع ہے:-

سانورا مکھڑا، رسیلے نین، البیلی ہے چال

ایک اور شاعر کہتا ہے:-

پیا بن میرے تئیں بیراگ بھایا ہو جو ہونی ہے سو ہو دو
بھبھوت اب جیو کیوں کل رنگ لایا ہے جو ہونی ہے سو ہو دو

یا —
جب تے سفر پی نے کیا تب تے غروب آوارہ ہوں
یا پیک پی آیا کریں یا مجھ کو ہیں بلوائے کر

الغرض اول اول ہندی گیتوں اور اُردو کی غزلوں میں جذبات کے لحاظ سے کوئی زیادہ فرق نہ تھا، سوائے اس کے کہ اوزان شعر بیشک فارسی کے تھے اور معشوق بھی ایرانی تھا۔ ہر چند اس بد ذوقی کا اظہار انھوں نے بہ کثرت کیا اور بعض نے تو اپنے محبوب لڑکوں کے نام تک ظاہر کر کے اس بد نمائی کو انتہا تک پہونچا دیا، لیکن جذبات و بیان کی سادگی کے لحاظ سے قدیم شعرا کی غزلگوئی کو حقیقی تغزل میں شمار کرنا پڑے گا گو وہ تنوع مطالب و اسلوب ادا کے لحاظ سے محدود ہی کیوں نہ رہی ہو۔

دکن کے وہ شعرا، جو ولی سے کچھ پہلے گزر چکے ہیں ان کے یہاں تو نہیں لیکن ولی اور اُن کے ہمعصر سراج وغیرہ کے کلام میں فارسی شاعری کے زیر اثر، رعایت لفظی یا فارسی تشبیہات کی بھی کچھ کمی نہیں ہے۔

مثلاً ولی لکھتا ہے:-

جاری ہوئے انجھو مرے یو سبزۂ خط دیکھ
لے خضر قدم سیر کر اس آب رواں کا

اس میں سبزۂ خط، خضر اور آب رواں کے الفاظ سب فارسی شاعری کا طفیل ہیں۔

اسی زمانہ کے ایک شاعر ہاتفی کا شعر ہے :-

تیری انکھیاں و زلف سے کافر ہوا سارا جہاں　　اسلام اور تقوی کہاں زہد اور مسلمانی کدھر

یہ کفر و اسلام کا ذکر شاعری میں صرف فارسی شاعری کا نتیجہ ہے۔

الغرض فتح گولکنڈہ سے قبل قطب شاہی و عادل شاہی حکومتوں میں جتنے شاعر تھے اگرچہ ان کو اُردو زبان کا شاعر تو نہیں کہہ سکتے لیکن بہرحال جیسے اور جتنے بھی تھے صرف جذبات کا اظہار سادہ الفاظ میں کردیا کرتے تھے اور یہی رنگ اول اول ولی کا بھی رہا، لیکن جب اورنگ زیب نے دکن کی حکومتوں کو مغلوب کرکے اورنگ آباد میں قیام کیا اور ہندوستان و ایران کے شاعروں سے یہاں کے شعراء کا ارتباط بڑھا، تو ریختہ زبان کی سادگی (جسے بیرنگی کہنا زیادہ موزوں ہوگا) اور اسلوب بیان کی یکسانی مٹنے لگی اور فارسی خیالات فارسی تراکیب، اور فارسی تشبیہات و استعارات کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ وہی ولی جو صرف یہ لکھنا جانتا تھا :-

ترے آنے کی باٹ اوپر بچھائے ہوں میں انکھیاں کو

جب دہلی سے واپس آیا تو یہ بولی بولنے لگا :-

سحر ہے سروِ گل جبیں کی ادا

ولی کے اس دور کے کلام میں آپ کو "طرۂ طرار، مئے جاں بخش، آئینۂ ناصاف، نقدِ ہوش، لبِ تصویر" ایسے الفاظ خالص فارسی ترکیب کے بکثرت نظر آئیں گے، تاہم جذبات نگاری کا جو ذوق پیدا ہوچکا تھا وہ مٹ نہ سکا اور ایرانی ذوق و ایرانی آورد و تصنع سے متاثر ہونے کے باوجود، تغزل کی سادگی کسی نہ کسی حد تک قایم رہی۔

دہلی کی حالت اُسوقت یہ تھی کہ فارسی کے اچھے اچھے کہنے والے وہاں موجود تھے اور علاوہ سراج الدین علیخاں آرزو و میرزا عبدالقادر بیدل، سلیمان قلی خاں داؤد، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضیٰ قلی خاں فراق، علی قلی خاں ندیم وغیرہ نہایت خوشگو شعراء پائے جاتے تھے لیکن اُردو سے بالکل نابلد تھے اور اگر کبھی بطور تفنن کچھ کہا بھی تو اس انداز سے جیسے کوئی نووارد انگریز کچھ اپنے خانساماں سے کہہ رہا ہے، چنانچہ مرزا معز الدین فطرت عہد عالمگیری کے بڑے زبردست فارسی شاعر تھے، لیکن اُردو میں انھوں نے یوں گل افشانی فرمائی :-

از زلفِ سیاہِ تو بدل دھوم پری ہے (پڑی)　　در خانۂ آئینہ گتا (گھٹا) جھوم پری (پڑی) ہے

یعنی تیری زلفِ سیاہ کے خال سے دل کا یہ رنگ ہے جیسے آئینہ میں گھٹا چھا جائے۔

ایک اور فارسی شاعر قزلباش امید کی اُردو نوازی ملاحظہ ہو :-

بامن کی (بیتی) بتی آج مری انکھ موں پری (غیر واز پڑی)　　غصہ کیا و گالی دیا اور دگر لری (لڑی)

دوسرے مصرعہ میں "و" عطف اور لفظ "دگر" کسقدر عجیب چیز ہے، لیکن بعد کو جب ولی کا دیوان دہلی پہونچا اور دوسرے اورنگ آبادی

شاعر وہاں پہونچے تو دفعتہً ذوق میں تبدیلی پیدا ہوئی اور وہی قزلباش امید جن کا شعر ابھی آپ نے پڑھا ہے اس دھن میں الاپنے لگے:-

در و دیوار سے اب صحبت ہے
یار بن گھر میں عجب صحبت ہے

تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں
الحفیظ، الحفیظ کہتا ہوں

خان آرزو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

میخانے آج جاکر شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

ہر صبح آ اُڑتا ہے تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

ہر چند ان تمام اشعار میں روح فارسی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عہد عالمگیری میں بعض ایسے محاورات اُردو میں ایجاد ہو گئے تھے جو آج تک استعمال ہو رہے ہیں مثلاً دل کے پھپھولے پھوڑنا۔ دن لگنا۔ یا تیجے کی رسم کو "پھول" کہنا۔

تذکرۂ گل رعنا میں اسوقت کے بعض اور فارسی شعراء کا بھی اُردو کلام نقل کیا ہے مثلاً مرزا علی قلی خاں ندیم لکھتا ہے:-

جدائی میں تری ہم کیا کہیں کس طرح جلتے ہیں
بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں

بیقرارِ عشق کو ہے زندگی نقص کمال
مر چکے بیمار تب کہتے ہیں یہ اکسیر ہے

یا مرتضیٰ قلی فراق کہتے ہیں:-

تماشہ اس چمن کا کس کے دل کو شاد کرتا ہے
گریباں اک لب تبسم غنچہ کو برباد کرتا ہے

اسیروں کی قسم تجھ کو صبا سچ کہہ کہ گلشن میں
کوئی ان ہمنواؤں سے ہمیں بھی یاد کرتا ہے

میر شمس الدین فقیر نے چھوٹی زمین میں کتنے صاف شعر نکالے ہیں:-

زندگی موج آب ہے گویا
دم کا آنا حباب ہے گویا

خال تیرے بیاض گردن پر
نقطۂ انتخاب ہے گویا

مرزا عبدالقادر بیدل نے بھی دو چار شعر اُردو میں کہے ہیں، لیکن خاص اپنے رنگ کے:-

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

شہرۂ حسن سے از بسکہ وہ محجوب ہوا
اپنے چہرہ سے جھگڑتا ہو کہ کیوں خوب ہوا

اشعار مندرجۂ بالا سے ہر چند یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان فارسی شعراء نے جو کچھ کہا وہ یکسر ایرانی خیالات کا پرتو تھا، لیکن ...

بھی انکار ممکن نہیں کہ زبان کے لحاظ سے دہلی نے جتنی جلد ترقی کی وہ دکن کے شعراء کو شاید عمر بھر نصیب نہ ہوتی اگر انھیں اہل دہلی سے تبادلۂ خیالات کا موقعہ نہ ملتا - یہ درست ہے کہ دہلی میں اُردو شاعری کا ذوق دکن سے منتقل ہوا، لیکن جس حد تک زبان کی ترقی و تہذیب کا تعلق ہے، دہلی، دکن کا ممنون کرم نہیں بلکہ خود دکن کو شکر گزار ہونا چاہئے کہ وہ یہاں آکر آدمیوں کی بولی بولنے لگے ورنہ اُسی سجن، برہا اور نین میں پڑے رہتے - اس دور کے مصلحین زبان اُردو میں سب سے زیادہ نمایاں نام شاہ حاتم کا نظر آتا ہے، یہ میر شاکر ناجی، غلام مصطفےٰ یکرنگ، شاہ مبارک آبرو، مرزا مظہر اور شرف الدین مضمون کے ہمعصر تھے اور اول اول اُسی اورنگ آبادی زبان میں شاعری کرتے تھے لیکن بعد کو کانٹ چھانٹ کرکے ایک انتخاب مرتب کیا اور ہندی کے بہت سے نامانوس اور ثقیل الفاظ ترک کرکے عربی فارسی کی آسان ترکیبیں اور دہلی کے محاورات استعمال کئے، مثلاً

زندگی درد سر ہوئی حاتم کب ملیگا مجھے پیا میرا
ستم سے تیرے میں جاتا ہوں پھر کہیو تو کہ آشنائی کا حاتم نباہ بھی نہ کیا
تم کہ بیٹھے ہوئے اک آفت ہو اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو
مفلسی اور دماغ اے حاتم کیا قیامت کرے جو دولت ہو

لیکن باوجود اس کے عہد قدیم کے مطابق تسبیح کو تسبی، صحیح کو صحی، بیگانہ کو بگانہ، دیوانہ کو دوانہ لکھنے سے انھوں نے احتراز نہ کیا۔ اسی طرح نین، جگ، نت، اودھر، کیدھر، یاں، واں، اور مرض وغیرہ کا استعمال برابر کرتے رہے اور باتباع شعراء فارسی جن کی زبان سے (ڑ) بصورت (ر) ادا ہوتی تھی، دھڑ کا قافیہ تر اور گھوڑے کا بورا جائز رکھا۔ صاحب تذکرۂ جلوۂ خضر نے بیدل کا نام بھی اس دور کے مصلحین اُردو میں لکھا ہے کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق وہ "اُردو بھی بہت کچھ کہہ گئے ہیں" لیکن چونکہ اس "بہت کچھ" میں سے سوائے دو چار شعر کے اور کچھ باقی نہیں رہا اس لئے کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح خان آرزو کے متعلق لکھا ہے کہ سب سے پہلی انھوں ہی نے ایک تصنیف "لغت اُردو" پر کی تھی جو غدر کے زمانہ میں انھوں نے دیکھی تھی، لیکن اب وہ بھی سامنے نہیں کہ اس پر اظہار خیال ہو سکے۔ البتہ اس دور کے لوگوں میں مرزا مظہر اور فغاں کا مرتبہ نہ صرف بلحاظ زبان بلکہ بلحاظ جذبات نگاری بھی بہت بلند نظر آتا ہے کیونکہ جو رسم ایہام گوئی فارسی کے اثر سے اُردو شاعری میں پیدا ہو گئی تھی اور جس کے نمونے ولی، سراج اور حاتم وغیرہ کے کلام میں پائے جاتے ہیں، سب سے پہلے میرزا مظہر اور فغاں نے ترک کی۔ اس لحاظ سے ان کی خدمات نہ صرف اس لئے وزنی ہیں کہ انھوں نے اُردو زبان کی تہذیب و شائستگی میں نمایاں حصہ لیا، بلکہ حقیقی رنگ تغزل کے معیار کو بہت بلند کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ہرچند مظہر کے کلام میں الفاظ دکسو، کبھو، اونھوں کی، بیرڑیاں، ابر، موا، سجن وغیرہ نظر آتے ہیں لیکن زبان کی سلاست و روانی اور جذبات کی فراوانی اس طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتی۔

محمد

لکھتے ہیں:۔

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

کیا زبان کے لحاظ سے یہ شعر عہدِ حاضر کی پیداوار نہیں کہلایا جا سکتا۔

اور ان کا یہ مشہور شعر:۔

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

کیا بہ لحاظ رنگِ تغزل معیاری چیز نہیں۔

زبان کے لحاظ سے فغاںؔ کا مرتبہ میرزا مظہر سے زیادہ بلند نظر آتا ہے، ہر چند یہ قزلباش امید یا علی قلی ندیم کے شاگرد تھے جو فارسی کے شاعر تھے لیکن چونکہ احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے اسلئے ان کی اُردو زبان بھی بہت شستہ تھی اور تنوع بیان کی وہ صورتیں جو فارسی میں رائج ہیں اُن سے بھی اُردو میں کام لیکر جذبات نگاری کے بڑے بڑے پیارے اسلوب انھوں نے پیش کئے۔

زبان کا لطف ملاحظہ ہو:۔

تجھ کو روزی ہو مرے یار دُعائیں لینا
مجھ کو ہر شب تری زلفوں کی بلائیں لینا

خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا
کیا پوچھتے ہو حال ہمارا سنا نہیں

اسلوب بیان کی بعض مثالیں دیکھئے:۔

کیا تو شب فراق میں جیتا رہا فغاںؔ
یاں تک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار کا

دلبستگی قفس میں یہاں تک مجھے ہوئی
گویا مرا چمن میں کبھی آشیاں نہ تھا

صرف ۲۵ سال بلکہ اس سے بھی کم مدت میں، دکن کی ثقیل زبان اور وہاں کی تنگ و محدود غزلگوئی کا دہلی آکر اس قدر ترقی کر لینا حقیقتاً حیرتناک امر ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ یہاں کی سرزمین اکبر و جہانگیر کے وقت سے اس کی صلاحیت قبول کرتی جاتی تھی اور جب اورنگ زیب کا زمانہ آیا تو اس استعداد میں دکنی شاعری کی تحریک سے عملی جنبش پیدا ہوئی اور محمد شاہ رنگیلے کے وقت تک اسنے ایک بالکل جدید ہیئت و صورت اختیار کر لی۔

جس حد تک زبان کا تعلق ہے، اہلِ دہلی، دکن کی زبان کے قایل نہ تھے اور کوشش کرتے تھے کہ اس سے بالکل علحدہ ہو کر اسلوب غزلگوئی استوار کیا جائے چنانچہ قائمؔ نے صاف صاف لکھ ہی دیا کہ:۔

قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک چیز لچر سی بزبانِ دکنی تھی

اور شاہ وقت کی رنگین صحبتوں، عیش کوشیوں، اور فنون لطیفہ کی قدر دانیوں نے اس جذبہ میں قوت و استقامت پیدا کر دی۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ولی دکنی ابھی بقیدِ حیات ہی تھا کہ شاہجہان آباد میں شاہ حاتمؔ، میرزا مظہرؔ، فغاںؔ، سوداؔ، میرؔ، دردؔ اور سوزؔ ایسی ہستیاں رونما ہو گئیں۔

جنھوں نے اگر ایک طرف زبان کو خس و خاشاک سے صاف کیا تو دوسری طرف غزل گوئی کے معیار کو اس بلند نقطہ تک پہونچا دیا کہ آج بھی اگر کسی معیاری شعر کی جستجو ہوتی ہے تو میر و درد دہی کے دیوانوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔

اصلاح زبان کے باب میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ شاہ حاتم اور میرزا مظہر وغیرہ نے زبان و بیان دونوں حیثیتوں سے غزل گوئی کا رُخ کدھر سے کدھر پھیر دیا، لیکن یہ سلسلہ اسی جگہ ختم نہیں ہوگیا بلکہ برابر جاری رہا اور زمانہ نے سودا کو پیدا کرکے یہ خدمت اُن سے لی۔ سودا شاہ حاتم کے شاگرد تھے، لیکن بلا کا ذہین دماغ لیکر آئے تھے اور اُردو میں تمام اصناف سخن پر قدرت رکھنے کے لحاظ سے اپنا نظیر نہ رکھتے تھے، جوش و خروش، معنی آفرینی، نزاکت تخئیل، ندرت بیان، چستی بندش، قدرت بیان الغرض فن شعر و انشار کے متعلق کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی جو ان میں بدرجۂ اتم نہ پائی جاتی ہو۔ اُردو میں قصاید کی ابتدا بھی انھوں ہی نے کی اور چونکہ فارسی زبان کے بھی ماہر تھے اس لئے یہاں بھی اسی بلند آہنگی کو برقرار رکھا۔ ہجویں ایسی کہیں کہ خدا کی پناہ، قطعے، رباعیاں، مستزاد، ترجیع بند، پہیلیاں، مخمس ایسے ایسے لکھے کہ معلوم ہوتا تھا ان میں سے ہر ایک کے لئے پیدا ہوئے تھے، الغرض فارسی میں جو مرتبہ امیر خسرو کو حاصل تھا، وہ اُردو میں سودا کو نصیب ہوا لیکن صحیح رنگ تغزل میں وہ میر، سوز اور درد کو نہ پہونچ سکے، کیونکہ وہ فطری سوز و گداز جو غزل گوئی کے لئے ضروری ہے اس سے یہ نا آشنا تھے، تاہم اسالیب بیان کے تنوع کے لحاظ سے ان کو ایک اچھا غزل گو کہا جا سکتا ہے اور اصلاح زبان کے باب میں تو وہ سب میں ممتاز تھے۔

ذیل کے چند شعروں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ زبان کی تہذیب و شائستگی انھوں نے کس حد تک پہونچا دی تھی :-

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر　　اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

یہ تو نہیں کہتا ہوں کہ سچ مچ کرو انصاف　　جھوٹی بھی تسلی ہو تو جیتا ہی رہوں میں

ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجھ کو نیند　　جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے مر کہیں

پیغامبر نے دیر لگائی تو ہے دلے　　دھڑکے ہے دل کہ یہ نہ کہے رات ہوگئی

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ　　کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی

فارسی ترکیبوں کو بھی انھوں نے نہایت سلیقہ و خوبی سے استعمال کیا مثلاً

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

اک قطرۂ خوں سینہ میں آفات طلب ہو

بنتے تھے رشتۂ رگِ گل دام کے لئے

اک تیر میں وہ مرغ بلند آشیاں گرا

اسی طرح کی سیکڑوں مثالیں فارسی ترکیب الفاظ کی اُن کے یہاں مل سکتی ہیں۔

جیسا کہ ابھی ہم نے کہا سوز و گداز اُن کے یہاں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، لیکن سادگی و سلاست اور اسلوب بیان سے کام لیکر انھوں نے یہ کیفیت بھی پیدا کر کے دکھا دی۔ ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اُن کے یہاں تغزل نہیں ہے :-

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب بھلی راتیں
دو چار گھڑی رونا، دو چار گھڑی باتیں

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

نسیم بھی ترے کوچہ میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے کچھ دیکھیو رہا بھی ہے

سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

زبان کے لحاظ سے میر، درد، اور سوز ایک ہی درجہ رکھتے ہیں کیونکہ ان میں سے کسی نے اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی اور بہت سے ناما نوس الفاظ کے ان کے کلام مین پائے جاتے ہیں، البتہ درد اور سوز کے یہاں ایہام کی شاعری بالکل نہیں پائی جاتی اور میر کے کلام میں یہ عیب بھی نظر آتا ہے۔ سودا نے اس سے بہت احتراز کیا۔ اسی کے ساتھ امرد پرستی کا جذبہ بھی میر کے یہاں نسبتاً اپنے عہد کے اکثر شعراء سے زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن بایں ہمہ معیار تغزل کے لحاظ سے کسی عہد میں اس کا نظیر پیدا نہیں ہوا اور سوز و گداز، عجز و فتادگی، وا لہانہ ربودگی، معاملات محبت کی چھان بین، تجزیۂ کیفیات، سلاست و روانی، آمد و بیساختہ پن کے لحاظ سے ارتقاء غزلگوئی کی جس منزل پر وہ پہونچا، کسی دوسرے کو نصیب ہی نہیں ہوئی۔ یقیناً درد کے کلام میں بھی تقریباً یہی باتیں پائی جاتی ہیں لیکن بہ اعتبار کمیت و کیفیت میر کو نہیں پہونچتے۔ سوز تو خیر نہایت ہی سیدھے سادھے عاشق تھے اور سوائے اس کے صاف صاف الفاظ میں اپنے دل کا حال بیان کر دیا کریں، اینچ پیچ کی باتیں جانتے ہی نہ تھے۔

اس میں شک نہیں کہ درد کی شاعری میں میر سے زیادہ عمق ہے لیکن غزل میں جذبات کی گہرائی اتنی پسندیدہ نہیں جتنا ان کا فطری اظہار۔ سوز کے یہاں یہ رنگ زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ پھر میر کے کلام کی کثرت اور اس میں بھی کیفیات عشقیہ کے ہزاروں پہلوؤں کا نئے نئے اسلوب سے بکثرت اظہار، ایسی خصوصیت ہے کہ سوز اور درد کے مقابلہ میں ان کو لامحالہ مرجح ماننا پڑیگا۔ ساری دنیا کے شاعروں کا کلام چھان ڈالئے لیکن میر کے نشتروں کا جواب مشکل سے ملیگا۔

اب حالِ دل ہے اُن کے دلخواہ
کیا پوچھتے ہو الحمدللہ

کب نیاز عشق نازِ حسن سے کھینچے ہے ہاتھ
آخر آخر میر سر بر آستاں مارا گیا

یکسا نگہ ہے پیش کچھ نقصاں نہ آیا اسکے تئیں
اور میں بچارہ تو اے مہرباں مارا گیا

نظر میر نے کیسی حسرت سے کی
بہت رو دئے ہم اس کی رخصت کے بعد

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ　　نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق اسی گھڑی　　جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

الغرض کہاں تک کوئی لکھ سکتا ہے۔ اس کا دیوان ان جواہر ریزوں سے لبریز ہے۔

خواجہ میر دردؔ کے کلام میں بھی اس رنگ کے شعر نظر آتے ہیں :-

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک　　اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

مدت تلک جہاں میں ہنستے پھرا کئے　　جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھ کر کہیں

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے　　دوستو دردؔ کو محفل میں نہ تم یاد کرو

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

لیکن میرؔ کے اشعار سے پھر بھی کچھ الگ معلوم ہوتے ہیں اور دل کے جلنے کی وہ بو ان میں نہیں ہے۔ زبان کی شیرینی وسادگی کے لحاظ سے سوزؔ بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور جذبات محبت کو نہایت سہل و آسان الفاظ میں بیان کر دینا ان کی وہ خصوصیت تھی جو میرؔ اور دردؔ کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ ان کے کلام کا اقتباس نگار ماہ نومبر ۳۲ء میں شائع ہو چکا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔ چند شعر یہاں بھی درج کئے جاتے ہیں :-

لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص عاشق ہو گیا　　عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہے

اہل ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہو گیا　　آہ یا رب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

سر ترا نو پہ ہوا سکے اور جان نکل جائے　　مرنا تو مسلم ہے ارمان نکل جائے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا　　پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

اشک خوں آنکھوں میں آ کر جم گئے　　دور سے کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

کسی نے رو دم لی، قسمت میں کوئی شام آیا　　ہیں کچھ لے نہ آیا ایک تیرا نام لے آیا

الغرض تنزل نے زبان و بیان کے لحاظ سے اس عہد تک نمایاں ترقی حاصل کر لی اور ایک سوداؔ و میرؔ ہی پر موقوف نہیں، آپ اس عہد کے جس شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھیں گے، زبان کی صفائی اور جذبات کی صداقت و سادگی آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی۔ غزل کے علاوہ قصیدہ گوئی کی بھی سوداؔ نے مستحکم بنیاد ڈال دی اور حسنؔ نے سحر البیان لکھ کر مثنوی کو اس مرتبہ پر پہونچا دیا کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا۔ ہر چند حسنؔ سے تقریباً دو سو سال پہلے دکن میں مثنوی کی بنیاد قائم ہو چکی تھی اور اس سلسلہ میں نصرتی کی گلشن عشق، ابن نشاطی کی پھول بن اور ہاشمی کی یوسف زلیخا کا نام عرصہ سے کانوں میں پڑتا چلا آتا تھا، لیکن زبان کے لحاظ سے جو حال دکن کی غزل کا تھا وہی مثنوی کا تھا۔ سب

پہلے میر تقی میر نے اس میں اصلاح کر کے چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں اور اس میں شک نہیں کہ خوب لکھیں، لیکن پھر میر حسن نے بے نظیر و بدر منیر کی عشقیہ داستان لکھ کر نہ صرف بہ لحاظ پاکیزگی زبان بلکہ محاکات و سیرت نگاری کے لحاظ سے بھی اس صنفِ سخن کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ اگر اُس وقت کی ٹکسالی زبان کا نمونہ دیکھنا ہے تو صرف یہ مثنوی پڑھ لیجئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اب سے ڈیڑھ سو سال قبل اس میں کتنا البیلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ چاندنی رات میں بدر منیر لب نہر ایک نگیرۂ زرنگار کے نیچے مسند پر بیٹھی ہوئی ہے، اسکی تصویر ملاحظہ ہو:-

اُدھر آسماں پر وہ رخشندہ مہ — اِدھر یہ زمیں پر مہ چاردہ
دیئے کہنی تکیہ پر اک ناز سے — سرِ نہر بیٹھی تھی انداز سے
پڑا عکس دونوں کا جو نہر میں — لگے لوٹنے چاند ہر لہر میں
وہ مکھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے — وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے
جو کچھ چاہئے ٹھیک نک سک سے رنگ — نزاکت بھرا سیوتی کا سا رنگ

بدن آئینہ سا دمکتا ہوا — گلِ باغ خوبی لہکتا ہوا
عیاں چستی و چالاکی گات سے — نمودِ جوانی ہر اک بات سے
کہ برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن — مرادوں کی راتیں جوانی کے دن

بے نظیر اور بدر منیر کی پہلی ملاقات کا سماں ملاحظہ ہو:-

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے — بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منھ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے — لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینے پسینے ہوا سب بدن — کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن

فراق کے بعد کی حالت دیکھئے:-

تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی — دُرِ اشک سے چشم بھرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی — بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپِ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ — اکیلی لگی رونے منھ ڈھانپ ڈھانپ
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا — نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اسے — محبت میں دن رات گھٹنا اسے

کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو — تو اُٹھنا اسے کہہ کے ہانجی چلو
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے — کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
جو پانی پلایا تو پینا اسے — غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

الغرض پوری مثنوی اسی قسم کے نوادر سے مالامال ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ چند دنوں میں اُردو اتنی وسعت کیونکر اختیار کر سکی۔ یہ مثنوی میر حسن نے اپنی عمر کے آخر حصہ میں تصنیف کی تھی یعنی اسوقت جب سودا اور درد کا انتقال ہو چکا تھا، اور میر اور سوز دہلی کے اُجڑ جانے سے لکھنؤ چلے گئے تھے (میر حسن اس میں شک نہیں دہلوی تھے لیکن چونکہ عنفوان شباب میں فیض آباد چلے گئے تھے اور وہیں ساری عمر بسر کی اس لئے میر حسن کے تمام کارناموں کو اُصولاً لکھنوی دورِ شاعری سے منسوب کرنا چاہئے۔)

یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی برباد ہو کر لکھنؤ آباد ہو رہا تھا اور تمام باکمال شعراء کھنچ کھنچ کر اسی طرف آرہے تھے، عیش و مسرت کی فراوانی تھی نئی نئی سلطنت کی اُمنگ تھی، زر و دولت کی بکھیر تھی، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ شاعروں کی طبیعت میں تازہ اُمنگ نہ پیدا ہوتی اور شاعری اسی حالت پر قائم رہتی جو دہلی میں پائی جاتی تھی۔ اس لئے نہ صرف یہ ہوا کہ شعراء دہلی کی شاعری سے متاثر ہوئے بلکہ خود سرزمین اودھ سے بھی جعفر علی خاں حسرت نے وہ صدا بلند کی جسے لکھنؤ اسکول کی شاعری کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔

حسرت نے نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کا پورا زمانہ دیکھا تھا یعنی سودا، میر، سوز، مصحفی و انشا سب کا عہد انکی نگاہوں سے گزرا، اس لئے یہ کہنا کہ دہلوی اثرات سے ان کی شاعری بیگانہ رہی صحیح نہ ہوگا کیونکہ وہ خود دہلی میں پیدا ہوئے تھے لیکن یقینی ہے کہ سب سے پہلا وہ شخص جس نے لکھنؤ کا ایک علیحدہ رنگ قائم کرکے امرد پرستی کی طرف سے شعراء کی توجہ کو ہٹایا، حسرت ہی تھا۔ جرأت جنکی بیباک عریانیاں مشہور ہیں، انھیں کے شاگرد تھے، اس وقت تک دہلی کی شاعری نے محبوب کی نسائی حیثیت کو متعین نہ کیا تھا اور جس طرف دیکھئے وہی سبزۂ خط نظر آتا تھا، لیکن چونکہ لکھنوی معاشرت میں شاہدان بازاری کے ساتھ تعلقات پیدا کرنا عام بات تھی اس لئے کنگھی چوٹی کا بھی ذکر شروع ہوا، چولی اور محرم کا بھی بیان ہونے لگا۔ یقیناً بہ لحاظ فطرت یہ میلان قابل قدر تھا لیکن اس سلسلہ میں عریانیاں اتنی بڑھ گئیں کہ آخرکار دہلوی رنگ تغزل کی لطافت بالکل پس پشت ڈال دی گئی اور جذبات کا رُخ حد درجہ پستی کی طرف مائل ہو گیا۔ چنانچہ حسرت کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو:-

چولی مسکی، بند ہیں ٹوٹے، سر کے بال پریشاں ہیں — اس بگڑے عالم پر تیرے لاکھ بناوٹ قرباں ہیں
کپڑے بدن کے ملے دلے ہیں بلکہ بدن سب ملا دلا — شب کے باسی پھولوں کا عالم کس سے کہیں ہم حیراں ہیں
مُنھ اترا ہے گال ہے نیلا، پلکیں جھکیں آنکھوں میں خمار — نام خدا بگڑے عالم پر جمع ادائیں پنہاں ہیں
سچ کہو حسرت پاس رہے تھے رات، بنا جس سے یہ رنگ — اس کمبخت کی صحبت سے بیزار جہاں کے خوباں ہیں

یہ صحیح ہے کہ حسرت کے یہاں یہ رنگ بہت زیادہ نہیں ہے لیکن اس ابتدا کی آخر انتہا ہونا تھی جسے جرأت[1] نے ترقی دی اور پھر رفتہ رفتہ رعایت لفظی، ایہام گوئی زنانہ پن، فحاشی، وعریانی، سوقیانہ طرزِ ادا اور بے حیائی و بے غیرتی کی وبا ناسخ اور اُن کے شاگردوں کی بدولت اتنی عام ہوئی کہ لکھنؤ اسکول آج تک اس کی وجہ سے بدنام ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کی شاعری پر سب سے بڑا اثر وہاں کی حکومت کا پڑا، چنانچہ مصحفی و انشا بھی جو دہلی اسکول کے شاعر تھے لکھنؤ پہونچکر، نوابان اودھ کے ذوق اور وہاں کے رنگ رلیوں کو دیکھ کر ایک حد تک متاثر ہوئے اور اسی لئے ان کا کلام لکھنؤ پہونچنے کے بعد پست ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلا وہ شخص جس نے لکھنوی غزلگوئی کو بدنام کیا ناسخ تھا۔ اس کے بعد آتش اور پھر ان دونوں کے تلامذہ نے کچھ زمانہ تک اس رنگ کو قائم رکھا جو اسیر و امیر کے وقت تک باقی رہا۔ متاخرین میں سب سے پہلے جلال نے اس کو ترک کیا اور پھر رفتہ رفتہ یہ دور ختم ہو کر جدید دور شروع ہوا جس میں اساتذۂ دہلی کا تتبع کیا جاتا ہے، لیکن سوز و گداز پیدا کرنے میں کہیں کہیں مرثیہ کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو غالباً انیس و دبیر کی وجہ سے رائج ہوا اور مذہبی اثرات نے بھی اس کو تقویت پہونچائی۔

اس باب میں زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں، اُس عہد کے شعرار کا انتخاب کلام بجائے خود ایک ایسی کھُلی ہوئی تنقید ہے جسمیں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔

ناسخ کا ایک شعر ہے:۔

راستی کا نام بھی اس شہر میں سُنتے نہیں   کیوں نہ ہوں سب لکھنؤ کے کوچہ و بازار کج

حیرت ہے کہ ناسخ نے لکھنؤ کی ناراستی میں کوچہ و بازار کا ذکر تو کیا، لیکن خود اپنے ذوق سخن کو بھول گئے جس سے زیادہ ناراست چیز شاید ہی کوئی دوسری پیدا ہوئی ہو۔

اب لکھنؤ کی بدنام و رسوا شاعری کے چند نمونے ملاحظہ کیجئے جو رعایت لفظی، ابتذال معنوی، مبالغہ، عریانی، ایہام اور

---

[1] جرأت کے بعض اشعار اس رنگ کے ملاحظہ ہوں:۔

کیا کہیں وصل ہوئے پھر بھی زباں سے اپنے   حرف مطلب نہ کبھی خوف کے مارے نکلا

کیا جانے کمبخت نے کیا ہمپہ کیا سحر   جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

شب اسنے توڑ کر موتی کے سمرن مجھ سے گنوائے   دکھایا وصل میں عالم نیا اختر شماری کا

چاہ کی چتون مری آنکھ اسکی شرمائی ہوئی   تاڑلی مجلس میں سب نے سخت رسوائی ہوئی

آخری شعر اس رنگ کا ہے جسے بعد کو داغ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا اور تکمیل تک پہونچا کے چھوڑا۔

رکیک تشبیہات وغیرہ متعدد اسقام سے لبریز ہیں:-

ناسخ:-

آج ہوتا ہے دلا درد جو میٹھا میٹھا — دھیان آیا ہو تجھے کس کے لب شیریں کا

جو میٹھی میٹھی نظروں سے وہ دیکھے — کہوں آنکھوں کو میں، بادام شیریں

کا فرِ خطِ استوا بدن کا — تیری سونے کی کردھنی ہے

کیا پڑ گیا ہے عکس تری چشم مست کا — نرگس کی شاخ بنگئی ہر موج آب میں

دے دو پٹا تو اپنا ململ کا — ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

شکم صاف کے قریں ہے کمر — یا ہے مخمل پہ خواب مخمل کا

آتش رخ سے آنکھ سینکتے ہیں — کیا زمستان میں کام منقل کا

دیکھکر تجھ کو نہ کیونکر نعرہ زن ہوں سب رقیب — بیشتر کتوں کو بھکواتا ہے جلوہ ماہ کا

مجھ سے ہلوا تا ہو اب لزم جنوں زنجیر کی — اور کوہِ عشق کی کہتا ہے تو مگدر اٹھا

بالوں کا کچھ اثر بغلِ یار میں نہیں — پڑتا ہے عکسِ زلف سیہ فام دوش پر

مجھکو سودائی بنایا ہے دکھا کر آنکھیں — تم دھتورے کا لیا کرتے ہو بادام سے کام

تیری ایسی انگلیاں ہیں استخوان جنکے نہیں — پور پور ان کی مگر خرمائے تر بے خستہ ہے

تو وہ خورشید ہے اٹھے جو گلستاں میں نقاب — چہرۂ گل میں تلون ہو وہیں حربا کا

خصیہ ہائی اغنیا کی ہو عبث لے اہل حرص — نقد سے خالی ہمیشہ کیسۂ دلاک ہے

تیرے تلوے اور رو کے منہ سے سوا شفاف ہیں — آئینہ بھی انکے آگے صاف جھانواں ہو گیا

ملگیا ہے عشق کا آزار قسمت سے مجھے — ہوں جو عیسیٰ بھی ارادہ ہو نہ استعلاج کا

ناک گڑتے ہر گھڑی کیونکر نہ انکے سامنے — بدلے نتھنی کے سلیماں کی ہو خاتم ناک میں

مر گئے ایسے ہو کے لاغر ہم — سوئی لایا ہے گورکن اپنا

ہوں میں عاشق انار پستاں کا — ہوں نہ تربت پہ جز انار درخت

آتش:-

کسی کے محرم آب رواں کی یاد آئی — حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

بوسہ بازی سے مری ہوتی ہو ایذا ان کو — منھ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں مہاسے پیدا

لب شیریں کی تری چاشنی ممکن نہ ہوئی — رس سے تیرے شکر ہوئی شکر سے بتاشے پیدا

نہ بھول بیٹھ کے بالائے سروائے قمری — چڑھے جو بانس کے اوپر یہ کام ہے نٹ کا

یہ جانتے تو تمھیں ہم نہ باندھنے دیتے — کمر کے ساتھ لپیٹے گا ناف کو ٹپکا

بیتاب دل کو تسکیں ہوتی ہے دیدِ خط سے — وہ بوٹی ہے یہ جس سے پارے کو مارتے ہیں

وہ تنک مشرب ہیں ہم خمخانۂ افلاک میں — نشۂ زر ہو ہمیں گر شربت دینار کو

کیا اُستاد کو شاگرد اُس طفل پری رو نے — پڑھایا روزِ بسم اللہ علم عشق ملا کو

فکر سے خدا کے ملتے ہیں مضموں مجھے بلند — فکرِ رسا کمند ہے کعبہ کے بام کی

رند :- ہے عیاں حال سگِ اصحابِ کہف — جانور کی آدمیت دیکھ لی

ہے خوف جان کا ایسے بھنکیت سے ہر دم — بتا کے باہرہ قاتل کہیں نہ، ہول چلے

ساری رگیں ہوئی ہیں تنِ زار پر نمود — ناطاقتی نے جسم کو مسطر بنا دیا

رونے کی تجھے لہر جو اے چشمِ تر آئی — کوسوں نظر آئے گا نہ ٹاپو نہ ترائی

آتا ہے نام آوریِ کوہکن پہ رشک — اس منڈ چڑے نے پھوڑ کے سر کیا نمود کی

وہ ساتھ رکھتے ہیں اس طرح مجمعِ عشاق — صحابہ ساتھ لئے جس طرح رسول چلے

کیونکر نبھے گی ہم سے ملاقات آپ کی — واللہ کیا ذلیل ہے اوقات آپ کی

ہرجائی پن کی آپ کے کچھ انتہا نہیں — کٹتا ہے دن کہیں تو کہیں رات آپ کی

مجنوں کو کس قدر سگِ لیلیٰ عزیز تھا — دیوانے ہیں جو ہم ترے کتے کو "تو" کریں

خلیل :- دُکھتی ہیں آنکھیں حسنِ پر آشوبِ یار سے — گھبرا لگا ہے موت کا جب سے نگاہ کی

بغل میں بیٹھیے دل کی طرح سے آپ اگر — میں پاؤں پڑتا ہوں اُٹھئے نہ دوسری طرح

وصل کی شب پلنگ سے اوپر — مثلِ چیتے کے وہ مچلتے ہیں

کیا لکھوں شورشِ دل کاغذ میں — تاؤ کاکل کی طرح کھائے گا

ہم کیا قمارِ عشق میں گھاتیں بتائیں گے — وہ خود جواریوں سے بھی زیادہ ہیں چالئے

دیکھی شبِ وصال ناف اُس کی — روشن ہوئی چشم آرزو کی

سینہ پہ نہیں گھاؤ تری تیغ کا قاتل — یہ دل میں مرے نیو محبت کی پڑی ہے

صبا :- صبحِ شبِ وصال ہے کیوں نعرہ زن ہوں — پڑتی ہے موگری مرے دل پر گجر کے ساتھ

بوسہ کے مانگنے پہ نہ یوں منھ تھوتھائیے — یہ ناز جا کے اور سے اے نازنیں رہے

کون پوچھے گا اسے زلفِ بتاں کے سامنے — زاہدو بالفرض داڑھی پر خدا کا نور ہو

صندل سی وہ کلائیاں اپنے گلے میں ہوں — ہاتھ پیر یاں نصیب ہوں چندن سی ران پر

روپ پر ہے یار کا باغِ جوانی دیکھئے — کیا شگوفہ لائے سینہ کا ابھار ابکی برس

اے صبا جذبہ پہ جس دن دلِ ناشاد آیا — اپنی آغوش میں اڑ کر وہ پری زاد آیا

پیغامِ وصل پر وہ مری بوٹیاں اڑائیں — دانتوں سے دیں جواب زبانِ سوال کا

وزیر :- سبزۂ خط دیکھکر ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے — جانور صدقے میں چھوٹے دو کچھ اب صیاد کو

رنگ کندن سا تمھارا ہی عجب کیا ہے اگر — طوطی سبزۂ خط سونے کی چڑیا ہو جائے

لڑائی وصل میں اس جنگجو سے ہونے والی ہے — کٹاری گلبدن کے پائجامے نے نکالی ہے

لگا مضمون ہاتھ اس کان کی بالی کی مچھلی کا — یہ ہم نے چشمۂ خورشید سے مچھلی نکالی ہے

اس زمانہ میں آتش نے بیشک بڑی حد تک جذبات نگاری سے کام لیا لیکن کہیں کہیں وہ بھی بہک گیا اور اس کے شاگردوں میں تو سوائے ایک دو کے سب نے ناسخ ہی کا تتبع کیا - ہر چند اس زمانہ میں یہاں مصحفی و انشا بھی موجود تھے، لیکن انشار درباری شاعر تھا اور اس کا کام صرف نواب سعادت علی خاں کو خوش رکھنا تھا اس لئے اس کی ساری عمر مسخرہ پن میں گزری اور سوائے لفاظیوں اور بیجا تصنع و آورد کے صحیح رنگ تغزل سے اس کو کوئی سرو کار نہیں رہا، لیکن آدمی چونکہ بہت ذہین و قابل تھا اس لئے کسی صنف سخن میں بند نہیں تھا، اور اپنی فطری ذکاوت کی وجہ سے غیر معمولی کامیابی حاصل کر لیتا تھا۔ مصحفی کی رسائی گو نواب کے دربار میں نہیں ہوئی لیکن انشار کے جھگڑے نے انھیں بھی پھکڑ پن پر مجبور کر دیا تھا جس حد تک نفس شاعری اور غزلگوئی کا تعلق ہے مصحفی کا مرتبہ انشار سے بہت بلند ہے، لیکن زبان میں کوئی خاص ترقی ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ مصحفی اپنی پُرگوئی کے لحاظ سے سودا سے کسی طرح کم نہ تھے اور مشکل زمینوں میں ایسے ایسے صاف شعر نکالتے تھے کہ جواب نہیں۔ لکھنؤ کی صحبتوں نے انشار کے ساتھ مصحفی کی شاعری پر بھی اثر ڈالا اور کہیں کہیں آورد و صنعت کی وہ جھلک ان کے یہاں نظر آنے لگی جو یہاں مقبول تھی۔ ہزاروں غزلیں انھوں نے لکھ لکھ کر فروخت کر ڈالیں اور اس پر بھی ۶ - ۷ دیوان اپنے بعد چھوڑے کہ اگر ان کا انتخاب کیا جائے تو بہترین اشعار کی تعداد بڑے سے بڑے دیوان سے بڑھ سکتی ہے۔ الغرض اس دور میں مصحفی اپنے فن کا امام تھا اور غزلگوئی میں ایسے ایسے پاکیزہ اسلوب بیان پیدا کر گیا کہ اس سے قبل کسی شاعر کو اس حیثیت سے مصحفی کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

الغرض دہلی اجڑنے کے بعد لکھنؤ میں جو صورت غزلگوئی کی پیدا ہوئی وہ کسی طرح پسندیدہ نہ تھی اور شاید یہ دور عرصہ تک،

قائم رہتا اگر شاہان مغلیہ کے بالکل آخری دور میں ذوق، مومن، غالب نہ پیدا ہو جاتے۔ ذوق اپنی ہمہ گیر طبیعت کے لحاظ سے سودا کی سی خصوصیات رکھتے تھے اور ہر چند غزلگوئی میں وہ اپنے اُستاد شاہ نصیر ہی کی طرح جذبات سے الگ تھلگ رہے لیکن قصائد میں ان کا مرتبہ کسی طرح سودا سے کم نہ تھا، اور زبان کی صحت و صفائی، الفاظ کی چھان بین، کلام کی تازگی، محاورہ کی برجستگی ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں، ان کے کلام میں کہیں سودا کا انداز ہے، کسی جگہ درد کا اور کہیں کہیں جرأت کا۔ یہ فطرت کی طرف سے کوئی مخصوص ذوق لیکر نہ آئے تھے بلکہ سعی و اکتساب سے ہر رنگ میں کہنے کی کوشش کرتے تھے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔ اس وقت تک زبان متروکات کے بعد بہت صاف ہو گئی تھی، مثلاً:-

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا ۔۔۔ تم وقت پہ آپہونچے نہیں ہو ہی چکا تھا

عبث تم اپنی رکاوٹ سے منھ بناتے ہو ۔۔۔ وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

ہے تیرے کان زلف معنبر لگی ہوئی ۔۔۔ رکھیگی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

لیکن ذوق کے یہاں صحیح تغزل کی روح مفقود ہے۔ البتہ اس کمی کو اس عہد کے جن شاعروں نے پورا کیا وہ مومن و غالب تھے۔ ان دونوں نے غزل میں فارسی ترکیبوں کو حد درجہ خوبی و لطافت کے ساتھ استعمال کیا، اور یہ انداز اتنا مقبول ہوا کہ آج بھی ہندوستان کے تمام شاعروں کا مطمح نظر اسی کا تتبع ہے۔

غالب کا اُردو کلام بہت تھوڑا ہے اور اس میں بھی صحیح رنگِ تغزل چوتھائی حصہ سے زیادہ نہیں۔ مومن نے البتہ بہت کہا اور خوب خوب کہا۔ ان کے لطیف اشارے کنائے، ان کی شیریں ترکیب الفاظ، ان کا سوز و گداز اور باوجود عشق بازاری کے انکے خیالات کی بلندی اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ اور طرزِ ادا کا تو حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ تھا۔ غالب کے اُردو کلام کا ایک حصہ تو وہ ہے جسے فارسی کے کلیات میں شامل ہو جانا چاہئے۔ مثلاً:-

اسدہم وہ جنوں جولاں گدائے بیسر و پا ہیں ۔۔۔ کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

ہوائے سیر گل، آئینۂ بیمہری قاتل ۔۔۔ تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

دوسرا حصہ وہ ہے جس میں فارسی ترکیبیں گوارا صورت سے اختیار کی گئی ہیں مثلاً:-

غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو ۔۔۔ ہمیں دماغ کہاں خندہ ہائے بیجا کا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں ۔۔۔ شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

یہ رنگ ان کا تنوع بیان کے لحاظ سے بہت دلکش ہے۔ لیکن اس سے بہتر ان کا وہ رنگ ہے جس میں انھوں نے سادگی و سلاست سے کام لیا ہے مثلاً:-

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　ناامیدی اسکی دیکھا چاہیے

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تری عادت ہی سہی

لیکن یہ رنگ ان کے یہاں بہت کم ہے اور اس میں بھی سوز و گداز خال خال کہیں نظر آتا ہے۔ برخلاف اس کے مومن کے یہاں عشق و محبت کی گرمی اور سوز و گداز ہر جگہ نمایاں ہے، خواہ انھوں نے فارسی ترکیبوں سے کام لیا ہو یا سلاست و روانی سے۔ پھر اندازِ بیان کی جدتیں، اسلوب ادا کا تنوع اور فارسی کی شیریں ترکیبوں کے ساتھ تو اسقدر لطیف کنائے کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تغزل کے تمام پہلوؤں سے بحث کرنا چاہے تو صرف مومن کا دیوان سامنے رکھ لینا کافی ہے۔ چند اشعار مختلف جذبات تغزل کے ملاحظہ ہوں:۔

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

غیر سے سرگوشیاں کر لیجیے پھر ہم بھی کچھ　　آرزوہائے دلِ درد آشنا کہنے کو ہیں

جاں نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں　　جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں　　اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے　　اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری　　چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

کیا کیجئے کہ طاقتِ نظارہ ہی نہیں　　جتنے وہ بےحجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

ماںوں گا نصیحت پہ نہ سنتا میں تو کیا کرتا　　کہ ہر ہر بات پر ناصح تمھارا نام لیتا تھا

مومن تو خیر دہلی سے باہر کہیں گئے نہیں لیکن غالب نے رامپور پہونچکر لکھنؤ کی شاعری کو کافی متاثر کیا اور آخر کار لکھنؤ میں جلال ایسے کہنے والے پیدا ہوئے اور ناسخ کی پیدا کی ہوئی بیہودگیاں رفتہ رفتہ کم ہوئیں۔

جیسا کہ ابھی ہم نے بیان کیا ناسخ نے غزلگوئی کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی، لیکن زبان کی تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے ناسخ کی خدمات بہت اہم ہیں کیونکہ میر حسن و شاہ نصیر، سودا و میر اور مصحفی انشا تک کے زمانہ کے تمام ثقیل الفاظ اور نامانوس محاورات اس نے ترک کر کے زبان کو ایک صیقل شدہ آئینہ کی صورت دیدی۔

میر حسن و شاہ نصیر کے زمانہ میں الفاظ لوہو۔ نت۔ نپٹ۔ ٹک، جگ، ہیگا، خاتخواہ، مت، کبھو، سمیت وغیرہ کثرت سے استعمال ہوتے تھے لیکن ناسخ نے ان سب کو ترک کر دیا۔ اسی طرح میر و مرزا کے عہد کے بہت سے مفرد و مرکب الفاظ کی اس نے اصلاح کی اور بعض کا استعمال یک لخت چھوڑ دیا۔ چنانچہ اور۔ اُودھر۔ بیچ۔ تئیں۔ کریو۔ لاگا۔ تیں۔ تجھ بن۔ پھرتے ہے۔

میاں۔ سجن۔ کھوج۔ رُل جانا۔ وتے۔ دیوتے۔ وغیرہ سیکڑوں الفاظ کی اصلاح کرکے زبان کو بہت مہذب و شایستہ کردیا۔

اس لئے جس حد تک صرف زبان کی اصلاح کا تعلق ہے ناسخ کی خدمات نہایت وزنی نظر آتی ہیں اور اسی نسبت سے لکھنؤ کو دہلی پر ترجیح دینا پڑتی ہے، لیکن تغزل کے لحاظ سے لکھنؤ کو دہلی سے کوئی نسبت نہیں ہے اور سوائے چند شاعروں کے کہ انھوں نے تو بیشک جذبات نگاری سے کام لیا، باقی سب نے ضلع جگت ہی میں وقت ضایع کیا دہلی میں بھی ایہام گوئی اور رعایت لفظی کی مثالیں ملتی ہیں لیکن بہت کم اور اگر شاہ نصیر و ذوق کو علحدہ کردیا جائے تو کوئی ایک شاعر بھی ایسا نہ نکلے گا جس نے اپنی غزلگوئی کی بنیاد جذبات نگاری پر نہ قایم کی ہو۔

لکھنوی شاعری کا یہ بدنما دور امیر مینائی کے وقت تک رہا، لیکن اس کے بعد شاگردانِ مومن و غالب کا کلام پھر مقبول ہونے لگا اور خود اہلِ لکھنؤ نے بھی آخرکار اس کو محسوس کیا کہ شاعری نام ضلع جگت کا نہیں بلکہ واردات قلب سے بحث کرنے کا ہے سب سے پہلے یہ احساس جلال کو ہوا اور اس کے بعد جب شعراء دہلی نے رامپور پہونچکر لکھنوی شعراء کو متاثر کیا تو رفتہ رفتہ وہ تمام نقائص و معائب دور ہونے لگے، حتے کہ اس وقت کوئی ایک بھی قابل ذکر شاعر لکھنؤ کا ایسا نہیں ہے، جو دہلوی اسکول کا پیرو نہ ہو، برخلاف اس کے دہلی کی حالت یہ ہوئی کہ شاگردان غالب کے بعد دہلی میں کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا اور اگر کوئی ہوا بھی (جیسے سائل و بیخود) تو استاد کے درجہ کا کہ غریب کو دہلی اسکول میں تو خیر کیا جگہ ملتی، لکھنؤ اسکول نے بھی نہ پوچھا۔ اور یہ دہلی کی وہ آخری اور حقیقی تباہی ہے جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے

دہلی کی سرزمین سے سب سے آخر میں داغ اُبھرے، لیکن ان کو دہلی اسکول کا شاعر کہنا درست نہیں کیونکہ اُن کے یہاں سوز و گداز بہت کم پایا جاتا ہے۔ چونکہ انھوں نے شاعری میں جرأت کی تقلید کی تھی اس لئے ان کو لکھنوی اسکول کا غزلگو کہنا چاہئے لیکن ناسخ کے دور کا نہیں جلال و امیر کے دور کا اور اگر ان میں باہم کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ جس بازاری رنگ کی شاعری داغ نے کی، اس کے لئے وہ پیدا ہوئے تھے اور امیر اس کے بھی اہل نہ تھے۔ رہ گئے جلال سو وہ یقیناً داغ سے بہتر اور امیر سے بدرجہا بہتر کہنے والے تھے اب یہ اور بات ہے کہ وہ حیدر آباد پہونچ نہ سکے اور رامپور پہونچے تو امیر مینائی پہلے سے نواب کا پہلو دبائے بیٹھے تھے۔

ذیل کے اشعار سے واضح ہوگا کہ جلال کا مرتبۂ شاعری کیا تھا اور اگر قدرت سرزمین اودھ سے اسکو پیدا نہ کرتی تو دورِ ناسخ کے گناہوں کا کفارہ کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ صفائی زبان، ندرتِ بیان، جذباتی رنگ، حلاوت و ملاحت، اس کے یہاں کیا نہیں ہے۔

تغافل کے گلے سُنکر جھکا لیں تمنے کیوں آنکھیں
مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بیباک ہونا تھا

اگرچہ ایک بھی تسکین کا جواب نہ تھا
مگر کچھ آتے ہی قاصد کے اضطراب نہ تھا

کسے خبر جو ہوئیں مجھ میں یار میں باتیں
یہاں خطاب نہ تھا کچھ، وہاں جواب نہ تھا

گلہ ہے ہم سے کہ تم ضبط گریہ کر نہ سکے
ہنسی جب آگئی اُن کو کب اختیار رہا

کب آئے گا کوئی مجھ تک جواب دیتا جا
تسلیاں بھی تو اے اضطراب دیتا جا

مری داستانِ فراق نے شب وصل طرفہ مزا دیا
کبھی مینے رو کے ہنسا دیا، کبھی اسنے ہنس کے رُلا دیا

نہ خوفِ آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا
بڑا کلیجہ ہے ان دل دکھانے والوں کا

جو دل نہ ہو گا ہوس کا مجھ کو غم بھی نہیں
سنا رہی ہے تری آرزو کہ ہم بھی نہیں

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا راز
آنکھ کم بخت سے پہچان گئے تم مجھ کو

کردے خبر اس خانہ برانداز سے کوئی
روتا ہے کہیں درد کی آواز سے کوئی

دعوے کرتے تو ہو وفا کے جلالؔ
دیکھو وہ شوخ بے وفا نہ سُنے

دورِ حاضر کی غزلگوئی خواہ وہ لکھنؤ میں ہو یا لکھنؤ سے باہر بالکل دہلوی رنگ کی ہے اور اب عام احساس اس امر کا ہو چلا ہے کہ تغزل کا تعلق صرف جذبات سے ہے اور کوشش کیجاتی ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ تاثرات کا نتیجہ نظر آئے نہ کہ محض تصورات کا۔

لکھنؤ اور مختلف اصناف سخن

فرمانروایان اودھ کا زمانہ بھی عجیب زمانہ تھا، دولت کی افراط تھی اور اسباب مسرت و نشاط کی فراوانی، ہر علم و ہنر کا اُستاد لکھنؤ میں اکٹھا تھا اور ہر فن کا ماہر یہاں موجود۔ یہاں کا ایک شاعر اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:۔

لکھنؤ اہلِ ہنر کے لئے ٹکسال ہے آج — رند کھل جاتا ہے یاں کھوٹے کھرے کا پردہ

چنانچہ دیگر علوم و فنون کے علاوہ شاعری بھی اپنے ماحول سے متاثر ہو کر ایک خاص صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ سلطنت میں شیعی مذہب کی ترقی معراج کمال تک پہونچ گئی تھی۔ اور تمام امرا و شرفا مجالس عزا میں شرکت ضروری سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ غیر مسلم امرا بھی شہید کربلا کے غم میں آنسو بہانا باعث فخر و سعادت تصور کرتے تھے۔ اور سال میں شاید دو ہی چار دن ایسے گزرتے ہوں کہ جب کسی نہ کسی تقریب میں مجالس عزا نہ برپا ہوتی ہوں ان مجالس میں میر ضمیر، میر خلیق، میاں دلگیر، اور دبیر و انیس کے مرثیے پڑھے جاتے تھے اور اس طرح سیکڑوں دردناک اشعار بچے بچے کو حفظ ہو گئے تھے۔ چونکہ اُس وقت لکھنؤ نصف شیعہ تھا اور مذاق شاعری پر مذہب اثر انداز ہو رہا تھا اس لئے اس باب میں شیعہ سنّی کی کوئی قید باقی نہ رہی، چنانچہ منشی امیر احمد نے بھی جنکا شمار حنفی علما میں تھا مصائب اہلبیت پر مسلسل اشک بہائے اور اس سعادت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ان کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کیا اثر نام علی میں ہے کہ لیتے ہی امیر — کام بگڑے ہوئے جتنے ہیں سنور جاتے ہیں

جو کربلا میں شاہِ شہیداں سے پھر گئے — کعبہ سے منحرف ہوئے قرآں سے پھر گئے

امیرِ خستہ جاں آفت میں ہے یا حیدرِ صفدر — کرو امداد اسکی وقت ہے مشکل کشائی کا

امیر اپنا دلِ پُر داغ سوئے کربلا لے چل — یہ گلدستہ ہے نذرِ روضۂ شبیر کے قابل

اسی کے ساتھ اس وقت کی معاشرت پر بھی اک نگاہ ڈالئے۔ سامانِ عیش و عشرت کی فراوانی نے ایک عام کیفیت نشاط پیدا کر دی تھی اور ولادت، عقیقہ، بسم اللہ، شادی وغیرہ کوئی تقریب ایسی نہ ہوتی تھی جس میں رقص و سرود کی بزم منعقد کرنا فرض نہ سمجھا جاتا ہو۔ پھر یہ رنگ اسی جگہ ختم نہ ہو جاتا تھا بلکہ علم مجلس سیکھنے، گفتگو میں لوچ اور حلاوت پیدا کرنے کے لئے شاہدان بازاری کی صحبت اس وقت کی تہذیب میں شامل ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ واجد علی شاہ اختر سریر آرائے سلطنت ہوئے اور لکھنؤ کی یہ رنگینیاں بڑھکر خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ گئیں۔ تقریباً ۸ سال تک انھوں نے وہ دادِ عیش دی کہ محمد شاہ رنگیلے کی یاد دلوں سے محو ہو گئی۔ اور ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہاں کی شاعری کے رجحانات کیا ہو جانے چاہئے تھے چنانچہ صاحب شعر الہند نے اس وقت دہلی و لکھنؤ اسکول کی شاعری کا جو فرق لکھا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ:-

(۱) لکھنؤ کے تمدن و معاشرت میں بالعموم نسائیت پیدا ہو گئی تھی اور اس کا اثر داخلی وہاں کی شاعری پر پڑا۔

(۲) فارسی، تراکیب کا لکھنوی شعراء کے یہاں فقدان تھا۔ لیکن شعرائے دہلی کا کلام اس سے مالا مال تھا۔

(۳) شعرائے دہلی مختصر غزلیں کہنے کے عادی تھے اور لکھنؤ میں سیر حاصل غزلیں لکھی جاتی تھیں اور اسوجہ سے ابتذال کا رنگ نمایاں تھا۔

(۴) شعرائے لکھنؤ میں روحانیت کا فقدان تھا اور خارجی اوصاف و لوازم کا ذکر اس کثرت سے ہوتا تھا کہ تغزل کا لطف حاصل نہیں ہوتا تھا۔

(۵) رعایت لفظی کے ساتھ ابتذال لکھنوی شاعری کا طرۂ امتیاز ہو گیا تھا۔

ہر چند رعایت لفظی و ایہام کی شاعری اہل دہلی نے بھی کی ہے یہاں تک کہ میرؔ، مومنؔ و غالبؔ کا کلام بھی اس سے خالی نہیں اور ابتذال و سخافت کے اشعار ان کے یہاں بھی ملتے ہیں، لیکن ان سب کا عمومی رنگ جذبات نگاری تھا حتے کہ شاہ نصیر اور ذوقؔ کا کلام بھی جو دہلی کے دو بڑے زبردست غیر حقیقی شاعر تھے اس سے خالی نظر نہیں آتا۔

غزل مولانا نیاز صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:-

> "شاعری کے تمام اصناف میں غزل گوئی جس قدر بلند چیز ہے کوئی نہیں، روح کی گہرائیوں اور قلب کے اعماق سے خبردار کرنے والی چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف غزل ہے، اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ غزل کا ارتقا تصوف ہے مگر تصوف سے مراد وہ علوئے فطرت، وہ عروج روحانیت اور وہ استعلائے تصور ہے جہاں انسان مادیت سے گزر کر اپنے مرکز اصلی، نور ربانی اور جلوۂ حقیقی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے اور تمام امتیازات دنیاوی کو جن میں امتیاز مذہبی بھی شامل ہے محو کر دیتا ہے۔ پھر جو شخص فطرتاً شاعر ہوتا ہے وہ اپنی اول منزل میں بھی جو منزل لب بام ہوا کرتی ہے،

شاہد اصلی کے جلوہ کو سامنے رکھتا ہے اور دنیاوی زیر و بم میں بھی اس نغمۂ سرمدی کو سنتا رہتا ہے جو ہر دم اسکو اپنی لذت سے بیخود رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر اختلاف استعداد کے لحاظ سے ایک مخصوص درجہ سے آگے نہیں بڑھتا اور بہت کم ایسے ہیں جو بیدل کے مرتبہ تک پہونچنے میں کامیاب ہوں لیکن ایک فطری شاعر خواہ وہ کتنی ہی ابتدائی منزل میں کیوں نہ ہو اس سوز و گداز، اس درد و تاثیر، اس عذوبت بیان، اس حلاوت زبان اور اس حقیقت و صداقت سے معرا نہیں ہو سکتا، جو صرف فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے اور کوشش سے حاصل نہیں کی جاسکتی"۔

اس سلسلہ میں مولانا نیاز نے بھی لکھنوی شاعری پر وہی اعتراضات کئے ہیں جو صاحب شعر الہند نے قائم کئے ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ لکھنوی شاعری کا دور اول جس نے پست ماحول، اخلاقی فرومایگی اور مذہبی تنگ نظری میں آنکھیں کھولی تھیں وہ بقول نیاز صاحب یقیناً صرف ناسخ و وزیر ہی پیدا کر سکتا تھا جن کی شاعری الفاظ کی طلسم بندی، کنگھی چوٹی۔ بے معنی صنایع اور اسی قسم کی بہت سی سطحی اور غیر سنجیدہ خصوصیات کے علاوہ کچھ نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ دور ثانی میں اسیر، امیر، جلال، منیر، محسن تسلیم وغیرہ ایسے شاعر ضرور پیدا ہوئے جنھوں نے اس رنگ کو ترک کر کے ایک اور کیفیت غزل میں پیدا کر دی جس میں دہلی کے جذبات کی سادگی اور لکھنؤ کی رنگینی دونوں کا امتزاج تھا۔

ریختی | غزل کی ایک بگڑی ہوئی شکل ریختی کہلاتی ہے اور سعادت یار خاں رنگیں اس صنف کے موجد تسلیم کئے جاتے ہیں، لیکن مرزا قادر بخش صابر اس دعوے کی تردید کرتے ہیں کہ:-

"یہ ادعائے محض ہے اسواسطے کہ انشاء سے بہت پہلے ریختیاں مشہور اور السنۂ عوام پر مذکور تھیں"۔

تذکرۂ گلستان سخن میں ہے کہ:-

"زبان اردو میں اول ریختی کا رواج انشاء اللہ خاں انشاء نے دیا۔ اور اس کے بعد سعادت یار خاں رنگین نے خواہ اس سبب سے کہ اُن کی طبیعت کو خود اس صنف کلام کی طرف التفات تھا خواہ انشاء اللہ خاں کے اثر صحبت سے اس نظم میں ایسی زبان آوری کی گویا اس کو اپنا شعار کر لیا، اب اس عرصہ میں یار علی جان نے کمال جانکاہی کی اور اس نظم کی مشق حد کمال تک پہونچائی"۔

تذکرہ مہر جہانتاب میں بھی انشاء کو ریختی کا موجد تسلیم کیا گیا ہے اور رنگین کو صرف شریک مشورہ قرار دیا ہے۔

صاحب شعر الہند نے لکھا ہے کہ:-

"یہ صنف اس قدر غیر مہذب الفاظ و مضامین کا مجموعہ ہے کہ اس دور تہذیب و شائستگی میں ان کے دو چار شعر کے

نقل کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے۔"

گو میں اس سے متفق نہیں ہوں، کیونکہ بہت سے شعرا ایسے نکل سکتے ہیں جن کو یقیناً پیش کیا جا سکتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ جس حد تک عورتوں کی زبان، اور اُن کے مراسم وغیرہ کا تعلق ہے، ریختی کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اس صنف سخن میں انشا، رنگین اور جان صاحب بہت مشہور ہوئے ہیں۔

واسوخت | ایرانی شعرائے دور متاخرین میں جب معاملہ بندی نے ترقی کی اور ان کے اداکرنے کے لئے غزل کا دامن تنگ نظر آنے لگا تو وحشی یزدی نے واسوخت کو ایجاد کیا، اُردو میں سوداؔ نے سب سے پہلے اس کے اتباع میں واسوخت لکھی جس کی ہئیت فارسی زبان میں تھی۔ تذکرہ گلدستۂ نازنیناں میں جراؔت کی واسوخت بھی ہماری نظر سے گزری ہے۔ متوسطین کے دور میں آتشؔ نے بھی واسوخت لکھی اور اُس کے بعد شعرائے لکھنؤ نے اس کو اپنا محبوب ترین موضوع بنا لیا۔ یہاں تک کہ اس کا اثر غزل پر بھی پڑا۔ منشی امیر احمد نے واسوخت لکھی جو مینائے سخن کے نام سے شایع ہو چکی ہے۔ لیکن اماؔنت نے اس صنف خاص میں بہت شہرت پائی اور مرثیوں سے کچھ عناصر علٰحدہ کر کے واسوخت میں شامل کر لئے چنانچہ پروفیسر آزاد نے لکھا ہے کہ:۔

"سب سے پہلے ضمیر نے مرثیہ میں سراپا لکھا اور پھر امانت اور دوسرے شاعروں نے واسوخت میں اسکو داخل کیا"

تذکرۂ شعر الہند میں امانت کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

"امانت کی واسوخت میں اور بھی چند باتیں ایسی جمع ہو گئیں جو اُس زمانہ میں نہایت مقبول تھیں اور اسی لئے وہ تمام واسوختوں میں بہت مشہور ہو گئی۔"

تذکرۂ مہر جہانتاب میں امانت کے حالات میں لکھا ہے:

"ایں واسوخت کہ حالا شہرتے تمام دارد اگر راست پرسی در مراعات النظیر و دیگر صنایع بے نظیر اُفتادہ و بلطف سخن و چستی بندش بے سہیم۔"

اب اردو میں یہ صنف سخن مقبول نہیں ہے۔ لیکن بعض قدامت پرست البتہ تبرکاً و تیمناً کبھی کبھی واسوخت کہہ لیا کرتے ہیں۔

قصیدہ | قصیدہ گوئی کی اصلی ترقی قدما کے دوسرے دور میں ہوئی اور سوداؔ نے اس صنف میں سب سے زیادہ شہرت و ناموری حاصل کی شعر الہند میں سوداؔ کی قصیدہ نگاری کے متعلق حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:۔ سوداؔ نے جہاں تک ممکن ہوا ہے قصیدہ کی متانت و پختگی، الفاظ کی شان و شوکت اور مضمون آفرینی پر پورا زور طبع صرف کیا ہے۔ اس نے مشکل لیکن دل آویز ردیفیں اختیار کی ہیں اور انکو نہایت خوبی سے نباہا ہے۔ قصائد میں بہاریہ تمہید ایک عام چیز ہے لیکن سوداؔ نے جدید تمہیدیں لکھی ہیں اور نہایت پر لطف طریقہ سے گریز کیا ہے اور قصاید کو صرف حمد و نعت و مدح و ستائش ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ بعض قصاید میں

واقعہ نگاری بھی کی ہے اور ہر درجے کے لوگوں کے مشاغل اُن کے کاروبار اور اُن کے پیشے کا اس تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ اُس سے اجمالاً اُس دور کی تمدنی اور اقتصادی حالت معلوم ہو سکتی ہے" لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ سودا نے بعض جگہ ابتذال و فحاشی سے بھی کام لیا ہے۔ انشاء نے بھی قصاید لکھے ہیں لیکن شیفتہ ان کے متعلق یہ عام فیصلہ کر چکے ہیں کہ:۔

"ہیچ صنف را بطریقۂ راسخہ شعرانہ گفتہ"

لکھنوی شعراء میں قصیدہ نگاری کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوئی ناسخ و آتش نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی، اخیر میں محسن کاکوروی نے نعت کے بعض نہایت زوردار قصاید لکھے، متاخرین میں منیر، امیر، جلال نے قصاید لکھے ہیں لیکن کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکے۔

مرثیہ مرثیہ کے لفظی معنی وصف میت کے ہیں اور اصطلاح شاعری میں مرثیہ اُس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں شخص متوفی کے محاسن و فضایل درد و حسرت کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے، یادگار انیس کے مصنف نے مرثیہ پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:۔

"درد و غم کا جذبہ تمام جذبات انسانی سے قوی تر ہے اور حسرت و مصیبت کی کہانی عیش و شادمانی کی داستان سے زیادہ باثر اور آنسوؤں کے تار یا گجرے کی لڑیوں سے زیادہ دلکش ہے، رنج و آلام سے متاثر ہونا فطرت انسانی کا خاصہ ہے اس لئے مرثیہ کا اثر قصیدہ اور منقبت سے زیادہ دیرپا ہوتا ہے ہر ایک مصرع دلوں پر نشتر چلاتا ہے اور ہر ایک شعر آہ و زاری کا مینہ برساتا ہے، یوں تو مرثیہ ہر مصیبت اور تباہی میں کہا جا سکتا ہے لیکن ہمارے ملک میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر حضرت حسینؑ اور ان کے رفقا کے احوال شہادت پر ہوتا ہے۔

عرب میں مرثیہ گوئی کا عام رواج تھا اور ایام جاہلیت ہی میں یہ فن کافی ترقی کر چکا تھا عبد المطلب اور بعض دیگر ناموروں کے مرثیے عربی ادبیات میں اس وقت تک محفوظ ہیں اور حماسہ میں ایک مستقل فصل باب المراثی کے عنوان سے موجود ہے آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کے بعد بھی مرثیہ گوئی کو زوال نہیں ہوا۔ حسان بن ثابت نے شہنشاہ کونین کی وفات پر ایسے مرثیے لکھے کہ اُس کا ہر ہر شعر تصویر سوز و گداز ہے، حضرت فاطمہ زہرا نے بھی اس سانحہ پر ایک دردناک مرثیہ کہا۔ خلیفہ دوم جناب فاروق اعظم نے بھی اپنے بھائی کا مرثیہ کہلوایا لیکن افسوس ہے کہ محمد کے نواسے پر آنسو بہانے کی کسی میں ہمت نہ تھی اور کربلا کے محشر خیز ظلم پر کوئی مرثیہ ایسا تصنیف نہیں ہوا جو زندہ رہتا خانوادہ امویہ کے جور و ستم نے تمام شعرا کی زبانیں بند کر دی تھیں فرزدق نے ایک قصیدہ حضرت سجاد کی شان میں لکھا تھا، لیکن شاعر کو اس کے صلہ میں قید خانہ سے واسطہ پڑا اسی جباری کا نتیجہ تھا کہ اس زمانہ کے کسی مشہور شاعر نے واقعہ کربلا نظم کرنے کی جرأت نہیں کی خانوادہ عباسیہ کے زریں عہد میں متفرق اشعار چند غیر مشہور شعرا نے واقعہ کربلا کے متعلق ضرور کہے لیکن ادبیات میں کوئی نقش قائم نہ کر سکے۔

ایرآن کی مقدس سرزمین نے خاندان رسالت کی غلامی کا حق ضرور ادا کیا اور جب اس ملک کو خودمختاری نصیب ہوئی اور شاہ طماسپ صفوی سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے حکم دیا کہ شعرا کو ائمۂ اہلبیت کی شان میں طبع آزمائی کرنا چاہیئے، اور قدرت نے یہ شرف محتشم کاشی کے لئے محفوظ رکھا تھا کہ وہ مصائب کربلا پر پہلی مرتبہ دردناک انداز میں نوحہ کرے۔ اس نے چند بندوں کا ایک مرثیہ لکھا جو درد و غم کی تصویر ہے۔ محتشم کے بعد مقبل نے مرثیہ گوئی میں شہرت پائی اور شوکت الفاظ کے زور سے مُلّا محتشم کے درد و تاثیر کا جواب دیا انھوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ کربلا کے تمام واقعات ابتدائے سفر سے اہلِ حرم کے قید ہونے اور رہائی پا کر مدینہ آنے تک نظم کر دئے۔

پھر تو ایرآن میں مرثیہ گویوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا اور سیکڑوں شاعر مرثیہ کہنے لگے۔

ہندوستان میں اُردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی اور مرثیہ گوئی کا آغاز بھی وہیں سے ہوا۔ عہد جہانگیری میں اول اول شجاع الدین نوری نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا اُس کے بعد ہاشم علی برہان پوری نے مرثیے کہے اور ان دونوں کے بعد رام راؤ سیوا اور کاظم علی نے اس صنف میں شہرت حاصل کی ہاشم و کاظم کے مراثی ایڈنبرا یونیورسٹی میں محفوظ ہیں۔ میرزا ایک پاک طینت بزرگ تھے جو صرف مرثیہ کہتے تھے۔

گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تاناشاہ شعر و سخن کے فریفتہ تھے اور اُن کے مصاحبوں میں شاہ قلی خاں ایک مرثیہ گو شاعر تھے جن کے اشعار ہاتھوں ہاتھ شمالی ہند میں پہونچتے اور وہاں مجالس عزا میں پڑھے جاتے۔ جب زمانے نے گولکنڈہ کا ورق اُلٹ دیا تو ولی کو عروج ہوا اور اس نے بھی شہدائے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھ کر مرثیہ گوئی کا حق ادا کیا۔ ولی کی پیرانہ سالی میں سودا و میر کا عنفوان شباب تھا۔ محبان اہلبیت کو رُلانے اور مجالس ماتم میں گرمی پیدا کرنے کے لئے مرثیہ گوئی کی ضرورت تھی چنانچہ ہر طبقہ کے شعرا توشۂ آخرت فراہم کرنے کے لئے نعت و منقبت کہتے اور ان میں سے بیشتر مرثیے بھی تصنیف کرتے تھے سودا اور میر کے عروج سے پہلے مرثیہ کا خوب رواج ہو چکا تھا اُسوقت کے مشہور مرثیہ گو میاں مسکین کا سودا نے اپنے شہر آشوب میں تذکرہ کیا ہے۔ میر تقی میر نے بھی مرثیہ کہا لیکن وہ اس پایہ کا نہ تھا کہ اس شہنشاہ سخن کے دیوان میں شامل کیا جاتا۔ مرثیہ اول اول صرف چار مصرعوں کا ہوتا تھا اور ٹیپ کا بند نہ ہوتا تھا لیکن بعد کو اسنے مسدس کی صورت اختیار کی۔ مسدس کی ابتدا کس نے کی اسکے متعلق اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ سب سے پہلے حیدر کاکوروی نے لکھا جو احمد شاہ کے عہد میں پائے جاتے تھے۔[1]

---

[1] ان کا یہ بند بہت مشہور ہے:-

عزیزو آج ناموس نبی پر آفت آئی ہے | شب رخصت ہے بہنوں سے شہ دیں کی جدائی ہے
خصوصاً بی بی بانو نے عجب حالت بنائی ہے | سرہانے بی سکینہ کے کھڑی دیتی دہائی ہے
منہ اسکا چومتی ہے اور یہی کہہ کہہ کے روتی ہے | ارے اٹھ لاڈلی میری غضب کی صبح ہوتی ہے

اور بعض میاں سکندر کا نام لیتے ہیں جو مرزا کے معاصرین میں تھے۔ اور بہ تلاش معاش پنجاب سے لکھنؤ آکر یہیں تکیہ بے نوا شاہ میں رہ پڑے تھے۔ ان کا ایک نہایت دردناک مرثیہ آج تک گداگروں کی زبان پر رائج ہے اور شاید کسی جگہ مجلس میں بھی پڑھا جاتا ہو اس مرثیہ کے سال تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، لیکن چونکہ میاں سکندر سودا کے ہمعصر تھے اس لئے قیاس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسکا سنہ تالیف ۱۱۹۵ھ سے پہلے رہا ہوگا۔ دریائے لطافت میں انشا نے لکھا ہے کہ :- بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت تک مرثیہ خوانی کو لوگ حقارت سے دیکھتے تھے۔ مگر سلطنت کا مذہب شیعہ تھا امرا و اعیان ریاست اسی مشرب کے حلقہ بگوش تھے، عشق اہلِ بیت لکھنؤ کی خاک میں سرایت کر گیا تھا، مجالس عزا دھوم دھام سے ہوتی تھیں۔ اہلِ ایمان آرزو کرتے تھے کہ اُن کی مذہبی مجلسوں میں مشاعروں سے زیادہ رونق پیدا ہو اور مرثیوں میں دردانگیز واقعات ظاہر کئے جائیں، اس لئے اہلِ کرم کی داد و دہش نے مرثیہ گویوں کی ہمت افزائی کی اور چند ہی روز میں ایک کامل پیدا ہوا جس نے عاشقانہ شاعری سے دست بردار ہو کر مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی شروع کی۔ یہ بزرگ مرزا دبیر کے اُستاد میر ضمیر تھے۔ بعد کو میاں دلگیر، میر فصیح اور میر خلیق نے بھی اسی صنف میں کمال حاصل کیا اور بادشاہ غازی الدین حیدر کے عہد میں یہ فن اس قدر ترقی کر گیا کہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنے فسانۂ عجائب میں اہل لکھنؤ کے کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے مرثیہ گویوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور ان تمام مرثیہ گویوں کے نام گنائے ہیں جو اُسوقت موجود تھے یا اس سے پہلے اس فن میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔

نصیر الدین حیدر کے عہد تک دلگیر، ضمیر، خلیق ہم پلہ سمجھے جاتے تھے اور مرثیہ گویوں کی توجہ صرف بین پر تھی۔ مراثی کے بند ۱۲ سے لیکر ۲۵ یا ۵۰ تک ہوتے تھے اور بیشتر مرثیے سوزخواں ہی پڑھتے تھے۔ میر ضمیر نے روایات نظم کرنا شروع کیں تو مراثی ۵۰ بندوں سے بڑھکر ۷۰ یا ۸۰ کے ہونے لگے رفتہ رفتہ یہ تعداد سو سے بھی متجاوز ہو گئی۔ اور جب میر ضمیر نے رزم و سراپا کو بھی مراثی میں داخل کیا تو پھر اس کی طوالت کی کوئی حد نہ رہی۔ جس طرح قصیدہ تشبیب - گریز - مدح - دعا اور عرض حال پر مشتمل ہوتا تھا، اسی طرح مراثی میں چہرہ، رخصت، سراپا، رجز، جنگ، شہادت اور دعا لازمی قرار پائے۔ میر ضمیر نے مرثیہ میں جو جدتیں کیں وہ یہ ہیں :-

(۱) رزمیہ لکھا (۲) سراپا شامل کیا (۳) اسپ اور اسلحہ جنگ کے اوصاف لکھے (۴) صفائی بندش پر توجہ کی (۵) غلط الفاظ جو مراثی میں بے تکلف مستعمل تھے ترک کئے اور (۶) تحت لفظ پڑھنے کا رواج دیا۔

میر خلیق کا جوہر کمال لطف زبان کو دردانگیز خیالات کے ساتھ ترکیب دیکر صرف اہل مجلس کو رُلانا تھا وہ اس کوچہ سے قدم آگے بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے میر ضمیر کی تقلید اپنے کمالات میں موجب افزائش نہ سمجھ کر رزمیہ مضامین سے احتراز کیا اور صرف دردتاثیر کی نعمت سے حریفوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ فصیح نے البتہ رزم کو مراثی میں شامل کیا مگر وہ تھوڑے عرصہ

کے بعد عتبات کی زیارت کو تشریف لے گئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی لیکن مشق سخن وہاں بھی جاری تھی اور ایک پُر زور سلام مکہ سے بھیجا جو لکھنؤ میں بہت مقبول ہوا اس کا پہلا شعر یہ ہے :۔

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے
سراپا کعبہ کے سنگ در پر سیاہ پردہ ٹپک رہا ہے

میر ضمیر کے نامور شاگرد مرزا دبیر مرثیہ گوئی کی مشق کر رہے تھے۔ انھوں نے اُستاد کی پیروی میں حضرت علی اکبر کے حال کا مرثیہ طرز جدید میں لکھ کر سنایا۔ خواجہ آتش بھی اس صحبت میں موجود تھے۔ جب گھوڑے کی تعریف مرزا صاحب نے پڑھی تو خواجہ آتش نے پکار کر فرمایا :۔

"بھئی سلامت علی خدا تم کو سلامت رکھے کون کہتا ہے تم فقط مضامین اچھے کہتے ہو تم سے بہتر دوسرا شاعر زبان بھی نہیں کہہ سکتا"

اسی وقت میر خلیق کے بلند اقبال صاحبزادے میر ببر علی انیس نے فیض آباد سے آکر لکھنؤ میں مجلس پڑھی اور رزم بزم کی وہ چلتی پھرتی تصویریں دکھائیں کہ آفریں کی صدا ہر گوشہ سے بلند ہونے لگی انھوں نے طرز مرثیہ گوئی میں کوئی خاص جدت نہیں کی بلکہ ضمیر و دبیر کے محاسن کلام میر خلیق کی محاورہ بندی اور میر حسن کی داستان نگاری کو باہم ملا کر نئی صورت سے پیش کیا، اور آخر کار سب کی گردنیں ان کے سامنے جھک گئیں۔

میر ضمیر جان عالم کے عہد تک زندہ تھے اور کہا جاتا ہے کہ دور آخر میں انھوں نے ایک بے نظیر مرثیہ ۱۸۰۰ بند کا لکھا تھا جو اگر شائع ہوتا تو دبیر و انیس دونوں کے چراغ گل ہو جاتے۔ مگر غالباً یہ افسانہ ہی افسانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر انیس کا حریف اس صنف سخن میں اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف مرزا دبیر کی ذات ہے۔ ان دونوں باکمالوں کے نقش قدم پر چلنے والے سیکڑوں پیدا ہوئے لیکن دوسروں کا کیا ذکر ہے اُن کے بھائی بیٹے بھی گوئے سبقت نہ لیجا سکے۔ خاندان انیس میں سے مونس و نفیس اور خاندان دبیر میں سے مرزا اوج نے بہت زور مارا لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ کوئی ترقی نہ کر سکے۔

رہا یہ امر کہ ان دونوں میں صدر نشین فضیلت کون تھا۔ یہ مسئلہ اسوقت تک زیر بحث چلا آرہا ہے، لیکن نقادان فن سے پوشیدہ نہیں کہ دونوں اصحاب کی روش جداگانہ ہے اگر میر انیس کے کلام میں فصاحت و شیرینی موجود ہے تو ملاحت مرزا دبیر کے کلام کا حصہ ہے، شیرینی اور نمک دونوں کی بنی آدم کو احتیاج ہے اس لئے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی ہاں ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انیس کی سادگی و تاثیر عرصہ تک باقی رہیگی اور دبیر کی شوکت الفاظ اور بلند پروازی جلد فنا ہو جائیگی۔ دبیر کے صنایع و بدایع سمجھنے والے ہندوستان میں اُنگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں اور اگر انحطاط کا یہی دور رہا تو وہ دن دور نہیں جب صنایع و بدایع سے لطف اندوز ہونے والا جستجو سے بھی دستیاب نہ ہو سکیگا۔ لیکن انیس کی سادہ زبان و محاورہ بندی ہر موسم کی چیز ہے اور اُردو زبان جب تک زندہ رہیگی انیس کا کلام سمجھا جائے گا۔ حالی نے کیا خوب کہا ہے :۔

اُردو گو راج چار سو تیرا ہے — شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے

پر جب تک انیسؔ کا سخن باقی ہے — تو لکھنو کی ہے اور لکھنؤ تیرا ہے

میر انیسؔ نے صنایع لفظی پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ مراعات النظیر کی مثالیں البتہ اُن کے کلام میں بعض جگہ پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کو وہ عیب سمجھتے تھے کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ "آپ رعایت لفظی کو پسند کرتے ہیں تو ارشاد ہوا کیا کروں لکھنؤ میں رہتا ہوں"

طبقہ متوسطین کے اساتذہ متاخرین میں امیرؔ، جلالؔ، منیرؔ، تسلیمؔ نے اس صنف سخن کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔ دور حاضر کے مشہور نقاد مولانا نیازؔ نے اپنے مخصوص رنگ میں بے نظیر تبصرہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:۔

"لکھنؤ میں جس بری طرح تغزل کی مٹی پلید ہوئی وہ ناقابل عفو حد تک عفونت و گندگی سے لبریز ہے۔ لیکن یہ ماننا پڑیگا کہ شاعری کی اُس صنف نے جسے مرثیہ کہتے ہیں یہاں غیر معمولی ترقی کی اور شاہان اودھ کے اخلاقی مظالم کی تلافی اگر فطرت کی طرف سے کوئی ہوئی تو صرف یہ کہ اُس نے انیسؔ و دبیرؔ کو یہاں پیدا کر دیا۔"

سلام | تذکرہ بہارستان سخن میں ہے کہ:۔

"عروضی ترکیب کی رو سے غزل، سہرا اور سلام شے واحد ہیں، مگر اُن کے مضامین کے تقاضے ایک دوسرے سے علٰحدہ انداز رکھتے ہیں فارسی میں سہرا، اس واسطے نہیں ہوتا کہ اس ملک میں دولھا یا دلھن سہرا نہیں باندھتے، سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجہ کے مضامین از قسم واردات قلبیہ ضرور لاتے ہیں مگر اُن میں غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے سلام کی ترکیب کو باوجود رنگینی کے غزل سے علٰحدہ ہونا چاہئے۔ سلام گوئی کا لطف یہ ہے کہ باوجود شوخی و رنگینی کے غزل سے جدا نظر آئے۔ عموماً سلام میں واقعۂ کربلا، شہادت امیر المومنین، و شہادت امام حسین و مصائب حضرت خاتون جنت، علاوہ ان کے اخلاقی و تمدنی و مذہبی مسایل بھی منظوم کئے جاتے ہیں۔ میر ضمیرؔ، میاں دلگیرؔ، میر انیسؔ و میر مونسؔ اور مرزا دبیرؔ کے سلام اُردو زبان میں بہت مشہور ہیں۔

نوحہ اسلام کی ایک قسم ہے جس میں بین کیا جاتا ہے، آج کل یہ صنف مقبول نہیں ہے لیکن پھر بھی بہت سی خواتین کا محبوب مشغلہ ہے اور آج کل بھی لکھنؤ کی خواتین اسطرف توجہ کرتی ہیں چنانچہ محترمی مرزا جعفر علی خانصاحب اثرؔ کی صاحبزادیاں اس فن میں بہت مہارت رکھتی ہیں[1]

---

[1] جناب اثرؔ کی تین صاحبزادیاں ہیں۔ ایک قمر جہاں بیگم قمرؔ دوسری بلقیس جہاں بیگم عصمتؔ، تیسری انور جہاں بیگم انورؔ۔ ان کے نوحوں اور سلاموں کا نمونہ یہ ہے:۔ قمر جہاں بیگم قمرؔ

رحم کچھ حال پہ معصوم کے کھایا نہ گیا — تھوڑا پانی علی اصغر کو پلایا نہ گیا

جان دیدی غم شبیر میں روتے روتے — باپ کا داغ سکینہ سے اٹھایا نہ گیا

علیگڈھ میں بھی یہ فن بہت مقبول ہے اور ہر سال ۱۰-۱۲ نوحے لکھے جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب ہوتے ہیں گو اُس کا مقصود محض تفنن طبع ہوا کرتا ہے۔

※

پھونک دی قالبِ اسلام میں شبیر نے روح
مٹ کے وہ نقش بٹھایا کہ اُٹھایا نہ گیا

باپ کی تاب و تواں ساتھ گئی بیٹے کے
لاشہ اکبر کا شہِ دیں سے اُٹھایا نہ گیا

ہاتھ دونوں تھے بندھے بال تھے چھوٹے چھوٹے
چہرہ بلوے میں سکینہ سے چھپایا نہ گیا

ہائے وہ خشک گلا کُند چھری سے جو کٹا
ہائے وہ سر جو کبھی تن سے ملایا نہ گیا

اے قمر کوئی بھی بانو کا نہ ارماں نکلا
دودھ تک اصغر ناداں کا بڑھایا نہ گیا

بلقیس جہاں بیگم عصمت :-

شاہ دیں ہاتھوں سے تھامے دل ناکام آئے
جب سوئے نعش علی اکبر گلفام آئے

مسکراتے ہوئے جنت کو سدھارے تم تو
کس طرح اے مرے دلبر مجھے آرام آئے

بانو کہتی تھیں نہ نیند آئیگی تنہائی میں
پاس اصغر ترے کس طرح یہ ناکام آئے

ختم شبیر پہ ہے شیوۂ تسلیم و رضا
دل کو آرام نہ آسکے اگر آرام آئے

رہ گئے یکہ و تنہا شہِ بیکس رن میں
ظہر تک سب رفقائے شہِ دیں کام آئے

کہتے تھے شوقِ شہادت میں شہ تشنہ گلو
دن ڈھلے جلد کہیں عصر کا ہنگام آئے

دربدر یوں ہوئے تشہیر حرم بعد حسین
کبھی کوفے گئے سر ننگے کبھی شام آئے

باپ کے سینے پہ سونے کی جسے عادت ہو
آہ کس طرح اُسے خاک پہ آرام آئے

تشنگی پر شہ مظلوم کی رونا عصمت
سامنے آنکھوں کے پانی کا اگر جام آئے

انور جہاں بیگم - انور :-

حوصلہ اے چشم گریاں رہ گیا
ماتم سرور کا ارماں رہ گیا

جسنے دیکھی حُسن اکبر کی بہار
صورت آئینہ حیراں رہ گیا

بارک اللہ اے شہِ گلگوں قبا
مٹ چکا تھا نقشِ ایماں، رہ گیا

سہرا اکبر کا نہ دیکھا جیتے جی
دل میں بانو کے یہ ارماں رہ گیا

جس کا جی چاہے وہ لوٹے یا ستائے
قافلے کا میر ساماں رہ گیا

آج تک کہتا ہے اُٹھ اُٹھ کے غبار
بے کفن شاہ شہیداں رہ گیا

تیر جب اصغر کی گردن پر لگا
ایک ہچکی لے کے ناداں رہ گیا

بیکسی میں کوئی تو ہمدرد ہو
سینۂ سرور میں پیکاں رہ گیا

ہند انور ہم چلے آئے مگر
کربلا میں قلب نالاں رہ گیا

ہرسیہ ہرسیہ ایک بے معنی لفظ ہے مگر ایک واقفِ کار کا خیال ہے کہ یہ "ہرسہ" کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور غالباً ہرسہ سے مطلب خلفائے راشدین کی ظرافت آمیز ہجو ہے۔ مرثیہ کا مضمون پُر عظمت تھا اگر ظرافت شامل کی جاتی تو مجلس ماتم بزم طرب بن جاتی ہنسنے ہنسانے کے لئے لکھنؤ کے زندہ دل حضرات نے یہ صورت نکالی کہ آٹھویں ربیع الاول کو عزاداری سے فراغت کرکے جشن عید منعقد کرتے تھے اور قاتلانِ حسین کے انجام پر خوشیاں مناتے تھے۔ اس عید میں میر ضمیر نے سب سے پہلے ہرسیہ پڑھا۔ مرزا دبیر اور میر انیس نے بھی تقلید کی میاں مشیر نے سارا زور اس پر صرف کر دیا اور مختلف قوموں اور اہلِ پیشہ کی اصطلاحوں کو کثرت سے نظم کرکے اُردو شاعری کو ظرافت و شوخی کے انمول خزانہ سے مالامال کر دیا۔ اب یہ صنف مفقود ہے اور کوئی اُستاد فن اس طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

قطعہ قصیدہ اور قطعہ میں بہت کم فرق ہے یعنی یہ کہ قطعہ میں مطلع ہمیشہ نادر رہتا ہے اور اشعار کی تعداد چار سے کم نہیں ہوتی برخلاف اس کے قصیدہ میں مطلعوں کی تعداد مقرر نہیں اور طوالت میں وہ جتنا بھی بڑھ جائے کم ہے۔ قطعہ نگاری میں یہ ضروری ہے کہ شاعر کا کلام تغزل کا رنگ پیدا نہ کرے سوائے اس صورت کے کہ قطعہ بند اشعار خود کسی غزل کا حصہ ہوں چونکہ قطعہ نگاری تملق و درباری خوشامد کے لئے مناسب و موزوں نہیں تھی اس لئے اس صنف میں جن شعرا نے کوششیں کی ہیں وہ ہر آئینہ کامیاب ہوئی ہیں فارسی میں سعدی، ابن یمین، نظامی، فردوسی، سنائی، خسرو، غالب کے قطعات بہت مشہور ہیں لیکن غالب کے قطعات میں مداحی پائی جاتی ہے اُردو شعرا میں قطعہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ ہوئی۔ صادق علی خاں اختر، ذوق، ظفر، غالب کے قطعات بہت مشہور ہیں، دورِ حاضر میں اس طرف توجہ نہیں ہے، فی الحال لکھنؤ میں عزیز اچھے قطعات لکھتے ہیں۔

منظوم افسانے اُردو زبان میں منظوم افسانے بالعموم مثنوی ہیں۔ اُس کے لئے اشعار کی تعداد متعین نہیں ہے ممکن ہے کہ چار شعر کی مثنوی ہو یا چار لاکھ کی۔ مضامین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنف شاعری کو حاصل ہے کسی اور صنف کو نہیں ہر طرح کے مضامین اس میں گنجایش پا سکتے ہیں۔ تذکرہ بہار سخن میں ہے کہ:۔

"مثنوی نگاری صرف اس شاعر سے حسب مراد انجام پا سکتی ہے جس کو اُمور مذہبی اور معاملات خارجی کو موزوں کرنے کی صلاحیت معقول حاصل رہتی ہو وہ شاعر جو صرف اُمور مذہبی کو یا صرف معاملات خارجی کو حوالۂ قلم کر سکتا ہے مثنوی نگاری کی داد نہیں دے سکتا مثنوی نگاری کے لئے شاعر کو بڑی اطلاع عام کی حاجت ہے، اُسے معاملات عالم سے پورے طور پر باخبر ہونا چاہئے اُس کے ساتھ اسے مصور عالم بھی ہونا درکار ہے اگر بندش مضامین میں سے اسے مصوری کی قدرت نہیں ہے تو اس کی مثنوی نگاری لطف کمال نہیں دکھلا سکیگی۔ اُردو میں سب سے پہلے میر نے منظوم افسانے لکھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میر کی مثنوی نگاری بھی مضامین کے اعتبار سے ایک قسم کی غزل سرائی نظر آتی ہے گو میر کی مثنویات میں خارجی مضامین کا فقدان ہے لیکن روحانی اور قلبی معاملات سے مملو ہیں

اُردو زبان میں مثنوی کی ابتدا مذہبی حیثیت سے ہوئی، قطب شاہ نے بھی ایک نعتیہ مثنوی لکھی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مخطوطات میں محفوظ ہے رستمی نے بھی قطب شاہ کی بیوی خدیجہ خاتون کی فرمایش سے خاورنامہ مرتب کیا، اس کے بعد نصرتی نے گلشن عشق کے نام سے ایک مثنوی لکھی اور دوسری علی نامہ کے نام سے - اس کے بعد خواجہ محمود بحری نے ایک صوفیانہ مثنوی من لگن لکھی چنانچہ صاحب "تاریخ شعرائے اُردو" لکھتے ہیں کہ:-

(افضل الدین خاں افضل) دکن کے متقدمین شعرا میں سے ہیں دکنی زبان میں ایک راجہ کے بیان میں ایک مثنوی لکھی زبان مغلق ہے"

شاہ مبارک نے بھی ایک مثنوی لکھی اور حیدر بخش حیدری نے اُردو میں شاہنامہ لکھا اور نظامی کی ہفت پیکر کا اُردو ترجمہ کیا اور دکنی زبان میں بہرام و گل اندام کو بھی نظم کیا -

ایک شخص ساقی نامی نے بھی شاہ نامہ نظم کرنے کی کوشش کی اور اس کے بعد سودا اور راسخ نے کثرت سے مختصر مثنویاں لکھیں لیکن میر اثر کی مثنوی خواب و خیال کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی - جعفر علی خاں زکی نے بھی ایک مثنوی لکھی - انشاء و جرأت نے اس طرف توجہ نہ کی البتہ مصحفی نے بحر المحبت مثنوی لکھی جواب شائع ہوگئی ہے صاحب شعر الہند نے خوب لکھا ہے کہ:-

جب ستارے ڈوبنے لگتے ہیں تو ڈوبتے ڈوبتے طلوع آفتاب کا مژدہ سُنا جاتے ہیں اس اُصول کے مطابق اس دور میں مثنویوں کی بھرمار تو کم ہوگئی لیکن میر حسن نے مثنوی بدر منیر لکھ کر مصحفی - انشاء - جرأت سب کا کفارہ ادا کر دیا -

اساتذۂ متوسطین میں ناسخ و آتش نے مثنوی کی طرف مطلقاً توجہ نہ کی البتہ شاگرد آتش پنڈت دیا شنکر نسیم نے مثنوی گلزار نسیم لکھ کر میر حسن کی طرح اس دور کے تمام شعرا کی جانب سے فرض کفایہ ادا کر دیا - متاخرین میں قلق کی طلسم الفت کو شہرت ہوئی اور نواب مرزا شوق کی مثنویوں نے تو قیامت ہی کر دی -

اودھ کو گلزار نسیم اور طلسم الفت پر ناز ہے اور میر حسن کی بدر منیر کو یہاں کے لوگوں نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا میر حسن کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ہزارہا اشیا کا منظر کھینچا ہے اور مختلف مناظر کا سماں دکھایا ہے لیکن کہیں فطری مصوری سے متجاوز نہیں ہوئے - گلزار نسیم کی بنیاد تخیل، رعایت لفظی تشبیہہ استعارہ پر رکھی گئی ہے اس لئے فطری مناظر پیش نہیں کر سکتی البتہ طرز ادا نہایت شستہ، رواں اور صاف ہے -

مثنوی طلسم الفت، گلزار نسیم و بدر منیر دونوں کا مجموعہ ہے - رعایت لفظی تشبیہہ اور استعارہ کا التزام ہر جگہ موجود ہے اور بدر منیر کی طرح مناظر بھی تفصیل سے دکھائے گئے ہیں لیکن فطری کیفیت کہیں نہیں ہے - افسانے میں بھی تناسب نہیں ہے

اس کے بعد نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا دور آتا ہے۔ ان میں یقیناً ابتذال کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے لیکن اگر مبتذل شعر نکال دیے جائیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ بدر منیر و گلزار نسیم یا طلسم اُلفت کے ساتھ ان کا ذکر نہ کیا جائے۔ واجد علی شاہ اختر کی مثنوی حزن اختر بھی قابل ذکر ہے کیونکہ انھوں نے خود اپنی آپ بیتی اس میں نظم کی ہے اور ان کے اخلاقی جرات کی داد نہ دینا یقیناً ظلم ہے۔ محسن نے بھی نعتیہ مثنوی چراغ کعبہ لکھی جو درد و تاثیر کے کیف سے مالا مال ہے۔

مذہبی شاعری صفیر بلگرامی نے لکھا ہے کہ ولی کے عہد سے پہلے شعراء نے جو کچھ لکھا اُس کا بیشتر حصہ حمد، مناجات اور مناقب پر مشتمل تھا۔ لیکن بعد کو یہ سلسلہ جاری رہا اور سودا و میر نے نعت و منقبت میں متعدد قصائد لکھے۔ انشاء نے بھی زور طبع صرف کیا۔ شعر الہند میں ہے کہ اُس عہد کے ایک باکمال بزرگ حضرت شاہ غلام محی الدین اُویسی نے قرآن مجید کی تفسیر منظوم کی۔ البتہ دور وسطیٰ میں ناسخ و آتش نے صرف غزل کو جولانگاہ بنایا۔ اس دور کی شاعری میں دو اسکول نظر آتے ہیں، حنفی۔ شیعی۔ حنفی اسکول نے خلفائے راشدین کی شان میں بھی قصائد لکھے لیکن شیعی اسکول میں مناقب اہل بیت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مولوی غلام امام شہید جو امیٹھی مضافات لکھنؤ کے باشندہ تھے انھوں نے اودھ میں مذہبی شاعری کا سنگ بنیاد رکھا اور غزل، مثنوی، قصیدہ، ترجیع بند غرضکہ جملہ اصناف شاعری میں نعت گوئی کو وسیلۂ نجات تصور کیا اور شاعرانہ رنگ کی آمیزش اور تشبیہات و استعارات سے نعت گوئی کو مقبول بنایا۔ علاوہ ان کے اُسی دور میں لطف علی لطف نے بھی نعت گوئی کی اور جو کچھ لکھا مدح رسول میں لکھا، گو وہ غلام امام شہید کا زور و اثر اپنے کلام میں پیدا نہ کر سکے۔ تاہم جوش مذہبی سے اُن کا کلام خالی نہیں ہے۔ اسی زمانہ میں شہیدی نے نعت میں خوب خوب لکھا اور حق یہ ہے کہ کیفیت و تاثر کے لحاظ سے اُن کی نعت گوئی خاص مرتبہ کی چیز تھی۔

دور آخر میں اس طرف بہت کم توجہ کی گئی اور صرف محسن نے اس حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل کی مضامین کی بلندی الفاظ کا شکوہ بندش کی چستی اُن کا خاصہ نہیں تھا۔ اور رعایت لفظی کا بھی وہ خاص طور پر التزام رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں کیف و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا جس کا تعلق وجدان سے ہے۔ اُنھوں نے نعتیہ قصاید لکھے۔ مثنویاں لکھیں اور استعارات کی جدت تشبیہات کی لطافت بندش کی چستی کو کسی جگہ ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ جہاں صفائی و سادگی سے کام لیا ہے وہاں بھی وہی کیف و قار کا عالم ہے۔

صوفیانہ شاعری سب سے پہلے جو کتاب تصوف کی نظم میں لکھی گئی وہ من لگن تھی جو خواجہ محمود بحری کی تصنیف ہے اسکے بعد صوفیانہ شاعری کو بہت ترقی ہوئی۔ خواجہ حسن حسن نے مسئلہ وحدت الوجود کو اُردو میں نظم کیا اور کلیم نے فصوص الحکم کا اُردو نظم میں ترجمہ کیا۔ میر فضل علی دانا نے ترک دنیا کر کے صوفیانہ شاعری کو اختیار کیا۔ تذکرہ میر حسن سے پتہ چلتا ہے کہ

شیخ فرحت نے بھی کچھ اشعار صوفیانہ رنگ کے کہے۔ خواجہ میر درد نے اس صنف خاص کو اپنا لیا۔ میر حسن کی مثنوی رموز العارفین حیدرآباد سے شایع ہوگئی جس میں نکات تصوف کو قصص وحکایات کے پیرایہ میں سمجھایا ہے۔ راسخ نے نور الانظار مثنوی لکھی اور حکایات و تمثیلات سے تصوف واخلاق کی تعلیم دی اس کے بعد قدماء کا تیسرا دور شروع ہوا تو صاحب شعر الہند کے الفاظ میں شاعری فقر و تصوف کی آغوش سے نکل کر امراء اور روسا کے دامن میں پرورش پانے لگی اگرچہ اس دور میں بھی گوشہ نشین مصحفی نے قدماء کی ایک یادگار کو محفوظ رکھا" تاہم بالعموم صوفیانہ شاعری کی رَو رک گئی۔ اور انشاؔ و جراؔت کے " خارج از آہنگ" نغمات نے اس کو بالکل پست کر دیا۔

اودھ کے شاعروں میں ناسخ اور تلامذہ ناسخ اس کوچہ سے ناواقف ہی رہے آتش اور اُن کے تلامذہ خلیل، رند، صبا۔ کے کلام میں کسی حد تک تصوف کی چاشنی ضرور پائی جاتی ہے لیکن رموز تصوف سے یہ لوگ بھی آشنا نہیں تھے۔ البتہ شاہ تراب علی کاکوروی کا اُردو کلیات صوفیانہ شاعری کا اچھا ذخیرہ ہے۔

اخلاقی شاعری دور وسطیٰ میں ناسخ نے اخلاقی مسائل کے لئے صائب کا تمثیلی رنگ اختیار کیا لیکن یہ تقلیدی طریقہ صرف شاعرانہ زور استدلال ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ تھا اس لئے یہ لوگ اپنے کلام میں اخلاقی اثر قائم نہ کر سکے۔ آتش اسکول میں قناعت توکل تجرد استغنا کے مضامین البتہ پائے جاتے ہیں لیکن اس کے بعد امیر و جلال نے اس صنف شاعری کو بالکل ہاتھ نہ لگایا۔

ہنگامہ مشرق ۱۸۵۷ء انتزاع سلطنت کے بعد دہلی اور لکھنؤ دونوں ویران ہوگئے ادبی انجمنوں کا خاتمہ ہوگیا۔ ہزارہا کتب خانے نذر آتش ہوگئے اور جو باقی بچے وہ یا تو نخاس میں آئے اور ردیوں کے مول بکے یا گھروں میں سڑ گل کر تباہ وخراب ہوئے ارباب کمال ایک ایک کرکے اُٹھ گئے کچھ رامپور گئے اور کچھ حیدرآباد چلے گئے لیکن یہ جماعت زبان کی امین تھی جہاں گئی اپنی خصوصیات کلام کو ساتھ لیتی گئی گو وہ گھرانے جہاں کی اُردو مستند تھی دونوں جگہ ختم ہوگئے لیکن اودھ میں ایک بات ضرور باقی رہی کہ مضافات لکھنؤ میں بلگرام، سندیلہ، خیرآباد، کاکوری میں علم وفن کا چرچا باقی رہا اور اس لئے ان قصبات سے جو پس ماندگان لکھنؤ آکر آباد ہوئے وہ اُردو کی خدمت پر بہت تندہی سے تیار ہوگئے اور گو لکھنوی وغیر لکھنوی کا فرق ہمیشہ قائم رہا لیکن مضافات اودھ والوں کو ہمیشہ لکھنوی تسلیم کیا گیا۔

اثرات ما بعد ہنگامۂ غدر کے اثرات یہ ہوئے کہ قلوب میں اضمحلال اور طبیعتوں میں افسردگی پیدا ہوتی گئی۔ ایام عیش کے افسانے خواب ہوگئے۔ حکومت وجاہ کا نشہ ہرن ہوگیا۔ عیش کی داستانیں اور جوانی کے ولولے اور دولت کی ترنگیں سب خاک میں مل گئیں شاعری میں بھی انقلاب ہوا شہر آشوب تصنیف کئے گئے۔ اور وہ طرز شاعری جو نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ جانعالم کے دور میں چمک چکا تھا سرد ہوگیا رعایت لفظی ضلع جگت، استعارہ، تشبیہ سب بھولی بسری کہانیاں ہوگئیں۔

تہذیب جدید | جب انقلاب حکومت کے بعد ہندوستان میں کسب معاش کے لئے انگریزی تعلیم ضروری سمجھی گئی تو سرسید نے علیگڈھ میں مدرستہ العلوم کی بنیاد رکھی، اودھ میں بھی کیننگ کالج کھولا گیا اور مختلف مدارس ثانوی جاری کئے گئے، آخر کار ایک جماعت جدید تعلیمات سے آراستہ ہو کر ملک میں رونما ہوئی اور یہی ابتدا تھی جدید شاعری کی۔ اودھ میں نئے سرے سے ادبی انجمنیں قائم ہوئیں مشاعرے ہونا شروع ہوئے رسائل نکلے، مطابع کھولے گئے۔ اخبارات کا اجرا ہوا۔ لیکن ان ادبی خدمات کی سرپرستی حکومت سے متعلق نہ تھی بلکہ انفرادی مساعی پر محمول تھی۔ اور مختلف روسا نے ان بدنصیب شعرا کی عزت افزائی کی جو خود اپنی زندگی سے عاجز ہو چکے تھے اور اس سلسلہ میں راجہ نوشاد علی خاں راجہ امیر حسن خاں اور حامد علی خاں بیرسٹر کے نام خصوصیت کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں

حالی کا مقدمہ شعر و شاعری | اسی دور میں خواجہ الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری (جو اصل میں اُن کے دیوان کا مقدمہ ہے) شایع کیا۔ یہ تنقید بے لاگ تھی اس مقدمہ نے آگ لگا دی اور لکھنوی شاعری پر اعتراضات کی بھرمار ہونے لگی یہاں تک کہ اُردو شاعری کی طرف سے لوگوں کو تنفر پیدا ہونے لگا۔

یادرفتگان | لیکن ایک نوجوان طبقہ جو سیاست و شاعری و ادب و مذہب کا بڑا علمبردار تھا سید سجاد حسین کی قیادت میں ادب کی پشت پناہی کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک بے ضابطہ کلب اودھ پنچ کے دفتر میں قائم کیا جس کے سربرآوردہ اراکین میں مرزا مچھو بیگ عاشق (ستم ظریف) نادر کاکوروی، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی محفوظ علی کاکوروی، پنڈت جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کسمنڈوی، نواب سید محمد آزاد، خان بہادر اکبر حسین اکبر، منشی احمد علی شوق قدوائی، منشی واحد علی ابر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت بشن نراین در کے نام نظر آتے ہیں ان میں بعد کو مولوی نور الحسن نیر مولف نور اللغات منشی امیر احمد علوی، منشی ارتضا علی شرر اور سید اعجاز حسین علوی اعجاز کا بھی اضافہ ہوا۔ اس طبقہ نے قدیم شاعری کی جانب سے مقدمہ شعر و شاعری کا جواب دینا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم خدمت منشی امیر احمد علوی نے انجام دی یعنی انھوں نے سید فضل الحسن حسرت موہانی کے اصرار سے معترضین کا جواب اُردو شاعری کے عنوان سے اردوئے معلیٰ میں لکھا جو بہت مقبول ہوا اور اُسی وقت سے اُردو شاعری کے شہ پاروں کی انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں قدر ہونے لگی اور شکسپیر، بائرن۔ جانسن شیلے، ورڈس ورتھ کے ساتھ ساتھ انیس محسن، امیر، غالب، میر مصحفی وغیرہ کے ناموں سے بھی کان آشنا ہونے لگے۔

اودھ کے جدید شاعر | اسوقت لکھنؤ اسکول کے جدید شعرا میں اچھے اچھے کہنے والے موجود ہیں مثلاً آرزو، صفی، عزیز، اثر، آشفتہ سراج اور ثاقب وغیرہ لیکن اگر دلی لکھنؤ کے امتیاز کو نظر انداز کر کے تمام ہندوستان کو پیش نظر رکھا جائے تو ملک میں اور بھی بہت سے اچھے شاعر نظر آتے ہیں، لیکن جس حد تک صرف تغزل کا تعلق ہے حسرت موہانی کا جواب نہیں۔

مشیر احمد علوی ناظر۔ بی۔ اے۔ کاکوروی

دہلی کے وہ شعراء جو لکھنؤ یا جوار لکھنؤ کی طرف گئے

اشرف علی فغاں — تقریباً ۱۱۶۸ھ میں دہلی سے اپنے چچا ربیع خاں کے پاس مرشد آباد گئے اور وہاں سے لوٹتے ہوئے فیض آباد میں ٹھہر گئے (نواب شجاع الدولہ کا ابتدائی زمانہ تھا) لیکن پھر عظیم آباد چلے گئے اور راجہ شتاب رائے کے پاس ساری عمر ختم کر دی۔ ۱۱۸۶ھ میں انتقال ہوا۔

قیام الدین قائم — سودا کے ہمعصر تھے، دہلی کی تباہی کے بعد یہ بھی غالباً ۱۱۷۰ھ کے قریب نواب محمد یار خاں (نواب فیض اللہ خاں رئیس رامپور کے بھائی) کے پاس ٹانڈہ چلے گئے اور سو روپیہ مشاہرہ قرار پایا۔ جب نواب محمد یار خاں مرہٹوں کے فتنہ کے زمانہ میں رامپور چلے گئے تو یہ بھی وہیں پہونچ گئے اور ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا۔

سودا — پہلے فرخ آباد نواب احمد خاں غالب جنگ کے دیوان مہربان خاں رند کے پاس رہے۔ پھر ۱۱۸۵ھ میں فیض آباد آئے، نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد عہد آصف الدولہ میں لکھنؤ آ گئے اور یہیں آخر عمر تک رہے۔ ۱۱۹۵ھ میں انتقال ہوا۔

سید محمد میر سوز — تقریباً ۱۱۷۰ھ میں دہلی چھوڑ کر پہلے مہربان خاں رند کے پاس فرخ آباد گئے، اس کے بعد ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ ہوتے ہوئے مرشد آباد گئے اور جب دوبارہ ۱۲۱۲ھ میں لکھنؤ پہونچے تو نواب آصف الدولہ کے اُستاد ہوئے یہیں ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی۔

میر — ۱۱۹۷ھ میں بہ عہد نواب آصف الدولہ لکھنؤ پہونچے۔ ۳۰۰ ماہوار تنخواہ مقرر ہو گئی اور اخیر عمر تک یہیں رہے ۱۲۲۵ھ میں انتقال ہوا۔

ضیاء الدین ضیاء — دہلی کی تباہی کے بعد شجاع الدولہ کے زمانہ میں فیض آباد آئے۔ ٹھیک تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر لکھنؤ آگئے اور چند دن بعد عظیم آباد چلے گئے۔ یہاں شتاب رائے کے بیٹے نے ان کی قدر کی۔ یہیں ان کا انتقال ہوا۔ تاریخ وفات نامعلوم ہے۔

میر محمد باقر حزیں — (شاگرد میرزا مظہر) دہلی چھوڑ کر عظیم آباد نواب صولت جنگ کے پاس چلے گئے تھے۔

میر حسن — عنفوان شباب میں دہلی سے فیض آباد گئے اور نواب سالار جنگ بہادر کی قدردانی سے مرزا نوازش علیخاں ان کے صاحبزادہ کی صحبت میں رہے۔ سنہ ۱۲۰۱ھ میں انتقال ہوا۔

مصحفی — انھوں نے دہلی سنہ ۱۱۸۰ھ کے قریب چھوڑا اور نواب محمد یار خاں کے پاس ٹانڈہ پہونچے یہاں قائم پہلے سے موجود تھے۔ اس لئے ان کی وساطت سے رسائی ہوگئی۔ دو چار سال بعد فیض آباد گئے۔ شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ اور یہ مرہٹوں کے خلاف جنگ میں مصروف تھا اس لئے پھر دہلی چلے گئے اور وہاں سے پھر لکھنؤ آکر، مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔ یہ زمانہ آصف الدولہ کا تھا۔ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں سنہ ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا۔

انشاء — دہلی سے نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ گئے۔ پہلے مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے متوسل ہوئے، پھر نواب کے دربار سے۔ سنہ ۱۲۳۳ھ میں یہیں انتقال کیا۔

شاہ نصیر — دہلی کے باشندہ تھے۔ اول مرتبہ مصحفی و انشاء کے زمانہ میں لکھنؤ گئے اور پھر ناسخ و آتش کے دور میں، لیکن زیادہ قیام نہیں کیا۔ اور حیدرآباد چلے گئے۔

نسیم — دہلی کے باشندہ تھے۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں لکھنؤ گئے۔ سنہ ۱۲۸۲ھ میں یہیں انتقال کیا۔

نظام الدین ممنون — دہلی کے رہنے والے تھے لیکن یہ بھی لکھنؤ آئے اور سرکار اودھ نے کافی قدردانی کی، بعد کو اجمیر کے صدر الصدور ہوگ

دہلی و لکھنؤ کے مشہور شعراء جو رامپور گئے

قیام الدین قائم — سنہ ۱۱۷۰ھ کے قریب نواب محمد یار خاں کے پاس ٹانڈہ پہونچے اور جب نواب رامپور گئے تو یہ بھی وہیں چلے گئے۔

حکیم مومن خاں مومن — نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہد میں غدر سے پہلے رامپور گئے اور نواب کے اُستاد ہوئے۔ مومن کا شعر ہے:-

دلی سے رامپور میں لایا جنوں کا جوش　　ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

یہاں سے کب واپس گئے اس کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔

غالب — غدر کے بعد نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور گئے اور نواب کے اُستاد ہوئے۔

میر حسین تسکین — شاہ نصیر اور مومن کے شاگرد۔ نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور پہونچے اور یہیں سنہ ۱۲۹۶ھ میں انتقال کیا۔

ضامن علی جلال لکھنوی — غدر کے بعد رامپور گئے۔ نواب یوسف علی خاں کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں بھی وہیں رہے۔ پھر لکھنؤ چلے آئے اور سنہ ۱۳۲۵ھ میں یہیں انتقال کیا۔

اسیر لکھنوی — نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور گئے۔ نواب کلب علی خاں کا بھی زمانہ دیکھا۔ سنہ ۱۲۹۹ھ میں وفات پائی

امیر اللہ تسلیم — غدر کے بعد نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور پہونچے۔ نواب حامد علی خاں کے زمانہ میں انتقال ہوا (۱۳۲۹ھ)

ظہیر دہلوی — ذوق کے شاگرد تھے، لکھنؤ کے ارادہ سے دہلی کو چھوڑا، لیکن پہونچ گئے رامپور۔ نواب کلب علی خاں کا زمانہ تھا۔

امیر مینائی — سنہ ۱۲۷۵ھ میں بعہد نواب یوسف علی خاں رامپور گئے۔ جب سنہ ۱۲۸۱ھ میں نواب کلب علی خاں تخت نشین ہوئے تو ان کی بڑی قدر ہوئی۔ نواب کے انتقال پر حیدرآباد گئے اور وہیں سنہ ۱۳۱۸ھ میں انتقال ہوا۔

داغ — غدر کے بعد نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور پہونچے۔ نواب کلب علی خاں کے عہد میں بھی وہیں رہے پھر حیدرآباد چلے گئے۔

بحر لکھنوی — یہ بھی نواب کلب علی خاں کے عہد میں رامپور گئے تھے۔

اصلاحِ زبان

اور

لکھنؤ کی گراں قدر خدمات

اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اردو زبان پیدا ہوئی دہلی میں اور پروان چڑھی لکھنؤ میں۔ یہ بات کہ بچپن میں کس کی گودوں میں پلی ہوش کہاں سنبھالے، اس کا بچپن جوانی سے کہاں بدلا اور آراستہ پیراستہ کن ہاتھوں سے ہوئی اور ترقی کی بلندیوں پر اس کو کن لوگوں نے پہنچایا، اس کا فیصلہ کچھ مشکل نہیں ہے۔

پیدا ہوئی دلی میں اور پلی دلی میں، پھیلی چمن ہند کے مختلف حصوں میں اور سنواری گئی لکھنؤ میں۔ اس لیے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کی ابتدا سے دہلی کے بھلے مانسوں کے بیشمار خاندان لکھنؤ آکر آباد ہوتے رہے اور ہمیشہ کے لیے وہیں بس گئے لہذا ہندوستان کے کسی شہر کو دہلی والوں سے اس قدر ربط ضبط کا موقع نہیں ملا جس قدر لکھنؤ کو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں شہروں کی زبان میں ایک نوعی مشابہت ہوگئی اور سوا خاص خاص الفاظ اور محاورات کے دونوں جگہ کی بات چیت اور لب و لہجہ میں کوئی مابہ الامتیاز تفریق باقی نہ رہی

وہ حضرات لکھنوی یا دہلوی جو اپنے آپ کو زبان اردو کا مالک خیال کرتے ہیں اور ان کو اس پر فخر ہے کہ صرف ہم ہی اُردو زبان کے کرشن ہیں اور ہماری ہی زبان کو لوگ اپنی زبان تصور کریں اور ہمارے ہی بولے ہوئے روزمرہ اور محاوروں کا اتباع کریں، ان کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ اگر وہ ان ہی رنگ رلیوں میں پڑے رہے اور انھوں نے اپنی زبان کی خبر نہ لی یا اس کے محفوظ رکھنے کے وسیلے بہم نہ پہنچائے اور اس کے الفاظ و محاورات کو بڑی احتیاط اور سمجھ بوجھ سے اکٹھا نہ کیا اور اس کی نظم و نثر کو زمانے کے مزاج کے موافق مُرتب نہ کر سکے تو اُن کی زبان کا وہ سرمایہ جو اُن کے لیے ہندوستان کی دوسری جگہوں کے مقابلے میں مابہ الامتیاز ہے حرف باطل کی طرح اُردو کی زرّیں لوح سے مٹ جائے گا اور یہی بری بھلی اردو جو عام اخبارات اور نئی نئی تالیفات اور تصنیفات کے ذریعے سے ملک کے کونے کونے میں نشو و نما پا رہی ہے اور جس کو وہاں کے لوگ تحیر آمیز نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں کچھ زیادہ نہیں دس بیس برس میں یہی ملک کی ٹکسالی اور فصیح بولی کہلانے کی مستحق ہو جائے گی۔

ناسخ کے قواعد

ناسخ کا مقرر کیا ہوا اصول یہ ہے کہ غیر زبان کے الفاظ میں تصرّف جائز نہیں سوائے اس حالت کے کہ عوام کے تصرف کی وجہ سے فصحا بھی اس کے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں (اس لیے کہ الفاظ اور محاورات کے استعمال میں عوام کا خیال بھی ضروری ہے) یا فصحا نے خود تصرف کر کے اس قدر رائج کر دیے ہوں کہ وہ روزمرّہ بول چال اور محاورے میں آگئے ہوں مثلاً گر فارسی اگر حرف شرط ہے اس کو اگر ہی باندھنا درست ہے چونکہ روزمرّہ میں یہ اگر بگڑ کے بصورت گر ہو گیا اس لیے فصحائے فارس نے اس تصرف کو جائز سمجھ لیا لیکن بعض فصحا نے اسی اصول پر کہ خاص و عام کی بول چال میں گر نہیں ہے بلکہ اگر ہی ہے اگر ہی کے لفظ کو بغیر کسی تصرف کے جائز مانا ہے، اسی طرح جن ہندی الفاظ میں اردو فصحائے نے تصرف کر کے اس کو اپنا بنا لیا ہے ان کے سوا ہندی لفظوں کا استعمال جائز نہیں مثلاً نمن (طرح کے معنی میں) اور ماس گوشت کے معنی میں، یہی وجہ ہے کہ اس قاعدے نے لکھنؤ اور دہلی کی زبان کو جو بالکل ایک ہی تھی دو مختلف صورتوں میں پیش کیا کیونکہ دلی والوں نے ہندی الفاظ کو جن کی تبدیلی اردو میں موجود ہے استعمال کیا ہے اور لکھنؤ کے فصحا نے اس کے استعمال سے گریز کیا ہے

یہ دورِ اصلاح اردو کا میر تقی میر تک جاری رہا اور میر کے آخر زمانے میں جب مصحفی اور انشا موجود تھے ناسخ نے اپنے اصلاحی طرز سے غزل گوئی شروع کی، اور اس میں شبہ نہیں کہ اس جدید انقلاب سے اردو کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا اول اول تو بعض اساتذہ برا بھلا کہنے پر اُتر آئے چنانچہ مصحفی کی غزلیں اس کی شاہد ہیں لیکن جب خیال اور توجہ کرنے سے یہ بات دماغ میں آئی کہ یہ اصلاح قاعدے کے مطابق ہوئی ہے اور ناسخ نے اس کی داغ بیل قواعد صرف و نحو پر ڈالی ہے تو وہ بھی متفق ہو گئے

اردو کی پہلی کتاب قواعد

یہ خیال کہ انشا نے سب سے پہلے قواعد صرف و نحو مرتب کیے مجھ کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ انشا نے بہت سے اصلاحات اور صرف و نحو کے قاعدے خود ناسخ سے لیے تھے میرے نزدیک افضلیت کا شرف ناسخ کو ہے نہ انشا کو اور میری رائے کی تائید صفیر بلگرامی کے جلوۂ خضر سے بھی ہوتی ہے

سب سے پہلی کتاب جو قواعد صرف و نحو میں مرتب ہوئی وہ شاہ حاتم کا مسودہ دیوان زادہ ہے اور صفیر بلگرامی کی بھی یہی رائے ہے کہ بیشک یہی پہلی تحریر ہے جو قواعد اُردو کے نام کو حاصل کر سکتی ہے، شاہ حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے تسبیح کو تسبی اور صحیح کو صحی، بیگانہ کو بگانہ اور دیوانہ کو دوانہ کہنا ترک کر دیا، لیکن اس ترک کا ثبوت ان کے کلام سے نہیں ملتا، اسی طرح ان کا بیان یہ بھی ہے کہ متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک کرنا میں نے چھوڑا لیکن ان کے کلام کو دیکھنے سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ ان کی باتیں ہی باتیں تھیں اور ان کے کلام میں وہ متروک کردہ الفاظ پائے جاتے ہیں

مثلاً خجل کو خجِل ؎

دیکھ سرو چمن ترے قد کو ن　　خجل ہے پا بگل ہے بے پر ہے

صحن کو صحن ؎ اے حسن کے گلزار، بہارِ چمنِ دل　　گلشن ترے آنے پہ ہوا ہے صحنِ دل

چتر کو چتر ؎ بادشاہوں کو ہے گر تخت و چتر کا تکیہ　　ہے فقیروں کے تئیں پیر کے در کا تکیہ

شاہ حاتم ہی دوسری جگہ فرماتے ہیں ہندی کے لفظ مثلاً نین، جگ، نت وغیرہ میں نے ہی نظم اُردو سے مٹا دئے حالانکہ یہ الفاظ ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں مثلاً ؎

مثالِ بحر موجیں مارتا ہے　　کیا ہے جن نے اس جگ سوں کنارا

آبِ حیات جانے کسو نے پیا تو کیا　　مانند خضر جگ موں اکیلا جیا تو کیا

البتہ ناسخ نے ضرور اس کی پابندی کی کہ جو لفظ ترک کر دیا، ترک کر دیا نہ خود اسے استعمال کیا نہ اپنے شاگردوں کو استعمال کرنے دیا ہندی الفاظ کے متعلق اس نے یہ اصول مقرر کیا کہ ترکیب کے ساتھ محاورے کی شکل میں یا ضرب المثل کے اندر جائز ہے مثلاً تنہا جگ یا نت کا استعمال تو درست نہیں۔ بہر حال حاتم نے خود عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ قواعد صرف و نحو کی طرف سب سے پہلے اُن کو خیال ہوا، دیوان زادہ کے بعد مرزا جان عیش دہلوی کی کتاب ہے جو سنہ ۱۲۰۷ھ میں شمس الدولہ نواب احمد علی خاں بہادر ذوالفقار جنگ کی فرمائش سے مرشد آباد میں لکھی گئی، اس کے بعد میر امبر جان گلگرائسٹ کی قواعد کا ہے جو سنہ ۱۲۱۲ھ میں لکھی گئی، انشا نے دریائے لطافت سنہ ۱۲۲۲ھ میں لکھی جس کا تاریخی نام اردوئے ناظمی ہے یہ مصطلحات عیش کے ۱۶ سال بعد اور قواعد گلگرائسٹ کے ۶ برس بعد لکھی گئی ہے اس لیے یہ عام خیال کہ انشا نے پہلی قواعد مرتب کی درست نہیں ہے۔ ذیل کے نقشوں سے واضح ہو گا کہ ولی دکنی سے لیکر عہد ناسخ تک زبان و محاورات میں کس کس قسم کی تبدیلیاں پیدا ہوئیں،

ولی دکنی اور میر و مرزا کی زبان کا فرق

ولی دکنی کی زبان	تبدیلی الفاظ بوقت میر و مرزا	ولی دکنی کی زبان	تبدیلی الفاظ بوقت میر و مرزا
نین	چشم	اچھے	ہے
کال	مصیبت	ماس	گوشت
نن	طرح	موہن	معشوق
درشن	زیارت، دیدار	ہتی	سے
ساجن	معشوق	آپس	اپنے
جگ	دنیا	پیو	دوست، معشوق، یار

پیا	معشوق	بنا	بن
برہا	عشق	سون	سے
پگ	پگڑی	مکھ	منھ
سنسار	دُنیا	انجھو	آنسو
باٹ	رستہ	بوجھے	سمجھے
منے	میں	چند	چاند
سجن	معشوق	کدھیں	کبھی
دوجا	دوسرا	اِتا	اِتنا
لگ	تک	درس	زیارت
کن	پاس	دارو	دوا
دستا	مانند	گلنا	پگھلنا
پیتم	معشوق	کدھی	کبھی
[illegible]	آئینہ	سین	سے
[illegible]	نغمہ سرا	آرسی	آئینہ
درپن	آئینہ	جیو	جی
دِکھا	دکھا		

میر و مرزا اور ناسخ کی زبان کا فرق

میر و مرزا کی زبان	ناسخ کی زبان	میر و مرزا کی زبان	ناسخ کی زبان
پہن	لیکن	آگو	آگے
نپٹ	بہت	طرح غنچہ	غنچہ کی طرح
پرے	الگ	کریو	کیجیو
میں	میں نے	بدلا کرنا	بدلا لینا

لاگا	لگا	اوُر	طرف
تین	تو	جوں ایندھن	ایندھن کی طرح
دوانہ	دیوانہ	چلا جائے ہے	چلا جاتا ہے
ان نے	اس نے	پگاہ کا نالہ	نالۂ سحر
تجھ بن	بے تیرے	ٹک	ذرا
اس کو پوچھنا	اس سے پوچھنا	میرے موے گئے	میرے مرنے کے بعد
سجن	صنم	طَرُف	طَرَف
حال سہنا	صدمہ سہنا	تجھ تئیں	تجھ تک
یون بھی	ہوا جلی	نت	ہمیشہ
رنگ جھکے ہے	رنگ جھلکتا ہے	بدشراب	بدمست
کسو	کسی	ٹھہرنا	جھکنا
جامۂ کم گھیر	کم گھیر کا جامہ	رو رکھنا	منہ رکھنا
اس دم تئیں	اس وقت تک	جاگہ	جگہ
شمع کا گلنا	شمع کا پگھلنا	اس کنے	اسکے پاس
داغ ہوں	داغ کھاتا ہوں	قاصد چلانا	قاصد بھیجنا
ندان	ہمیشہ	دارو	شراب
لوہو	لہو	انتہا لانا	انتہا کو پہونچنا
بستار	شہرہ	جائے باش	جائے بود و باش
دختِ تاک	دختِ رز	ہلاکی کو پہونچنا	ہلاکت کو پہونچنا
دامن چلنا	دامن مسکنا	بھروسا پڑنا	بھروسا ہونا
سر کو فرو لانا	سر کو فرو کرنا	خرابا پھیلنا	خرابی پھیلنا
جانا جاتا ہے	سمجھا جاتا ہے	نمط	طرح
ہر پات ہرے کے اوجھل	ہر ایک ہرے پتے کے اوجھل	اس کے گئے	اسکے جانیکے بعد
خاک میں رُل جانا	خاک میں مل جانا	دار کھینچنا	دار پر کھینچنا
دریا کا سا	دریا سا	پالہ	پیالہ

دہلوی اور لکھنوی زبان کا فرق

الفاظ و محاورات دہلی	نام شاعر مع سنہ	کلام		لکھنوی زبان
تا	مصحفی سنہ ۱۲۴۰ھ تک	لبِ زخمِ قلم ذرا وا ہو	تا کہیں تجھ سے نالہ پیدا ہو	تا کہ
پیچاک	"	کہیں پیچاکِ آہ کر تحریر	دے بنا زلف کی کہیں زنجیر	پیچ و خم
طراحی، دور کھنچنا	"	تیری طراحیوں سے دور کھنچا	کئی اہلِ سخن نے اس کو لکھا	طرحداری، دور تک کھنچنا بہت مشہور ہوا
رمز جتانا	"	رمزِ شق القمر جتا دے تو	معجزہ اپنا ٹک دکھا دے تو	راز بتا دینا
نپٹ	"	ایک جا اک جوان خوش ظاہر	تھا نپٹ فنِ عشق سے ماہر	کامل بخت
نادیدہ	"	بہ تقاضائے عشق سنجیدہ	لیکن اس پر بھی تھا وہ نادیدہ	ندیدہ، لالچی
جوں، دوں	"	جوں پہ اس کے سما گئی جی میں	دوں کچھ اس کے بھی آگئی جی میں	جونہی، جیسے ہی اسی وقت، ویسے ہی
ناگہ، حیران وار	"	جس کا ناگہ ہوا ادھر سے گزار	وہ رہا دیکھ اس کو حیراں وار	ناگہاں، حیران
دھائے	"	یک بیک اس جوان پر دھائے	لڑکے کیا آئے اک بلا آئے	چڑھ دوڑے
آنکھ مندنا	سرور سنہ ۱۲۴۴ھ تک	اور تو باتیں بری چھٹ گئیں سب جیتے جی	آنکھ مندی پر چھٹا ایک مگر دیکھنا	آنکھ بند ہونے پر
ہوئینگے	"	اس بڑھاپے میں بھی کم ہوئینگے لہری ہمسے	سبزہ رنگوں سے چھنا کرتی ہے گہری ہمسے	ہونگے
ولے	"	روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم واں سے ولے	لڑکے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے	ولیکن
آ	"	چشم ترسے گرچہ آ مژگاں پہ پانی بھر گیا	اس پہ بھی تو نوح کے طوفاں کا پانی بھر گیا	آکر
دیکھوں ہوں	فراق سنہ ۱۲۴۱ھ تک	میں رکھ کے ہاتھ جو سینے پہ اپنے دیکھوں ہوں	قدم جو رکھوں تو نقشِ قدم نہیں ہوتا	دیکھتا ہوں
تنک	"	دامن تنک گیا تھا کہیں اس کے دستِ دم	اللہ ری نازکی وہیں چولی مسک گئی	تک

نسط	شاہ نصیر ۱۲۵۵ھ تک	کمان و تیر نسط ربط تھا مجھ اس سے	جب اس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا	کی طرح
کبھو، چھائیاں	"	کبھو جو اس رخ روشن پہ چھائیاں دیکھیں	گھٹائیں چاند پہ سو بار چھائیاں دیکھیں	کبھی، چھائی ہوئی
دیکھ	"	فلک پہ دیکھ مرے دود آہ کا ٹکڑا	گھٹا ہے شرم سے ابر سیاہ کا ٹکڑا	دیکھ کر
سہمے ہے کیا	"	تیر خاکی ہے نگاہ سُرمہ آلود اسکی دیکھ	مرغ دل سہمے ہے کیا؟ ہے گا نشانہ تیر کا	کیا سہما جاتا ہے
کیونکہ	"	ہو ذوق سا تیا! بطرے کے شکار کا	پھندا بناؤں کیونکہ نہ بارش کے تار کا	کیونکر
چشم (بمعنی امید)	"	خاک اب پروانۂ دل سوز رکھے تجھ سے چشم	تیری آنکھوں پر تو چربی چھا گئی یک بار شمع	امید
سُوجھے ہے	"	سرکشی بے وجہ کچھ کرتی ہیں زلفیں آپ کی	مجھ کو سوجھے ہے کہیں یہ مار اب کھاویں نہیں	معلوم ہوتا ہے
آئے جائے ہے، چیتو	"	اے غافلو! دم اژدہا صفت آئے جائے ہے	چیتو! کہ نخل عمر کو یہ کھائے جائے ہے	آتا جاتا ہے، ہوشیار ہو
کاڑھنے	"	قبا دیکھی ہے پھلکاری کی یہ کس ماہ پارہ کی	فلک جو کاڑھنے سیکھا ہے ٹوپی چاند تارہ کی	کاڑھنا

وہی، ہوویگا	میر ممنون ۱۲۶۰ھ تک	بخدا بندے کو وہی خط آزادی ہے	نامہ اغیار کو گر اب کی رقم ہووے گا	وہی، ہوگا
تقاضا کا	"	الٰہی وہ جو وعدے ہیں وفا کس طرح ہوویں گے	نہ واں خو یاد آنے کی نہ یاں شیوہ تقاضا کا	تقاضے کا
دُنبال	"	ہیں رواں ناقے کے دُنبال ہزاروں بیتاب	دیکھیو پردہ محمل نہ اٹھانا اپنا	پیچھے

تیرے بن	رنج ۱۲۶۱ھ تک	تیرے بن جب تک کہ میرا دم رہا	آہ اور نالہ ہی بس ہردم رہا	بے تیرے

آفت رسیدگاں کا	احسان ۱۲۶۶ھ تک	پہونچ اے اجل کہ لب پر اٹکا ہے کام جاں کا	حامی ہے کون تجھ بن آفت رسیدگاں کا	آفت رسیدوں کا

اس سبب	عارف ۱۲۶۶ھ تک	اے پری تیری زباں کی نہیں فہمید ہمیں	اس سبب اُٹھتی ذرا لذت دشنام نہیں	اس سبب سے
کیجے	"	مجھ کو اور آپ کو عالم میں نہ رُسوا کیجے	آپ ہو رہیے مرے یا مجھے اپنا کیجے	کیجئے

دکھلا دکھلا	تسکین ۱۲۶۶ھ تک	دیکھے کیا میری طرف یاد ہے اس کو اپنی	چشمکیں غیر سے کرتیں مجھے دکھلا دکھلا	دکھلا دکھلا کر
کُو	"	اُس کُو میں مجھ کو جانے سے کرتا ہے منع ہائے	ناصح کو کوئی جا کے کرے پاسبان غیر	کوچہ
تسکین دیہ	"	نام تسکین دِہ یہ مضمون تپش نازیبا	تھا تخلص جو سزاوار تو بےتاب مجھے	تسکین آور دِہ

جائے جائے	مومن سنہ ۱۲۶۸ھ تک	بعد مدت اسی کو سے یوں پھرے تنگ آ کر	جائے جائے پھرتے ہیں پوچھتے ہیں مکاں اپنا	جگہ جگہ
خطوں	"	کیا جواب آئے کہ کثرت سے مرے خطوں کے	کیمیا اب سیاہی بنی عنقا کاغذ	خطوں (بلا تشدید)
مسیحی	"	لب کا ترے دعوی مسیحی	مرادر ہے آزمائیں گے ہم	مسیحائی
کہوے	"	کہوں گر غیر سے مت مل تو کہوے طعن سے رک کر	یہ کیوں کس واسطے ہم تیرے ایسے ہوگئے بس ہیں	تو کہتا ہے یا تو کہے
صورت بلبل گلستاں بیاں	"	برنگِ صورتِ بلبل نہیں نوا سنجی	یہ کیا ہوا کہ چپ اے گلستاں بیان لگی	تصویر بلبل رنگیں بیاں
بن ملے بہل	"	پیغام سے بن ملے ہو کیونکر تسکین	باتوں میں بہل جائے عاشق ہی نہیں	بے ملے بہل بروزن محل
شمر	"	دل ایسے شوخ کو مومن نے دیدیا کہ وہ ہے	محبِ حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا	شمر
پاؤں وہ نازک	"	لجائے گر یہ خاک میں اس نے وہاں کی خاک	گل کی تھی کیونکہ پاؤں وہ نازک پھسل گیا	وہ نازک پاؤں
ہر بار لگا	"	ٹانکنے چاک گریباں کو تو ہر بار لگا	ہاتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اک تار لگا	بار لگا کر ٹانکنے
سم کھا موے	"	سم کھا موے تو دردِ دلِ زار کم ہوا	ہائے کچھ اس دوا سے تو آزار کم ہوا	زہر کھا کر مر گئے
تغافلِ بسیار	"	ہر چند اضطراب میں میں نے کمی نہ کی	تو بھی نہ واں تغافلِ بسیار کم ہوا	تغافلِ کثیر
دو گیا	"	شوخیٔ قاتل کے میں قربان ہوں	کہتے رہے سب، یہ گیا دو گیا	وہ گیا

کھوج	ذوق سنہ ۱۲۷۱ھ تک	اُسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا	اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا	سراغ
دارو	"	پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق	نامرد مرد - مرد جواں مرد ہوگیا	دوا
روشِ مرد	"	سو بار مر کے عاشقِ جاں باختہ ترا	اٹھنے لو پھر کھڑا روشِ مرد ہوگیا	بصورت مرد
تا جی سے	"	آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے	جب تک اسے غصہ نہیں آتا نہیں آتا	جبتک جی سے
ناچار، سب فن	"	قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ	سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا	ناچار، ہر فن
نالا	"	دیا قمری کو مصرع نالا	مصرع قدِ سرو بر بالا	نالہ

پریشان حالوں کی دیکھ	رسا سنہ ۱۲۷۰ھ تک	پریشان حالوں کی جب قدر جانو ہوگیا اس کو دیکھ حیراں دل	جو اس طرح ہو دل پریشاں تمہارا بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوا	پریشاں حالوں کی بغیر اظہار نون دیکھ کر

کوئی دن کی	نصیر سنہ ۱۲۷۱ھ تک	توبہ تو کوئی دن کی ہے پھر آپ ہی حضرت	قابو میں نہ دل ہوگا تو کیا کیا نہ کریں گے	چند دن کی

مے پیے ہی بنی	عیش سنہ ۱۲۷۱ھ تک	زہد و تقویٰ دھرے رہے سارے	ہاتھ سے اس کے مے پیے ہی بنی	بے پیئے ہی بنی
گرہیں	نسیم سنہ ۱۲۸۳ھ تک	لاکھوں گرہیں ہیں دلِ عاشق کی طرح سے	شانہ شکنِ زلف کو سُلجھا نہیں سکتا	گرہیں
بر خیز حشر	"	گر جانتے جگائے گی بر خیز حشر کی	احساں نہ لیتے راحتِ خوابِ مزار کا	غوغا حشر کا
کاہے سے	"	تھا کچھ تو جب بھی یہ نہ کہو تم کہ کچھ نہ تھا	گر کچھ نہ تھا تو کاہے سے سارا جہاں بنا	کس چیز سے
سبک جاں	"	لو فراغت ہو گئی کیسا سبک جاں ہو گیا	چاک دامن ہو گیا ٹکڑے گریباں ہو گیا	سبکسار
براہم	"	اڑے اوراقِ گل بادِ خزاں سے	ہوئی براہم کتابِ گلستاں آج	ابتر
براہم	"	خیالِ کاکلِ براہم سے حال ہے براہم	پھنسی ہوئی ہے عجب دامِ انتشار میں روح	درہم
میری خاطر نے	"	سکھائی ہے نئی تدبیر مجھ کو میری خاطر نے	پسند آتا ہوں دشمن کو بھی تیری گفتگو ہو کر	میرے دل نے
کہوں	غالب سنہ ۱۲۸۵ھ تک	مومن و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید،	مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں،	کہیں
کیے بغیر	"	گھر جب بنا لیا ترے در پر کیے بغیر	جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کیے بغیر	بغیر کیے
دے	"	مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام	چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر	و لیکن
جوں	آزردہ سنہ ۱۲۸۵ھ تک	جوں سرا پائے یار آزردہ،	میر کے دیواں کا انتخاب نہیں،	مثل
لے، سج	"	صُبح لے آئنہ اس سج کو دکھایا ہم نے	رات اغیار سے ملنے کو جو اتکار ہوئے	لیکر، معشوق
بھٹانا	شیفتہ سنہ ۱۲۸۶ھ تک	ہے ترا سلسلۂ زلف بھی کتنا دل بند	پھنسنے سے پہلے ہی مشکل تھا چھٹانا دل کا	بھڑانا
ہم آغوش	"	تنگ اتنا نہ کرا، شوقِ ہم آغوش کہ وہ	ڈھونڈھتے ہیں چلے جانے کو بہانا شبِ وصل	ہم آغوشی
نیم کشت	"	کیا جانے دردِ زخم کو گو ہو شہیدِ ناز	جو نیم کشتِ خنجرِ رشکِ عدو نہیں	نیم کشتہ، نیم بسمل
پینے بُرد دیا، کو	"	دیکھ کر چشمِ غضب کو اسکی میں نے رد دیا	چاہیے پانی ملا لینا شرابِ تیز کو	میں رد دیا، میں -
نہ کیجو	رفعت سنہ ۱۲۹۱ھ تک	نہ کیجو قصد تو پیکاں کے آزمانے کا	کہ زخم دل کو ہی پانی کے ڈھب چرانے کا	نہ کیجیو
سدا	"	بیٹھ اے تیرِ ستم گر تو دلِ زار کے پاس	بیٹھے یار ہیں دنیا میں سدا یار کے پاس	ہمیشہ
دولت	صابر سنہ ۱۲۹۱ھ تک	عصیاں کی دولت اب تم بخلت ہے بعد مرگ	انتقا رہے غبار کو دشوار ہو گیا	بدولت
ہرجائی پنے	"	گر حرم میں اور گاہے دیر میں دیکھا اسے	طورِ ہرجائی پنے کا اس پہ کیا زیبا ہوا	ہرجائی پن
مجھکو جگہ	"	مجھ کو جگہ کہاں ہو کہ آتا نہیں نظر	دل میں ترے تو غیر سے خالی مکاں مجھے؟	میری جگہ
کار	"	دیر میں آگے ہوئے اور بھی جلوے سے دوچار	مل گئے وہ جو ضلالت سے پڑا کار مجھے	کام

بک رفت	شفق ۱۲۹۱ھ تک	ہم بک رفت چلے جانب صحرائے عدم	سیر ہستی کی مبارک ہو گراں جانوں کو	بک رو
چارہ	ساحر ۱۳۰۰ھ تک	گر زخم پوست ال بھی دے اس کے تیغ عشق	بس چارہ عمر بھر نہ کرو دل اندمال کا	فکر، خیال
خضر	،	ہوں راہ رو اس وادی پر خوف و خطر کا	جس میں نہ ملا نقش قدم تک بھی خضر کا	خضر
ناموس	،	ناموس ضبط کھوتی ہے کیوں اے صدائے حور	اس بدگماں کو ہو نہ گماں مجھ پر آہ کا	عزت
راز دیتے نہیں	،	راز دیتے نہیں ہم، دوست ہو یا دشمن ہو	حال کہہ دیتے ہو تم غیر سے کیونکر اپنا	راز کہتے نہیں
ملنے کو ہو گا	داغ ۱۳۰۲ھ تک	آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں	آپ کے ملنے کو ہو گا جسے ارماں ہو گا	ملنے کا ہو گا
کوئی روز	،	ہائے مہمان کہاں یہ غم جاناں ہو گا	خانۂ دل تو کوئی روز میں ویراں ہو گا	چند روز
اب سے	،	زندگی عشق میں مشکل ہے تو مر جائیں گے	اب سے وہ کام کرینگے کہ جو آساں ہو گا	آئندہ سے
سندیسا	،	سن کے وہ حال مرا غیر سے فرماتے ہیں	آئے ہیں آپ محبت کا سندیسا لے کر	پیام
عاقبت	،	عاقبت کثرت عصیاں سے مرے گھبرا کر	رہ گیا کاتب اعمال کو لکھنا باقی	آخرکار
سحر کہتا ہے	،	دم اعجاز مسیحا کو برا کہتا ہے	لب ترا سحر کچھ اے ہوش ربا کہتا ہے	سحر کرتا ہے
صبر کیے سے	،	کچھ صبر کیے سے بن نہ آیا	یوں بھی تو بہت دنوں بسر کی	صبر کرنے سے
اپنے بھی عکس سے ہے	،	اللہ رے غرور کہ آئینہ دیکھ کر	اپنے بھی عکس سے ہے شکایت سلام کی	ہو اپنے عکس سے بھی
کہے بنا	،	محشر میں حال دل دم پرسش کہے بنا	کیا کیا مرے جواب نے رسوا کیا مجھے	کہتے بنا
او اچھاتا	،	ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی	اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی	کیفیت طاری ہونا

داغ کا کلام البتہ شروع سے آخر تک دیکھ جائیے ان مزخرفات سے پاک ہے لیکن کہیں کہیں انھوں نے بھی وہی الفاظ و محاورات باندھے ہیں جو لکھنؤ میں متروک ہو چکے مگر ایسا شاذ و نادر ہے۔

بعض مقامات پر داغ نے خاص خاص دہلی کے محاورات لکھے ہیں جو لکھنؤ میں بالکل استعمال نہیں کیے جاتے۔

مثلاً	عاقبت کثرت عصیاں سے مرے گھبرا کر	رہ گیا کاتب اعمال کو لکھنا باقی	آخرکار
،	دم اعجاز مسیحا کو برا کہتا ہے	لب ترا سحر کچھ اے ہوش ربا کہتا ہے	سحر کرتا ہے
،	کچھ صبر کیے سے بن نہ آیا	یوں بھی تو بہت دنوں بسر کی	صبر کرنے سے
،	اللہ رے غرور کہ آئینہ دیکھ کر	اپنے بھی عکس سے ہے شکایت سلام کی	ہو اپنے عکس سے بھی
،	محشر میں حال دل دم پرسش کہے بنا	کیا کیا مرے جواب نے رسوا کیا مجھے	کہتے بنا

نور الحسن نیر (کاکوروی)

آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

دہلی اور آگرے کا شاعرانہ تعلق تین حیثیتوں سے واضح کیا جا سکتا ہے

(۱) جغرافیائی حیثیت سے،

(۲) تاریخی حیثیت سے،

(۳) اس حیثیت سے کہ دہلی کے زمانہ شعر و شباب کی شہرت و عظمت میں شعرائے اکبر آباد (آگرہ) نے کتنا حصہ لیا؟

جغرافیائی حیثیت سے، دہلی، آگرہ اور لکھنؤ آج سے چند سال پہلے تک ایک ہی صوبے کے تین ممتاز شہر تھے، ممالک متحدہ میں انہیں تین شہروں کو وقتاً فوقتاً دار السلطنت بننے کا موقع ملا ہے اور یہی تین مقام مرکز ادب اردو رہے ہیں

انتقال دار الصدر کے بعد بھی جغرافیائی حیثیت سے آگرہ، لکھنؤ اور دہلی کے بین بین تھا اور ہے اس لیے دہلی اور لکھنؤ کو آگرے سے وہی تعلق رہا جو کسی نہال کے برگ و بار کو اصل سے ہوتا ہے، ہندوستان کے نقشے میں اب بھی آگرہ، دہلی اور لکھنؤ کے محاذی خطوط کا وسطی حصہ ہے

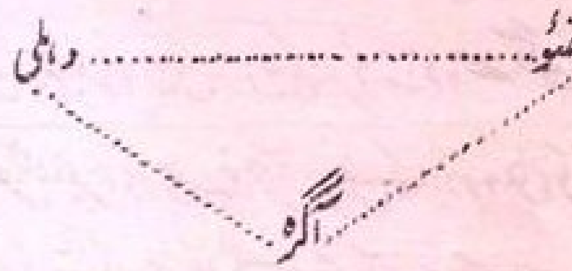

لہذا جغرافیائی اعتبار سے ماننا پڑے گا کہ لکھنؤ، آگرہ اور دہلی ایک ہی زنجیر کی تین کڑیاں ہیں اور لسانی حیثیت سے ان تینوں کو ایک دوسرے سے قطعاً مربوط ہونا چاہیے۔

تاریخی توضیح یہ ہے کہ آگرہ، سکندر لودی، ابراہیم لودی، بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد سلطنت تک ہندوستان کا پایۂ تخت رہا ہے اور اردو زبان ان میں سے آخری تین بادشاہوں کے زمانے میں ہندی، فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے اختلاط سے بنی ہے

۱؎ عہد جلال الدین محمد اکبر میں جو مردانہ اور زنانہ بازار قلعہ (آگرہ) میں لگتا تھا اسے "اردو" کہتے تھے، جہانگیر کے عہد میں بھی یہ بازار آباد رہا

۱؎ ظہیر الانشاء

وہاں لین دین بدستور اسی مخلوط زبان میں ہوتا تھا، شاہ جہاں نے اسے اور رونق دی، یہ شاہی بازار چونکہ احتراماً اور تعظیماً "اُردوئے معلےٰ" کہلاتا تھا اس لیے اس نئی زبانِ مرکب کا نام بھی اُردوئے معلےٰ رکھا گیا۔

صاحب "ظہیر الانشا" کے اس بیانِ محقق سے ظاہر ہے کہ اس مخلوط زبان (اُردو) کی بنیاد سب سے پہلے قلعۂ آگرہ میں پڑی۔ وضع زبان کے بعد پہلے بھاشا (ہندی اُردو) میں شاعری کا رواج ہوا اور پھر اُردو شاعری وجود میں آئی۔

جلال الدین محمد اکبر کے عہد سے عہد شاہجہاں تک فارسی شاعری زیادہ مقبول و مروّج تھی جسے مغل سلطنت اپنے آبائی وطن سے ساتھ لائی تھی، اس تمام زمانے میں بھی اکبر آبادی الاصل شعرا موجود تھے۔ مثلاً شیخ ابو واجد فارغی، علامہ فیضی بن ملا مبارک، میر حشمتی ملا صبوحی چغتائی، ملا شیدا، محمد امین ذوقی، عبداللہ سحری وغیرہ وغیرہ، لیکن اردو شاعری کا رواج تدریج عہد اورنگ زیب عالمگیر سے شروع ہوتا ہے

عہدِ شاہجہاں میں جب بعض سیاسی مصالح کی بنا پر حکومت کا پایۂ تخت آگرے سے دہلی منتقل ہو گیا تو آگرے کے ادبا اور شعرا نے بھی دہلی کا رُخ کیا، حتیٰ کہ جب دہلی سے کاروان ادب لکھنؤ پہنچا تو میر کاروان میر تقی میر اکبر آبادی ہی تھے

اگر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مرزا عبدالقادر بیدل، میر جعفر زٹلی اور نواب لطف اللہ خاں صادق وغیرہ شعرا نے دہلی کے مطلع سخن کو چمکایا تو عالمگیر ثانی کے عہد میں قاضی سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی اور مرزا مظہر جانِ جاناں اکبر آبادی خلف مرزا جان علوی آگرے ہی کی شاعر خیز خاک سے اٹھے اور دہلی میں صدر الصّدور بن کر بیٹھے۔

میاں نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو کا مولد گوالیار تھا لیکن اگر میر و غالب کی زاد گاہ آگرہ ہونے کے باوجود انہیں دہلوی مانا جا سکتا ہے تو آبرو کو اکبر آبادی کہنے میں کوئی چیز مانع نہیں۔ جن کی عمر کا زیادہ حصہ آگرے میں گزرا اور جو عہد عالمگیر ثانی کے بہت مشہور شاعر ہیں

عہد محمد شاہ میں (۱۷۲۰ء) میر باقر علی مخلص اکبر آبادی نے نقل وطن کیا اور دہلی کی محفل ادب کو چار چاند لگا دیے۔

خان آرزو کے ارشد تلامذہ میں میاں شرف الدین علی پیام اکبر آبادی بھی اسی عہد کے ممتاز شاعر تھے، بیشتر فارسی میں اور کمتر اُردو میں شعر کہتے تھے، یہ بھی آگرے ہی سے دہلی گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔

اسی طرح میر باقر علی جعفر اکبر آبادی برادر زادہ نظام الدین ممنون آگرے میں پیدا ہوئے اور آخر عمر میں دہلی چلے گئے۔

میر باقر حزیں اکبر آبادی مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد اور سپاہی پیشہ آدمی تھے، سادات آگرہ میں سے تھے یہ بھی آگرے سے دہلی گئے اور پھر وہاں سے بنگال چلے گئے۔

میر تقی میر، میر عبداللہ اکبر آبادی کے فرزند اور ہمشیر زادہ سراج الدین علی خاں آرزو تھے، آگرے میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت پائی، یہیں شعر کہنا سیکھا، اور پھر اپنے باپ عبداللہ کے انتقال کے بعد دہلی چلے گئے وہاں راجہ ناگر مل کی رفاقت میں

کچھ دن بسر کیے، دہلی اب اجڑ رہی تھی اور لکھنؤ آباد ہو رہا تھا اس لیے دہلی میں آپ کا قیام زیادہ نہ رہا، اور وہاں سے دوسرے شرفا اور اُدبا کی طرح آپ بھی لکھنؤ چلے گئے۔

محمد عارف عارفؔ اکبرآبادی، میر تقی میرؔ کے دوست، اور شیخ شرف الدین مضمونؔ[1] کے شاگرد تھے، رفوگری پیشہ کرتے تھے جب میر تقی میرؔ دہلی گئے تو عارفؔ اپنے دوست کی مفارقت برداشت نہ کر سکے اور ترک وطن کر کے خود بھی دہلی چلے گئے۔

مغل سلطنت کے آخری تاجدار سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفرؔ کے عہد میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اکبرآبادی بھی تعلیم و تربیت اور کافی مشق سخن کے بعد آگرے سے دہلی پہنچے۔ مرزا رفیع سوداؔ میرؔ اکبرآبادی کی طرح دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جا چکے تھے، مگر ان کے شاگرد رشید شاہ نصیرؔ اور شاہ نصیرؔ کے شاگرد ابراہیم علی خاں ذوقؔ دہلوی کی موجودگی میں مرزا غالبؔ اکبرآبادی نے اپنا پرچم سخن ایسا لہرایا کہ حریف بن کر کوئی ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔

۱۸۶۹ء یعنی مرزا غالبؔ کی وفات تک، آگرہ اور دہلی کا اتحاد و تعلق شاعرانہ اسی نوعیت سے تھا جس کا ذکر مجملاً میں کر چکا ہوں یعنی آبروؔ اکبرآبادی، آرزوؔ اکبرآبادی، مظہرؔ اکبرآبادی، مخلصؔ اکبرآبادی، پیامؔ اکبرآبادی، جعفرؔ اکبرآبادی حزیںؔ اکبرآبادی، میرؔ اکبرآبادی، عارفؔ اکبرآبادی، اور غالبؔ اکبرآبادی یہ سب آگرے ہی کی خاک پاک کے تربیت یافتہ تھے آگرے ہی میں پیدا ہوئے، آگرے ہی میں پروان چڑھے یہیں تعلیم پائی، یہیں شاعر بنے اور پھر دہلی کی مرکزیت نے انہیں اپنی طرف کھینچ کر تاریخ ادب اردو کا ہیرو بنا دیا،

یہ میرا خیال یا بیان نہیں ہے، بلکہ اس مضمون کی ترتیب کے وقت میرے مطالعہ کے تخت پر نکات الشعرا، مآثر الامرا، تصویر الشعرا، آب حیات، مخزن نکات، منتخب التواریخ، خزانۂ عامرہ، ظہیر الانشا، نتائج الافکار، تذکرہ سرخوش، مرآۃ العالم، گلشن بہار اور تذکرۃ الانساب وغیرہ کتابیں اور تذکرے موجود ہیں، ان تذکروں کو پیش نظر رکھ کر میں نے جو کچھ لکھا ہے میں اسے ایک تحقیقی نقطۂ نظر یقین کرتا ہوں۔

آگرے اور دہلی کا شاعرانہ تعلق انہیں ارباب فضل و کمال کی ذات گرامی سے پیدا ہوا اور مرزا غالبؔ اکبرآبادی ثم الدہلوی کے عہد پر کچھ عرصے کے لیے ختم ہو گیا،

آگرے میں مرزا غالبؔ کے کئی شاگرد تھے، جن سے مرزا کا سلسلۂ اصلاح و مکاتبت تمام عمر جاری رہا، منشی ہرگوپال تفتہؔ اکبرآبادی رائے بہادر شیو نرائن آرامؔ اکبرآبادی (سکرٹری میونسپل بورڈ متوفی ۱۸۹۸ء) مرزا تفضل حسین خاں تفضلؔ اکبرآبادی (جو آگرے میں کتب داری

[1] ان کا مولد قصبہ جاجمؤ ضلع آگرہ ہے اس لیے انہیں بھی اکبرآبادی ہی کہنا چاہیے (مخزن نکات)

کرتے تھے پھر ریاست الور میں ملازم ہو گئے تھے) مولوی سید مددعلی تپش اکبرآبادی، شیخ عبدالمجید رسوا اکبرآبادی، بابو ہرگوبند سہائے نشاط اکبرآبادی یہ سب مرزا غالب کے عزیز شاگرد تھے ان میں سے اکثر دہلی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے ہیں۔

مرزا غالب، دہلوی بن جانے کے بعد بھی اپنے مولد و وطن آگرے کو نہیں بھولے، وہ اکثر دہلی سے آگرے آتے رہتے تھے خصوصاً جب کوئی نئی غزل کہتے تو جب تک منشی نبی بخش حقیر اکبرآبادی خلف منشی حسین بخش اکبرآبادی کو آگرے آکر نہ سنا دیتے اُنہیں چین نہیں آتا تھا۔

منشی نبی بخش حقیر اکبرآبادی کی سخن فہمی کے متعلق مرزا غالب خود فرماتے ہیں :-

اس فرزانہ یگانہ (یعنی نبی بخش حقیر) کو کس درجہ سخن فہمی و سخن سنجی عنایت ہوئی ہے، حالانکہ میں شعر کہتا ہوں، اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر میں نے جبتک اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں جانا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ (اردوئے معلّٰی)

مرزا غالب کا اکثر آگرے آنا اُن کے شاگردوں کا دہلی جانا، اور سلسلۂ مکاتبت و اصلاح برسوں جاری رہنا بھی دہلی اور آگرے کے تعلق شاعرانہ پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کا آخری دور برطانوی حکومت کی تاسیس و تشکیل کا ابتدائی زمانہ تھا، جب حکومت کو مرکزیت حاصل نہو تو ادب و شعر کی مرکزیت کہاں قائم رہ سکتی ہے؟ مغل سلطنت کے زوال سے جو عظیم سیلاب بے سکونی اٹھا وہ اپنے ساتھ ادبی رجحانات کو بھی بہالے گیا، مرزا غالب کی موت دراصل آگرے اور دہلی کے رابطۂ شاعرانہ کی موت تھی، جہاں تک میرا مطالعہ ہے ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۹ء تک دہلی اور آگرے کا شاعرانہ تعلق تاریخ کے کسی صفحہ سے ثابت نہیں ہوتا۔

اس تمام زمانے میں آگرے اور دہلی کی بساط سخن شعرا سے معمور تھی، مگر ان میں پہلے سے ربط و اتحاد کا فقدان تھا، آگرہ میں ۲۹، ۳۰ سال تک شاعرانہ طوائف الملوکی رہی، شعر سے ذوق رکھنے والے آگرے ہی کے کسی دیرینہ مشق شاعر کو اپنی غزلیں دکھاتے رہے مگر میرو میرزا نے آگرے سے لکھنؤ اور دہلی پہونچ کر آگرے کا جو نام پیدا کیا تھا اسے باقی رکھنے کی کسی نے کوشش نہ کی

مگر فطرت کو آگرے اور دہلی کا یہ قطع تعلق منظور نہ تھا، آخر ان دونوں مراکز ادب کے شاعرانہ تعلق کی تجدید ۱۸۹۹ء میں راقم السطور نے کی یعنی میں نے فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے رشتہ تلمذ پیدا کرکے آگرے اور دہلی میں پھر ایک شاعرانہ تعلق قائم کر دیا، خدا کا شکر ہے کہ آج "آگرہ اسکول"، "دہلی اسکول" ہی کی طرح ایک علیحدہ[1] ادارۂ فکریہ تسلیم کیا جاتا ہے جو محاورات اور مصطلحات اردو میں مرزا داغ دہلوی کے مذہب کا تابع ہے۔

سیماب (اکبرآبادی)

---

[1] جب "آگرہ اسکول" دہلی اسکول کا متبع ہے تو پھر اس کا علیحدہ ادارۂ فکریہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ (اڈیٹر)

وہ مشہور شعراء جو اودھ یا لکھنؤ میں پیدا ہوئے

یا اُن کا نشو و نما یہاں ہوا

میر شیر علی افسوس
ان کے والد نواب شجاع الدولہ کی سرکار سے متوسل تھے اس لیے ان کا نشو و نما یہیں ہوا۔ بعد کو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو کر کلکتہ چلے گئے۔

میرزا جعفر علی حسرت
سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد، ان کے والد ابوالخیر کی اکبری دروازہ میں عطاری کی دکان تھی، سنہ ۱۲۱۷ھ میں انتقال ہوا، انھوں نے شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کا پورا زمانہ اور نواب سعادت علیخاں کا تھوڑا زمانہ دیکھا ہے

شیخ قلندر بخش جرأت
فیض آباد میں نشو و نما ہوا، جعفر علی حسرت سے مشق سخن کی، اول اول محبت خاں کی سرکار میں ملازم ہوئے اور پھر مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں انشا کا ان کا ساتھ رہا ہے سنہ ۱۲۲۵ھ میں انتقال ہوا۔

غلام علی راسخ
وطن فیض آباد تھا لیکن نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، سنہ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۳۸ھ میں بعہد غازی الدین حیدر انتقال کیا۔

میر تقی ہوس
فیض آباد کے رہنے والے تھے لیکن نشو و نما لکھنؤ میں ہوا۔ مصحفی کے شاگرد تھے اس لیے ان کا زمانہ سنہ ۱۲۰۰ھ اور سنہ ۱۲۴۰ھ کے درمیان رہا ہوگا، تذکروں میں کہیں ان کا ذکر نہیں پایا جاتا، بڑے بے مثل شاعر تھے

شیخ امام بخش ناسخ
(ولادت سنہ ۱۲۰۴ھ) فیض آباد میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما ہوا، نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں لکھنؤ گئے جب مصحفی اور انشا کا دور دورہ تھا، محمد علی شاہ کے زمانے میں انتقال ہوا سنہ ۱۲۵۴ھ)

کرامت علی شہیدی ولادت بانس بریلی میں ہوئی، نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، پہلے مصحفی کے شاگرد ہوئے اور پھر شاہ نصیر کے، غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا

خواجہ حیدر علی آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ آکر مصحفی کے شاگرد ہوئے، نواب سعادت علی خاں کا زمانہ تھا، محمد علی شاہ کے زمانے میں انتقال ہوا۔ (۱۲۶۳ھ)

خواجہ وزیر لکھنوی گوشہ نشین شخص تھے، غالباً نصیر الدین حیدر کے زمانے میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۰ھ میں انتقال کیا، واجد علی شاہ نے طلب کیا لیکن نہیں گئے، ناسخ کے شاگرد تھے۔

مرزا محمد رضا برق مرزا کاظم علی خاں (مصاحب واجد علی شاہ) کے بیٹے تھے، ناسخ کے شاگرد تھے، واجد علی شاہ کیساتھ ٹیا برج گئے اور ۱۲۸۳ھ میں وہیں انتقال کیا۔

میر اوسط علی رشک فیض آباد میں پیدا ہوئے، نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، ناسخ کے شاگرد تھے، نصیر الدین حیدر اور محمد علی شاہ کا زمانہ دیکھا، ۱۲۸۴ھ میں کربلائے معلی میں انتقال ہوا۔

امداد علی بحر لکھنوی پیدائش ۱۲۲۵ھ بعہد نواب سعادت علی خاں انتقال ۱۳۰۰ھ

مظفر علیخاں اسیر نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ملازم ہوئے اور واجد علی شاہ کا بھی زمانہ دیکھا، پھر رام پور چلے گئے ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا۔

ضامن علی جلال ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کا زمانہ دیکھا، غدر کے بعد رام پور چلے گئے نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد پھر لکھنؤ آگئے اور ۱۳۲۵ھ میں انتقال کیا،

امیر اللہ تسلیم پیدائش فیض آباد، نشو و نما لکھنؤ، شاگرد نسیم، محمد علی شاہ، واجد علی شاہ کا زمانہ دیکھا۔ غدر کے بعد رامپور گئے لیکن چلے آئے، نواب کلب علی خاں کے دور میں پھر گئے اور نواب حامد علی خاں کے زمانے میں انتقال کیا (۱۳۲۹ھ)

مرزا سلامت علی دبیر پیدائش دہلی (۱۲۱۸ھ) ۶، ۷ سال کی عمر میں لکھنؤ آئے (عہد واجد علی شاہ میں) ۱۲۹۲ھ میں انتقال کیا،

میر ببر علی انیس فیض آباد میں پیدا ہوئے (۱۲۲۰ھ) لکھنؤ میں نشو و نما ہوا اور یہیں انتقال کیا

آغا حجو شرف واجد علی شاہ کے سمدھی تھے اور انھیں کے ساتھ ٹیا برج چلے گئے تھے ۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا

مہربان خاں رند پیدائش فیض آباد (۱۲۱۲ھ) ۱۲۲۴ھ میں لکھنؤ آئے اور آتش کے شاگرد ہوئے

وزیر علی صبا لکھنوی ۱۲۷۱ھ میں انتقال ہوا، اسی سال واجد علی شاہ معزول کیے گئے۔

لکھنؤ اور دلّی اسکول کے ریختی کہنے والے شاعر

ریختی کا رواج کب سے شروع ہوا یا ریختی کب ایجاد ہوئی، اس باب میں ہماری تحقیق یہ ہے کہ سب سے پہلی ریختی سید شاہ ہاشم کے مرید، سید میراں ہاشمیؔ نے لکھی۔ حضرت ہاشمیؔ بیجاپور کے رہنے والے اور علی عادل شاہ بادشاہ بیجاپور کے درباری شاعر تھے جنکی مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور رہی۔ ہاشمی نے ۱۶۹۷ء میں انتقال کیا۔ ان کی ریختی کا یہ نمونہ ہے :-

او جسدن گول کنڈی میں گئی ہو یاد ہیں باتاں ... ہمیں تم مل کے بیٹھے تھے سکھی جسدن دلاسے میں

مجھے پکڑے ہیں کی چھوڑ دادو دیکھو ہانک مارونگی ... خدا کی سوں میں کہتی ہوں بڑی بو کو پکارونگی

سجن آویں تو پر دے سے نکل کر بہار بیٹھوں گی ... بہانا کر کے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی

رضا گر مجھ کو دیتے ہو کروں گی گھر میں جا دارو ... اگر مجھ ہووے گی فرصت صبح پھر آؤنگی چھوڑ دو

اگر کوئی آکے دیکھے گا تو دل میں کیا کہے گا جی ... مجھے بدنام کرتے ہو کہیں اٹھ جاؤنگی چھوڑ دو

دوسرے ریختی گو دکن کے سید محمد قادری خاکیؔ تھے جو ولیؔ کے معاصر اور دکن کے مشاہیر پیران طریقت سے تھے، آپ کا دیوان ۱۱۸۲ھ کا لکھا ہوا بعض کتب خانوں میں محفوظ ہے آپ بھی ہاشمی کی طرح تصوف آمیز ریختی کہا کرتے تھے مثلاً :-

کرو پیو پیر سیں ظاہر یو سب مل سات سکیاں ... جنم سب بجر میں غم کے تیرے بن نت یو کھوتی ہوں

یو جاری عین ممکن ہو ملی جب دیکھ بالا سوں ... ہمی سوں برہ کی تب میں نکل پیو سات سوتی ہوں

رہوں میں کب تلک جھرتی جلا کر دل کیتیں کرتی ... کہ اب غم کے پہاڑوں پر ہیلا ہے سر ٹرڑتی ہوں

مدد سوں شاہزادہ کی ترقی پا کے لے خاکیؔ ... کبھی وحدت کے دریا میں پیراہیں پن ڈبوتی ہوں

انہی کے ساتھ اور ایک دکنی شاعر رحیمؔ کے بھی چند شعر ملتے ہیں :-

اری ناداں تیں اپنے سجن کو کیوں روٹھایا ہے ... روٹھا کر پیو کو جگ میں کسی نے ذوق پایا ہے

بہت پچھتائیگی میری نصیحت مان کہتی ہوں ... سکھی کو رات سوہی ہے پیارے کو جو بھایا ہے

تیرے سوں ہوئیگا تجھ مہرباں اور پرنہ روٹھے گا
روٹھائے کو منائے بن تجھے کیسے سلایا ہے

یہ ریختی گو ۱۱۰۹ھ سے لیکر ۱۱۵۵ھ تک گزرے ہیں اور غالباً یہ ریختی کا پہلا دور ہے، کیونکہ اس زمانہ میں سوائے دکن کے اور کسی جگہ اس کا وجود نہیں پایا جاتا تھا۔ ۱۲۱۵ھ کے بعد نواب بدرالدین خاں بہادر امیر جنگ امیر ولد ولہ لائق نے ریختی کہی ہے جو نواب سکندر جاہ بہادر کے دارو غہ جواہر خانہ تھے۔

پاس میرے تو کسی ڈھب سے اسے لاری ددا
میں بلائیں تیری لیتی ہوں اری جاری ددا

اس موے ماٹھی ملے پر تو دو ہتّڑ ماروں
یا کوئی اور بھی تدبیر تو بتلاری ددا

کیا کہا کس نے کہا تیرے سے لائق شب کو
تجھ کو لوہو کی قسم کہدے نہ ترماری ددا

ان کے بعد محمد صدیق قیس کا دور آتا ہے جس نے مستقل طور پر ریختی کا دیوان مرتب کیا۔

قیس حیدر آباد کے مشہور شاعر اور رشید محمد خاں ایمان کے بھانجے تھے اور مہاراجہ چندو لعل اور شمس الامرا امیر کبیر کے مصاحب۔ ۱۲۳۰ھ میں آپ نے انتقال کیا اور چونکہ یہی زمانہ سعادت یار خاں رنگین کا ہے اس لئے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ قیس نے رنگین کے دیوان کا جواب کہا ہے یا رنگین کی ریختیوں کو دیکھ کر خود ریختی کہی ہے مگر یہ قرینِ قیاس نہیں ہے کیونکہ رنگین کی ریختی کا دیوان جو انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۲۴۹ھ ہے اور قیس نے ۱۲۳۰ھ میں انتقال کیا ہے اس طرح قیس کا انتقال رنگین کے دیوان ریختی کی ترتیب سے انیس سال قبل ہوچکا تھا ظاہر ہے کہ مرنے سے دس بارہ سال پہلے ہی سے قیس نے ریختی کہی ہوگی اس طرح رنگین کے کلام کا قیس کے پیشِ نظر رہنا تقریباً ناممکن ہے۔

قیس نے اپنے دیوان ریختی پر یہ عبارت لکھی ہے:-

"منتخب دیوان ریختی قیس محاورِ بیگمات شوخ محل بادشاہی شاہجہاں آباد"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیس نے بیگمات دہلی کی زبان سے متاثر ہوکر انھیں کی زبان میں شعر کہے ہیں اور اس لئے ان کا شمار دہلی اسکول کے ریختی گو شعرا میں ہونا چاہئے۔

قیس نے عموماً انھیں ردیفوں میں غزلیں کہی ہیں جو رنگین کی ریختیوں کی ہیں نمونہ کے طور پر قیس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

تونے چڑیا وہ بنائی ہے کہ بس بول اُٹھے !
تیرے ہاتھوں کے میں قربان گئی مُغلانی!

ٹھیک ہیں مونڈھے تو اس کرتی کے لیکن اتنا
تنگ ہوتا ہے گلے میں سے گریبان ددا!

چنپا لگا تھا جس کے گریبان کے اوپر
کرتی وہ مری کیا ہوئی بتائی جمیلا!

لاڈ بازار کو جاتی ہے تو صدقے تیرے
بھول مت یاد سے لے آ میری ڈوری انا!

جس کی چڑیا کا وہ عالم تھا کہ اب اُڑ جائے | میں نے باجی سے جو کل شرط میں ہاری انگیا
کیا بنالائی ہے منہیارن ممانی چوڑیاں | میں نہ پہنوں گی کبھی یہ آسمانی چوڑیاں
ابکے رکھی ہوں دوگانا وہ طرحدار اصیل | نوجواں تپلی سی گوری سی دھواں دھار اصیل

قیس کے معاصرین میں اور کوئی ریختی کا شاعر دکن میں نہیں ملتا، البتہ ۱۲۹۰ھ کے ایک ریختی گو شاعر رائے گلاب چند ہمدم کا کلام مولوی سردار علی صاحب نے ہمیں مرحمت فرمایا ہے مگر ہمدم چونکہ رنگین اور انشاؔر کے بعد کے ہیں اس لئے ان کا ذکر رنگین اور انشار کے بعد ہی کیا جانا مناسب ہے۔

انشاءاللہ خاں جو ریختہ کے مشہور شاعر ہیں ریختی کے بھی بڑے اچھے شاعر تھے مرشد آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں علوم متعارفہ کی تکمیل کی اور دلی جاکر شاہ عالم کے دربار میں منسلک ہوگئے مگر چند ہی روز کے بعد دلی سے جی بھر گیا تو لکھنؤ پہونچے اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے تعلق پیدا کرلیا اس کے بعد نواب سعادت علی خاں کے مصاحب ہوگئے ۱۲۲۵ھ میں نواب سے روٹھ کر خانہ نشین ہوگئے اور نہایت ہی پریشان حالی اور تکلیف سے زندگی بسر کرکے ۱۲۳۳ھ میں انتقال کیا۔ رنگیں کی تتبع میں ریختی بھی کہنی شروع کی اور ایک دیوان مرتب کرلیا چونکہ انشاؔر نے دلی میں زیادہ دن گزارے تھے اور ان کے ریختہ کے کلام میں دہلی اسکول کا رنگ ہے اس لئے ان کا ریختی کلام بھی دہلی ہی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے چند شعر دیوان سے نقل کئے جاتے ہیں۔

ہاتھوں سے تیرے میں تو کمبخت عاجز آئی | جو کام ہو نگوڑا تیرا سو ہلبلی کا
بندی کی دشمنی میں ناحق جو ہوں الٰہی ! | لگجائے ان کے مُنھ پر از غیب کا تھپیڑا
چوٹی یہ تیری سانپ کی ہے لہر دوگانا! | کھاتی ہوں تیرے واسطے میں زہر دوگانا!
تھام تھام اپنے کو رکھتی ہوں بہت سا لیکن | کیا کہوں تھم نہیں سکتا مرا اندر والا
پوتوں پھلنا تجھے اور دودھوں نہانا ہو نصیب | بیاہ ہو سونے کے سہرے سے تیری عمر دراز!
اری بی ایک ہی عیار ہو تم ! | ناک چوٹی میں گرفتار ہو تم !
کچھ نہیں معلوم پوچھو کونسا میلا ہے آج | جاتیاں ہیں جو کھچا کھچ ڈولیوں پر ڈولیاں
میں تیرے صدقے نہ رکھ لے میری پیاری روزہ | بندی رکھ لیگی تیرے بدلے ہزاری روزہ
جو ہم کو چاہے اس کا خدا نت بھلا کرے | دودھوں نہائے اور وہ پوتوں پھلا کرے
رات بھر اپنا ترستا ہی رہا جی باجی ! | اب تو نوبت بھی اُٹھو اجی باجی ! باجی !!

میں پھاند کے کل رات جو دیوار نہ جاتی - کنڈی نہ ہلاتی - جا کر نہ جگاتی

نیند اس کو نہ آتی - جوبن کی وہ ماتی - تیوری نہ ہلاتی

اور چٹکیوں میں میرے تئیں صبح اڑاتی - ہاتھوں پہ نچاتی - گاتی نہ بجاتی

کھانے کو نہ کھاتی - پھر تو نہ بلاتی سو سوہلے گاتی

سعادت یار خاں رنگین مرزا طہماسپ بیگ خاں تورانی کے بیٹے تھے سرہند میں پیدا ہوئے دلی میں نشونما پائی سپاہیانہ فنون کے ماہر تھے تمام عمر شہزادوں کی مصاحبت میں بسر ہوئی ۱۲۵۱ھ میں اسی برس جی کر وفات پائی خود اپنے دیوان ریختی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ عرسوں اور خانگیوں کی تماش بینی کی وجہ سے ریختی گوئی کا شوق ہوا ایک پورا دیوان ریختی کا موجود ہے اس کے علاوہ چونتیس جلدیں ان کی مختلف تصانیف کی انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں چونکہ دلی میں پرورش ہوئی تھی اور زبان پر دلی کے محاورات چڑھے ہوئے تھے اس لئے ریختی میں بھی دلی ہی کی بیگماتی زبان استعمال کی ہے اس طرح یہ بھی دلی اسکول ہی کے ریختی گو شاعر ہیں نمونہ کے طور پر چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

چلو چلکر قطب صاحب میں جھولے ڈالکر جھولیں دوگانا مینھ برستا ہے مہینہ ہے یہ ساون کا !

کل جو مغلانی نے سی دے کے مروڑی انگیا ہو گئی تنگ پچھاون سے نگوڑی انگیا

کوئی پیس کر خوب سی لال مرچیں ترے دونوں دیدوں میں بھر جائے آتوں

نہنے سے کلیجہ کو کیا اس کے ہوا لوگو ؟ کچھ ان دنوں رہتی ہے دلگیر مری چھوچھو !

رائے گلاب چند ہمدم امیر کبیر شمس الامرا بہادر کے متوسل تھے ۱۲۸۰ھ میں ان کی ریختیاں نواب شمس الامرا بہادر کے مطبع میں شائع ہوئی ہیں حالات معلوم نہ ہو سکے مگر کلام سے پتہ چلتا ہے کہ کہنہ مشق شاعر تھے اور دلی اسکول کا تتبع کرتے تھے نمونتاً چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

اے دوا چھوڑ گیا کب سے وہ لشکر والا چاہتا ہووے گا کیا کیا میرا اندر والا !

کیا یونہیں اپنی جوانی وہ کرے ہے برباد جس کا پردیس چلا جائے کوئی گھر والا !

چھپ چھپا کے تو کسی ڈھب سے بلا لے گھر میں تیکھا بانکا سا کھڑا ہے جو وہ خنجر والا !

جس کی چمک کے آگے مہ و مہر ماند ہوں ایسی کوئی منگا دو جھلا جھل کی اوڑھنی

بجلی سی اک چمک گئی اے ہمدم ابر سے خلوت میں رات ان کی یہ کچھ جھلکی اوڑھنی

سید امام علی بلگرامی انشاء کے ہمعصر ایک اور بزرگ تھے یہ بھی ریختی اور ہزل کہا کرتے تھے صاحقراں تخلص تھا۔ آخر عمر میں

لکھنؤ جاکر آصف الدولہ کے ملازم ہو گئے تھے۔

اب تک ہم نے جن ریختی گو شعرا کا کلام پیش کیا ہے وہ دلی اسکول کے تھے، صاحبقراں پہلے ریختی گو شاعر ہیں جو لکھنؤ اسکول سے متعلق ہیں قصبۂ بلگرام کی زبان پر لکھنؤ ہی کا اثر ہے پھر آصف الدولہ کی ملازمت اور لکھنؤ کے قیام نے صاحبقراں کی زبان کو لکھنؤ کے رنگ میں رنگ دیا تھا اس طرح دلی اسکول کا پہلا ریختی گو شاعر دکنی زبان کے ریختی کہنے والوں کو چھوڑ کر قیس حیدرآبادی ہے اور لکھنؤ اسکول کا پہلا ریختی گو صاحبقراں چند شعر نمونۃً نقل کئے جاتے ہیں:-

کانوں کی اپنے بالی او میری بھولی بھالی ! ہاتھوں سے کیوں چھپالی او میری بھولی بھالی !
باریک سا ڈوپٹہ لازم ہے گرمیوں میں ، اوڑھا کرنہالی او میری بھولی بھالی !
جو دیکھتا ہے سر کو پتھر پہ مارتا ہے ہونٹوں کی تیری لالی او میری بھولی بھالی !

اس دور میں دو ایک ریختی گو دلی اسکول کے بھی نظر آتے ہیں جن میں سے مرزا علی بیگ نازنین زیادہ مشہور ہیں یہ لکھنؤ اسکول کے سب سے بڑے ریختی گو جان صاحب کے معاصر تھے، ناسخ کا خیال ہے کہ جان صاحب سے اچھی ریختی کہتے تھے۔ ذوق سے تلمذ تھا ۱۲۷۱ھ میں زندہ تھے دیوان نہیں ملتا مگر چند متفرق شعر ملتے ہیں جن میں سے چند نقل کئے جاتے ہیں ذوق کی وفات پر ریختی میں ایک قطعہ کہا ہے جو اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے۔

نہیں نازنیں رنج کرتی کسی کا گیا جب سے یار اور حرمت ہے کھوئی
بلا سے رکھوں شاد دل کو تو اپنے اگر میں نے کنبے کی عزت ڈبوئی
خصم جب موا لونڈیوں کو رولایا کہ اس پردے میں نام رکھے نہ کوئی
ولیکن مجھے کاملوں سے ہے اُلفت غمِ ذوق میں رات بھر میں نہ سوئی
لکھی اس کی تاریخ اور یہ ہوا غم میاں ذوق کو میں بوا آپ روئی

نازنیں اتنا بھی ہرجائی پنا ؟ یہ تمھارے آگیا کیا دھیان میں !

سونا کبھی شوہر کو میسر نہیں ہوتا ! عورت ! انھیں باتوں سے تیرا گھر نہیں ہوتا !
کیا جانئے کیا کسبیوں میں شہد گھلا ہے گھر والیوں سے خوش کوئی شوہر نہیں ہوتا

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جواں تاکا بُوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا

ہمسائی آئی تھی میرے گھر میں بنی ٹھنی ان کو تو دیکھو رات اسی پر پھسل پڑے

قدسی کی غزل پر سیکڑوں شعرا نے خمسہ کہا ہے مگر باوجود ریختی میں مصرع لگانے کے نازنین نے اس مزے سے مصرع

ہم پہونچائے ہیں کہ جواب نہیں :۔

لونڈی سو جان سے قربان گئی تجھ پہ نبی — ابھی محشر میں بجھا دیجو مری تشنہ لبی
تو ہے بندی کا وسیلہ درِ حاجت طلبی — مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل و جاں بادِ فدایت چہ عجب خوش لقبی

عورتیں جمع تھیں یک جا پہ سن اے شاہِ اُمم — وصف یوسف وہ لگیں کرنے زلیخا سے بہم
دیکھ تصویر تری بولی یہ بی بی مریم — منِ بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

درد عصیاں سے جو تھی نازنیں کو بیتابی — منھ پہ آنچل وہ ڈوپٹہ کا دھری روتی تھی
دیکھا اس دکھیا کا عالم تو اُسے کچھ نہ بنی — سیدی انت حبیبی وطبیبِ قلبی

آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

میر یار علی جان صاحب فرخ آباد میں پیدا ہوئے لکھنؤ میں پرورش پائی آخر عمر میں رام پور جا رہے، ۱۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۷ھ میں انتقال کیا نواب عاشور علیخاں سے تلمذ تھا۔ جان صاحب کو ریختی کا شاعر اعظم کہا جا سکتا ہے کیونکہ انھوں نے ریختی کو بڑی ترقی دی اور نہایت عمدہ ریختیاں کہیں چونکہ لکھنؤ میں پرورش پائی تھی اور عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گزرا اور قیام لکھنؤ ہی کے زمانہ میں ریختی کہنی شروع کی تھی اس لئے لکھنوی کے رنگ میں ڈوب گئے، نمونتاً چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :۔

پانچ باری جب میں روئی پانچ دریا بہ گئے — میری آنکھوں نے بوا پنجاب سے دعویٰ کیا
چوری ہوئی پتا نہیں ملتا ہے مال کا — گھر گھر گلا کروں کی اجی کو توال کا
ہمسائی میرے سر کی قسم آئیو ضرور — کونڈا کروں گی جمعہ کو سید جلال کا
پھبتی کہوں چراغ بئے کی ہے جھوبجھیں — محرم کی جب کٹوری میں جگنو نظر پڑا
بڑھائی کیوں زلیخا مولوی صاحب نے یوسف کو — کیا خانہ خراب اسکو دکھایا کوچہ اُلفت کا
کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت — سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا
خدا دکھائے نہ پیڑو کی آنچ کا صدمہ — یہ وہ جلاپا ہے ہرگز سہا نہیں جاتا
نہ کر رات کو کنگھی سر میں تو اپنے — زناخی! بہت دل پریشان ہو گا
ہو خیر دلھن دولھا کی ماتھا میرا ٹھنکا — اچھا نہیں بی ٹوٹنا سہرے کی لڑی کا

تیسرے دن نہیں جاتے ہیں کسی کے گھر سے　　اور رہ جاؤ بوا آج کا دن آج کی رات
ادھر آئی بوا اُدھر بھاگی،　　ہے جوانی بھی خواب کے مانند
میری ماما نے نکالی ہے نئی مجھ سے چھیڑ　　بھیجتی ہوں کہیں جاتی ہے یہ مردار کہیں

اس دور میں بہت سے ریختی گو گزرے ہیں مگر کسی نے جان صاحب کی طرح فقط ریختی کو اپنے لئے مخصوص نہیں کیا بلکہ ریختہ کے ساتھ ساتھ ایک آدھ غزل ریختی کی بھی کہہ لیا کرتے تھے اس لئے اس عہد میں سوائے نازنین، صاحبقراں اور جان صاحب کے کوئی دوسرا مستقل ریختی گو کہلانے کا مستحق نہیں۔

چونکہ زمانہ بہت کچھ بدل گیا تھا اور وہ عیش و تنعم جو ریختی گوئی کا سبب تھا باقی نہیں رہا تھا اور تہذیبی نقطۂ نگاہ سے بھی ریختی بُری سمجھی جانے لگی اس لئے بہت کم لوگوں نے اس طرف توجہ کی۔

نازنین پر دلی والوں کی ریختی گوئی کا خاتمہ ہوگیا، دلی اسکول میں ریختی نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی قیس، انشا، رنگین، ہمدم اور نازنین کے علاوہ بہت کم شاعر ریختی گو دلی اسکول میں نظر آتے ہیں۔ لیکن لکھنؤ میں ریختی گو زیادہ پیدا ہوئے۔

اختر پیا یعنے جانِ عالم کے زمانے میں آغا جو شرف اور گلشن الدولہ وغیرہ بہت سے ریختی گو پیدا ہوگئے تھے مگر افسوس ہے کہ ان کا کلام ہمیں نہیں ملا، عابد مرزا صاحب بیگم اسی اُجڑے دربار کی یادگار ہیں، ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے چونکہ انکے والد حسین مرزا اختر پیا کے محلات میں کتاب خوانی پر مامور تھے اس لئے انھیں اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے ۱۳۱۵ھ سے ریختی کہنی شروع کی جب مٹیا برج مٹی میں مل گیا تو بیگم بھی عظیم آباد چلے گئے وہاں سے بھوپال اور پھر حیدر آباد آئے اور یہیں رہ پڑے اعلیٰ حضرت غفراں مکاں نواب محبوب علی خاں بہادر نے بیگم کی ریختیوں کو بہت پسند فرمایا اور اپنی فیاضی سے سرفراز فرماتے رہے۔

ہز اکسلنسی سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر پیشکار و صدر اعظم باب حکومت نہایت اچھے ادیب اور شاعر ہونے کے علاوہ فیاض اور قدر دان امیر ہیں آپ نے بیگم کو اپنے یہاں رکھ لیا اور بیگم بھی اس طرح بیٹھ گئے کہ کسی اور کا نام تک نہ لیا اب تک سر مہاراجہ بہادر ہی کی محفلوں کی شمع بنے ہوئے ہیں لکھنؤ اسکول کے آخری ریختی گو ہیں چند شعر نمونتاً نقل کئے جاتے ہیں:۔

مردوے تلوار کا کس بل نہیں دم خم نہیں　　بل ہے تیوری پر تو ہو بندی کو اس کا غم نہیں
سوت بازی مجھسے لیجائے خدا کی شان ہے　　وہ ہے چھتیسی اگر میں بھی کچھ اس سے کم نہیں

کرتی تھی اِدھر کام اُدھر دیکھ رہی تھی　　اے چھوکری اسوقت ترا دھیان کدھر تھا
جان اگر ہے جانے والی جائے گی　　بات تو ان کی نہ ٹالی جائے گی
بھاگ جائے گی یہ جب ہوگی جواں　　چھوکری مجھ سے نہ پالی جائے گی

کہاں تھی رات کو چندو نہ اس گھر میں نہ اُس گھر میں　　ترا عاشق تجھے دونوں جگہ جا کر پکار آیا
چمن سے دور ہوں بے بس ہوں کیا میں کیا زباں میری　　کلیجہ تھام لو بی ! پھر سنو تم داستاں میری
گرے بجلی الٰہی ایسے سادے کار پر اے بی　　کھٹائی میں سوے سنے ڈال رکھیں بالیاں میری

موجودہ زمانے کے اور ایک ریختی گو نثار حسین خاں صاحب شیدا الٰہ آبادی ہیں آپ ارادت خاں واضح مصنف پنجر قصہ دینا بازار کے پروتے اور حسن عسکری خاں عسکری مصنف کرشمہ سخن کے فرزند ہیں ۱۲۸۵ھ میں دریاباد میں پیدا ہوئے امین الدین قیصر کے جو بیک واسطہ خواجہ آتش کے شاگرد تھے یہ بھی شاگرد ہو گئے چونکہ اُستاد لکھنؤ اسکول کے تھے اور خود بھی لکھنوی ماحول میں پرورش پائی تھی اس لئے لکھنؤ اسکول کے ریختی گو ہو کر رہ گئے۔ اپنا ایک ریختی دیوان ۱۹۳۲ء تک کے کلام کا، "مجموعہ آرسی" کے نام سے شائع کیا ہے جس میں غزل کے علاوہ قصیدے اور سلام بھی ہیں، زبان میں بیگم جیسا چونچلا نہیں مگر پھر بھی شعر اچھے کہتے ہیں اور آپ کی ریختیوں میں جدید رنگ جھلکتا ہے نمونتاً چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

آؤ آؤ گھر تمہارا ہے مگر یہ جان لو　　مردوا میری طرف سے بدگماں ہو جائیگا
بال بال اپنا خدا کے سامنے ہوگا گواہ　　روئیاں روئیاں جسم کا بیٹی زباں ہو جائیگا
ریل سے بھاگی میاں کو اور بی بی چھٹ گئیں　　پہونچا ابرا لکھنؤ دلی میں استر رہ گیا
الٰہی خون تھوکے سوت کو ہو عارضہ سِل کا　　اُٹھا کر لے گئی جھاڑو پھری بٹہ مری سِل کا

بیگم اور شیدا دونوں لکھنؤ اسکول کے ریختی گو شعرا ہیں ان کے علاوہ چند اور شاعر بھی لکھنؤ اسکول کے ایسے ملتے ہیں جو کبھی کبھی ریختی کہہ لیتے ہیں چنانچہ منجملہ ان کے ایک عنقا بیگم بھی ہیں جن کا نام محسن خاں ہے، خان پور اسٹیٹ ریاست بھاولپور پنجاب کے متوطن ہیں اور اب لکھنؤ میں رہتے ہیں ایک دیوان ریختی کا چھپوا چکے ہیں جس میں اپنے آپ کو جان صاحب سے بڑھا ہوا ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے مگر جان صاحب تو بڑی چیز ہیں ان کی ریختیاں بیگم اور شیدا کے کلام کے ٹکر کی بھی نہیں چونکہ پنجاب کے رہنے والے ہیں اور ریلوے کی ملازمت کی وجہ سے مختلف دیہات اور غیر فصیح مقامات پر رہنے کا اتفاق ہوا ہے اس لئے ....

.... بعض دفعہ تو بالکل گنواروں کی سی بولی بول جاتے ہیں چند شعر نمونتاً نقل کئے جاتے ہیں :-

عجیب جلا میں پھنسی ہوں گوئیاں میں اس نگوڑے سے دل لگا کر　　یہ دونوں پھوٹیں جو رات سوئی ہوں میں پلک سے پلک لگا کر
بلا کی شوخی زبان میں ہو ستم کا جادو بیان میں ہے　　وہ موہنی آن بان میں ہو کر مار ڈالا لبھا لبھا کر
کھلے ہیں ایام حیدری کے پڑی ہو گھر میں وہ شیخ جی کے　　جلائینگے ہم چراغ گھی کے ضرور مسجد میں آج جا کر

بُرا یہ بیگم ہو لکھنؤ کی بڑی ہے دھوم اس کی گفتگو کی　ذرا جو آنکھ اس سے دو بدو کی تو اس نے مارا جلا جلا کر

شبِ ہجر شعلۂ نار ہے مرا جی جلا رہا دلِ زار ہے　بوا صبر ہے نہ قرار ہے ہوا درد کم تو بخار ہے

مجھے کیا چمن کی بہار سے مجھے کیا گلوں کے نکھار سے　مجھے کیا کسی کے سنگار سے نہیں بر میں اپنا جو یار ہے

متذکرہ بالا ریختی گو شعرا کے کلام اور حالات سے ایک سطحی اندازہ ہو جائے گا کہ ریختی نے تدریجی طور پر کیا ترقی کی ۱۱۰۹ھ سے ۱۱۵۵ھ تک ایسے شعرا نظر آتے ہیں جنھوں نے زنانی بولی کو نظم ضرور کیا مگر یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ریختہ سے ہٹ کر کسی علحدہ صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے یا ہندی شاعری کی تتبع میں عورت کی زبان سے اظہار جذبات کیا ہے بہر حال یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اُردو یا دکنی زبان میں عورتوں کے جذبات کو نظم کرنے کی کوشش ہاشمی، خاکی، اشرف اور رحیم نے کی البتہ ۱۲۰۰ھ کے اوائل میں نواب بدر الدین خاں بہادر امیر الدولہ لائق نے بیگماتی زبان میں ریختی کہنی شروع کی ان کی زبان پر دلی کی بیگماتی اُردو کا خاصہ اثر تھا ان کے بعد محمد صدیق قیس نے اپنا ریختی کا دیوان مکمل کیا جو بیگماتی زبان کا خاصہ ذخیرہ مہیا کرتا ہے ان کی زبان نہایت صاف اور شیریں ہے ان کے بعد رنگین اور انشا نے ریختیاں کہیں جو اس عہد کی زبان کی جیتی جاگتی تصویر ہے تاہم ان ریختیوں میں گیا ہے اس کو مرزا قادر بخش صابر نے تذکرہ گلستان سخن میں اس طرح بیان کیا ہے:-

"صرف عورتوں کی گفتگو اور ان معاملوں کے سوا کہ مرتبہ شناسان سخن کے نزدیک فضول اور نازک دماغوں کے آگے نامعقول ہیں اور کچھ نہیں اور نامعقولیت سے مراد یہ ہے کہ کلام فحش آمیز یا کلمات شہوت انگیز سے زبان قلم کو آلودہ کیا ہے یہ تو اس نظم کے گوش و گردن کا پیرایہ ہے بلکہ اس طرز کا خمیر مایہ ہے مراد اس سے یہ ہے کہ وہ باتیں جو عورتوں کو اثنائے خانہ داری میں پیش آتی رہتی ہیں مثلاً کسی بہن بہیلی کے گھر مہمان جانا یا کسی بھائی بند کا اپنے گھر بلانا خصم سے تو م چھلے کے گھڑوانے کی تمنا اور کُرتی انگیا رنگوانے کا تقاضا اس طرح سے خرچ کیے ہیں کہ ان سے کچھ لطف یا نکتہ کہ شاعر خوش مذاق کو لذت دے حاصل نہیں ہوتا۔"

یہ مختصر تعریف ہے ریختی کی جو ہمارے تذکرہ نویسوں نے کی ہے مگر ایک حد تک اس کی صحت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا، قیس سے لیکر صاحبقران تک سب اسی رنگ میں ہوئے ہیں نازنین نے البتہ ایک قدم ان سب سے آگے بڑھایا اور ذوق کی وفات پر ریختی میں قطعہ کہنے کے علاوہ قدسی کی نعتیہ غزل پر نعتیہ مصرع پہونچائے ان کے بعد جان صاحب نے تو ریختی کی کایا ہی پلٹ دی بقول مرزا صابر کے فحش آمیز شہوت انگیز نظم کے علاوہ بہن بہیلی کو گھر بلانے کُرتی انگیا رنگوانے کے مضامین بھی باندھے مگر ان کے ساتھ ہی ساتھ سنجیدہ اور روزمرہ کے مضامین بھی نظم کئے ہیں چنانچہ نمونہ کے لئے چند شعر اس قسم کے نقل کئے جاتے ہیں:-

چوری ہوئی پتہ نہیں ملتا ہے مال کا　گھر گھر گلا کروں گی بوا کوتوال کا

یہ سات پیڑھیوں کے ہوا بعد اتفاق — کنبے میں بیگیا کے دو ہا جو نظر پڑا

اُجڑا ہوا آبادی کا جب گھر نظر آیا — رونے لگی میں دیکھ کے جی میرا ابھر آیا

گرگٹ کی طرح کالا کبھی لال ہو گیا — غصہ سے مردوے کا عجب حال ہو گیا

کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت — سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا

یہ دل مسوس کے چپ بھی نہیں رہا جاتا — گلا جو کرتی ہوں چاہت کا ہے مزا جاتا

اور کیا بھبتی کہوں بن آئے ہو لنگور سے — داڑھی منڈواؤ میں باز آئی خدا کے نور سے

دیوان جان صاحب کے مطالعہ کرنے والوں کو اس طرح کے سیکڑوں شعر ملیں گے جانؔ کے بعد بیگم نے ریختی کو اور ترقی دی اور ریختی میں بڑی گنجایش پیدا کر دی چنانچہ اخلاقی اور نعتیہ مضامین بھی باندھے ہیں پہلے پہل جب بیگمؔ حیدر آباد آئے اسوقت حیدر آباد میں لکھنؤ اور دلی دونوں اسکول کے شعرا بکثرت تھے اور لکھنؤ کی زبان اور دلی کی زبان پر خاصے جھگڑے ہو رہے تھے لکھنوی ہونے کی حیثیت سے بیگم کو بھی طیش آگیا اور انھوں نے بھی ایک طویل ریختی کہدی جس کے بعض اشعار یہ ہیں :-

کیا خالق نے پیدا ایک پر ایک — سنا میں نے یہ آتوں کی زباں سے

زباں کے خلد کی ہے حور عورت — اگر ہو لکھنؤ کے بوستاں سے

زباں کے ملک کا سکہ ہے عورت — انوکھا ہے چلن سارے جہاں سے

زباں کا فیصلہ ہے عورتوں پر — یہ باتیں مردوے لائیں کہاں سے

زباں دانی ہے حصہ بیگموں کا — نڑا لے کیا زباں کوئی زباں سے

نگوڑی سوت جل ککڑی کے ہاتھوں — بتنگ آئی بہت اب میں یہاں سے

یہ بیکاری بنی ہے سوت میری — نکلتی بھی نہیں میرے مکاں سے

وطن چھوڑا اسی شغل سے کے چلتے — دکن میں آئی ہیں ہندوستاں سے

چھوڑایا مجھ کو پیاروں سے اسی نے — چھپا کے منھ چلی آئی وہاں سے

موی کو لاگ مجھ سے ہو گئی ہے — یہاں بھی آن لپٹی میری جاں سے

سند اس نے مجھے دی مفلسی کی — نتیجہ خوب نکلا امتحاں سے

غرض ہونا ہے جو ہو جائے مجھ پر — میں کچھ کہتی نہیں اپنی زباں سے

سید تمکین کاظمی

لکھنؤ کی شاعری

شاعر ہمیشہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، گرد و پیش کے حالات، اس کے زمانے کے تمام اثرات و رجحانات، اسوقت کا تمدن و معاشرت یہ سب چیزیں شاعر پر اثر انداز ہوتی ہیں لیکن اسمیں شک نہیں کہ ایک ہی زمانہ کے مختلف شعراء پر ان چیزوں کا اثر اکثر مختلف ہوتا ہے اور مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ دو ہمعصر شعراء کا کلام متضاد اوصاف کا حامل ہو اور دونوں کا رنگ بالکل جداگانہ ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر عام تجربات و حالات کو اپنی ذات پر منعکس کر کے اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان حالات کے بیان میں خود اس کی شخصیت رونما ہو جاتی ہے، لیکن اگر ذرا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان دو مختلف رنگ رکھنے والے ہمعصر شاعروں میں ایک چیز ضرور مشترک ہوگی اور وہ چیز ماحول کا اثر ہے۔ ہماری زبان کی شاعری میں اس کی بہترین مثال جیسا کہ میں نے نقد الادب میں عرض کیا ہے میر تقی میر، میرزا سودا اور میر درد کے کلام سے ملتی ہے، گو یہ تینوں اہلِ کمال ایک ہی زمانہ میں تھے اور تینوں نے ایک ہی قسم کے حالات میں زندگی بسر کی لیکن ذرا گہرے مطالعہ سے یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ ان تینوں نے اپنے ماحول اور اپنے زمانے کے واقعات اور حالات سے اپنی طبعی خصوصیات کے مطابق مختلف اثر قبول کیا، ہندوستان کی تاریخ کا یہ نہایت تاریک دور تھا مغلوں کی سلطنت دم توڑ رہی تھی، طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، نادر خاں کے حملے روہیلوں کی تاخت و تاراج، مرہٹوں کی لوٹ مار فرنگیوں کی روز افزوں سطوت و جبروت کا شور یہ سب چیزیں امن و آشتی اور اطمینان قلب اور سکون خاطر کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی تھیں، ہر طرف تباہی و بربادی کے آثار نمایاں تھے، حساس اور گداختہ دل میر ان مصائب و آلام کو دیکھ دیکھ کر بے اختیار روتے ہیں اور رُلاتے ہیں، سودا اپنے دل پر میر سے زیادہ قابو رکھتے ہیں لیکن صرف اس حد تک کہ ان کی آنکھوں سے اشک جاری نہیں ہوتے بلکہ ان کے دل کا درد زہر خند میں تبدیل ہو جاتا ہے، وہ اپنے زمانہ کے لوگوں کی حالت پر ہنستے ہیں مگر ان کی طعن آمیز نظروں اور ان کے متبسم لبوں کے پیچھے ایک درد بھرا دل نظر آتا ہے جو اپنے ماحول اور اپنے ارد گرد کے حالات پر آنسو بہا رہا ہے، لیکن میر درد ان دونوں سے جداگانہ طریقہ پر ان الم انگیز واقعات سے اثر پذیر ہوتے ہیں، وہ دہلی کے برباد ہونے پر میر تقی اور سودا کی طرح ترک وطن اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کے بجائے ترک دنیا کو اولیٰ سمجھتے ہیں، وہ عارف ہیں، خدا شناس ہیں، درویش ہیں اس قسم کے واقعات و حالات کا اثر ان کو اور زیادہ خدا کی مصلحت اور اس کی رضا پر قناعت کے لئے مجبور کرتا ہے اور وہ عزلت گزینی اختیار

کر لیتے ہیں اور فانی چیزوں سے دلبستگی اور ان پر تکیہ کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں، قناعت، صبر، تحمل اور خودداری کے درس دیتے ہیں؛

کسی زبان کی شاعری میں مختلف ادوار کا قیام بھی ہر دور کے مخصوص ماحول کی بنا پر ہوتا ہے، اس لئے شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنے سے پہلے جس دور کا وہ شاعر ہے اس دور کے مخصوص ماحول کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اس شاعر کے کلام پر صحیح رائے قایم نہیں کی جاسکتی،

اس گفتگو سے نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف ادوار کے شعراء میں خواہ اور کسی حیثیت سے کوئی خاص فرق ہو یا نہ ہو لیکن .... جہاں تک ماحول کے اثر کا تعلق ہے ان میں ضرور نمایاں فرق ہوگا اور جو محاسن یا معایب کسی مخصوص ماحول کے اثر نے اس ماحول میں زندگی بسر کرنے والے شعراء کے کلام میں پیدا کر دئے ہیں وہی محاسن یا معایب دوسرے دور کے شعراء میں تلاش کرنا تنقید کے اِس اہم ترین اُصول کو نظر انداز کر دینا ہے۔

اُردو شاعری کو جب دہلی میں عروج ہوا تو وہ زمانہ سلطنت مغلیہ کے زوال کا تھا، نادر شاہ کا حملہ، احمد شاہ درّانی کی غارت گری، مرہٹوں کی لوٹ مار یہ چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور دہلی کے پریشان حال باشندوں کو تباہ و برباد کر دیا ظاہر ہے کہ ان المناک واقعات کا اثر لوگوں پر بہت حزن انگیز ہوا ہوگا اور شاعر تو شدید الحس ہوتا ہی ہے، یہی سبب ہے کہ دہلی کے اُس دور کے شعراء کا کلام بہت ہی یاس انگیز اور درد خیز ہے۔ ماحول کا اثر اسی کا متقاضی تھا، خصوصاً میر تقی میر جن کو اس دور کی ادبی جدوجہد کا قافلہ سالار کہنا چاہئے اپنے زمانہ کے واقعات سے اس درجہ متاثر ہوئے ہیں کہ بعض اوقات تغزل کے رنگ میں سیاسی اور تمدنی واقعات اور ان کے اثرات کی طرف صریحاً اشارے کرتے ہیں اور اس زمانہ کے واقعات کا ان پر اتنا اثر ہے کہ کہیں کہیں تو وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ میں غزل کہہ رہا ہوں اور یہ شعر جو میں نے کہا ہے غزل کے اشعار میں شامل نہ ہوگا، سُنئے:-

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ ... یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

کیا زمزمہ کروں ہوں خوشی تجھ سے ہمصفیر ... آیا جو میں چمن میں تو جاتی رہی بہار

شعر کے پردے میں میں نے غم سُنایا ہے بہت ... مرثیے نے دل کو میرے بھی رُلایا ہے بہت

ارض و سما کی پستی بلندی اب تو ہم کو برابر ہے ... یعنی نشیب و فراز جو دیکھے طبع ہوئی ہموار بہت

دل کی بربادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ ... جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

پھر پھر گیا ہے آ کر مُنھ تک جگر ہمارے گزرے ہیں جان و دل پر یاں اضطراب کیا کیا

اک آن اس زمانہ میں یہ دل نہ وا ہوا کیا جانئے کہ میرؔ زمانے کو کیا ہوا

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

پس دہلی کے سیاسی انقلابات نے ہماری زبان کی شاعری کے اس دور میں یاس انگیز اور درد خیز کیفیات پیدا کر دیں، حزن و ملال اور درد و غم کے بیان میں تاثیر ہوتی ہے، یہ چیزیں دل میں چبھتی ہیں، یہی سبب ہے کہ شعرائے دہلی کے کلام میں کچھ ایسا اثر ہے کہ دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

جب دہلی تباہ ہوگئی تو لوگ اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے وطن چھوڑ چھوڑ کر اطراف و اکناف ہند میں پھیلنے لگے، اس زمانہ میں مشہور اور مستند شعراء عموماً سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ ہوتے تھے یا ارکین دربار و عمائد و امراء ان کی پرورش کرتے تھے اس لئے دہلی کی تباہی کے بعد اگر کوئی خطہ ایسا تھا جہاں ہمارے شعراء کو قدر شناسی کی اُمید ہو سکتی تھی تو وہ لکھنؤ تھا، چنانچہ میر تقی میرؔ، سوداؔ، اور میر حسنؔ وغیرہ نے دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رُخ کیا اور اہلِ لکھنؤ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور امید سے زیادہ انکی قدر افزائی کی حکومتِ وقت کی طرف سے ان کی تنخواہیں مقرر ہوئیں، ان کو جاگیریں عطا کی گئیں اور شاہان اودھ نے اور ان کی دیکھا دیکھی امرائے دولت اور ارکین دربار نے ان کو اپنا مصاحب بنایا،

لکھنؤ میں اس وقت شعر و شاعری کا چرچا تھا، اول اول تو نو وارد شعرائے دہلی کا یہاں کی زبان اور خیالات پر بہت اثر پڑا، انکی تقلید اور ان کے قدم بہ قدم چلنے میں اگر کچھ بھی کامیابی ہو جاتی تھی تو اسکو باعث فخر سمجھا جاتا تھا چنانچہ خود آصف الدولہ کے کلام میں شعرائے دہلی کا اثر نمایاں ہے، ان کے کلام میں فطری جذبات اور کیفیات دلی کا بیان ہے اور شاید اس حیثیت سے وہ قدیم لکھنؤ اسکول کے تمام شعراء میں ممتاز ہیں کہ ان کا کلام تاثیر سے خالی نہیں ہے مصحفیؔ کے یہاں بھی میرؔ کی تقلید کا اثر نمایاں ہے لیکن اس کے بعد ہی جو دور شروع ہوا وہ یکسر تاثیر سے معرا تھا اور اس کے کارنامے سطحی اور مضحکہ خیز مضامین کے انبار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

یہ زمانہ سلطنت اودھ کے عروج کا زمانہ تھا، عیش و عشرت کا دور دورہ تھا، ہر طرف رنگ رنگ رلیاں تھیں، چہل پہل تھی بے فکری تھی ان چیزوں کا گہرا اثر لکھنؤ کے تمدن و معاشرت پر پڑا اور اس ماحول نے شعر و شاعری کو بہت متاثر کیا، چنانچہ فطری جذبات اور تخیل پر رعایت لفظی اور صنایع بدایع کو ترجیح دی گئی، تکلف اور تصنع کی بھرمار ہوگئی، سوقیانہ مضامین اور مبتذل الفاظ اور محاوروں سے غزلیں لبریز نظر آنے لگیں اور کنگھی چوٹی اور انگیا کرتی کے راگ بے تکلف مشاعروں میں الاپے جانے لگے۔

شیخ ناسخ فرماتے ہیں :-

اے پری تو نے جو پہنی ہے سُنہری انگیا آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھکو

دے دوپٹا تو اپنا ململ کا ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

استرا منھ پہ جو پھرنے نہیں دیتا ہے بجا محو دیندار سے کیونکر خط قرآں ہوتا

کس ادا سے تو نے شانہ اپنے بالوں میں کیا سر پہ ہر محبوب کے خط مانگ کا آرا ہوا
چشم بد دور آج کیا آتے نظر ہیں گال صاف سبزۂ خط کیا غزال چشم کا چارا ہوا

اس بے راہ روی کی بنیاد تو مصحفی اور انشار کے وقت ہی سے پڑ گئی تھی لیکن اصل میں قدیم لکھنؤ اسکول آتش و ناسخ کے وقت قایم ہوا جس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ اس دور کے شعراء کا کلام بے اثر اور بے کیف ہے، اس کو واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ عشق و محبت کو آوارگی اور فسق و فجور کا مرادف بنا کر پیش کرتا ہے، اس دور کے کلام میں متانت اور ثقاہت کے بجائے ابتذال پیدا ہو گیا ہے اور معاملہ بندی نے اُسے "بازاریت" کی حد تک پہونچا دیا ہے۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس دور کے شعراء نے زبان کی کوئی خدمت نہیں کی، انھوں نے زبان کی اصلاح کی، اس کو حشو و زوائد سے پاک کیا اور زبان کو وسعت دی گو ایک زندہ زبان کی اصلاح زمانہ کی ضروریات خود کرتی جاتی ہیں، اُسوقت زمانہ کا اقتضا یہی تھا کہ کوئی نہ کوئی ناسخ پیدا ہو، اگر اس کام کو ناسخ نہ انجام دیتے تو کوئی اور انجام دیتا، بہرطور لکھنؤ اسکول کا مقصد بظاہر شعرائے لکھنؤ کو دہلی کی تقلید سے آزاد کرنا تھا اور ناسخ اور ان کے متبعین نے اس مقصد کو کما حقہ پورا کیا، زبان میں جو اصلاحیں انھوں نے کیں اُنکو زبان نے قبول کر لیا یہاں تک اہل دہلی بھی ان اصلاحوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

آخری تاجدار اودھ سلطان واجد علی شاہ اختر کے وقت تک لکھنؤ اسکول کے رنگ میں کوئی فرق نہیں آیا لیکن اس کے بعد ہی سے ماحول میں تبدیلی ہونا شروع ہو گئی انقلاب سلطنت نے لکھنؤ کی دنیا ہی بدلدی، نہ وہ رنگ رلیاں رہیں، نہ وہ تعیش کے سامان رہے، نہ وہ بے فکری اور بے خودی رہی، ہزاروں گھر تباہ و برباد ہو گئے، طرز بود و ماند میں فرق آنے لگا، تمدن و معاشرت نے دوسرا رنگ اختیار کرنا شروع کیا، اقتصادی مشکلات قدم قدم پر دامن گیر ہونے لگیں، آخر رفتہ رفتہ ان سب باتوں کا اثر لٹریچر میں بھی نمودار ہوا سطحی اور خارجی مضامین کی جگہ قلبی واردات اور داخلی مضامین نظم ہونے لگے، ہوتے ہوتے یہ جدید رنگ پختگی اختیار کرتا گیا

یہاں تک کہ آج لکھنؤ کا تغزل جس رفعت اور بلندی پر ہے وہ اس سے پہلے اُردو تغزل کو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

ہماری شاعری کا قدیم لکھنؤ اسکول جب انتہائی عروج پر تھا تو اسی دور کے چند خوش فکر اور قادر الکلام شعراء نے تغزل کے بازاری اور مبتذل مضامین سے اکتا کر جولانی طبع کے لئے ایک اور میدان تلاش کر لیا جس نے اُردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا، ضمیر اور خلیق اور ان کے بعد انیس اور دبیر کا مرثیہ کی طرف رجوع لانا فنی حیثیت سے نتیجہ تھا اسوقت کے پست تغزل کے رد عمل کا، اور اس میں شبہ نہیں کہ انیس نے مرثیہ گوئی کی بدولت اُردو زبان کے خزانہ کو انمول جواہر سے مالامال کر دیا، حقیقت یہ ہے کہ حالی اور آزاد نے نہیں بلکہ میر انیس نے جدید اُردو شاعری کا نہ صرف سنگ بنیاد نصب کیا بلکہ اس پر ایسی عمارت تعمیر کر دی جس کا جواب باوجود موجودہ وسائل ترقی کے ہم آج تک پیش نہ کر سکے، انیس نے مرثیہ کو معراج کمال پر پہونچا دیا اور مسدس کو اُردو شاعری کی وقیع ترین صنف بنا دیا جذبات کی صحیح ترجمانی، واقعہ نگاری کا کمال، تخئیل کی نزاکت، تشبیہوں اور استعاروں کا اعتدال، سلاست و روانی، فصاحت و دلآویزی یہ سب چیزیں میر صاحب کے کلام میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں، انیس ہی کا کلام ہے جس کے بھروسہ پر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہماری زبان نے بھی دنیا کے گنجینۂ خیالات میں اضافہ کیا ہے۔

ہمارے تمدن و معاشرت میں جو تبدیلی مغربی تعلیم و تربیت سے ظہور میں آئی اس کا اثر ہمارے لٹریچر کی سطر سطر میں نظر آتا ہے، چنانچہ لٹریچر کے اور اصناف کی طرح ہماری غزل بھی اس سے اثر پذیر ہوئی، ایجادات و اختراعات نے، ضروریات زندگی کی فراوانی نے اور علم کی ترویج نے خیالات میں بے انتہا وسعت پیدا کر دی ہے اور یہ وسعت محض لکھنؤ اور دہلی تک محدود نہیں ہے بلکہ سارا ملک اس سے مستفید ہوا ہے اور جہاں جہاں اُردو ادبیات سے ذوق رکھنے والے موجود ہیں ان سب کے ذوق کی تربیت ایک ہی قسم کے ماحول میں ہو رہی ہے اور موجودہ تعلیم و تربیت اور کلچر نے یکرنگی پیدا کر دی ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ ہماری زبان کی شاعری نہ صرف لکھنؤ اور دہلی میں بلکہ قریب قریب ہر جگہ جہاں اُردو زبان رائج ہے یکساں طور پر موجودہ تہذیب کا اثر قبول کر رہی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ لکھنؤ اور دہلی زبان کے مراکز ہیں، ان مقامات کے ذرہ ذرہ میں زبان کے نشو و نما کے اثرات موجود ہیں اس لئے موجودہ تہذیب اور موجودہ کلچر کا اثر یہاں کچھ قدیم ایشیائی تہذیب میں سمویا ہوا بھی ہے اور ذرا گہرا بھی ہے،

لیکن جہاں تک شاعرانہ ذوق کی تربیت کا سوال ہے لکھنؤ اور دہلی میں کافی فرق ہے، لکھنؤ کی فضا میں شعریت ہے، یہاں کے باشندوں کی گفتار میں رفتار میں، آواز میں رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے طریقوں میں شاعرانہ کیفیت موجود ہے، یہ چیزیں یہاں فطری ہیں وہبی ہیں، قدرتی ہیں جو ایک دہلی کیا شاید ہندوستان کے کسی اور خطہ کو نصیب نہیں۔ زمانۂ حال کا دہلی ایک بڑی تجارتی منڈی میں تبدیل ہو گیا ہے، اس پر کچھ عجب قسم کی "کارخانہ داریت" غالب ہے اور وہاں کی فضا میں کچھ کرختگی سی، کچھ ثقل سا، کچھ گرانی سی معلوم ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ وہاں کوئی ایسا شاعر موجود نہیں ہے جو مقبول ہو۔

لیکن لکھنؤ میں آج کل بھی چند ایسے شعراء موجود ہیں جن کا کلام جب تک زبان باقی رہے گی اس کے ساتھ باقی رہے گا، صفی، عزیز، آرزو، اور اب سے کچھ مدت پہلے کے ثاقب یہ لوگ نہ صرف لکھنؤ کے لئے بلکہ اُردو زبان کے لئے مایۂ صد ناز و افتخار ہیں، اور پھر نوجوان طبقہ کے شعراء میں حکیم آشفتہ نواب جعفر علی خاں اثر، سید آل رضا، قدیر، سراج اور منظر وغیرہ نہایت خوش فکر اور خوش گو شعراء میں سے ہیں۔

لکھنؤ کی شاعری بالکل بدل گئی ہے لیکن عجب یہ ہے کہ یہاں کی شاعری پر اعتراضات کی نوعیت وہی ہے جو ناسخ اور ان کے متبعین کے کلام پر تھی، حالانکہ اب وہ ماحول نہیں اور آج سے نہیں بلکہ علی میاں کامل اور تعشق کے زمانہ ہی سے لکھنؤ کی غزل میں داخلی مضامین کی کثرت نظر آتی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ لکھنؤ کی موجودہ شاعری عیوب سے یکسر پاک ہے بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم لکھنؤ کی شاعری پر رائے قائم کرتے وقت قدیم لکھنؤ اسکول کو نظر میں رکھتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ خود موجودہ لکھنؤ اُس اسکول کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اسوقت لکھنؤ میں غزل نے جو رفعت حاصل کرلی ہے وہ ہندوستان کے کسی اور شہر میں اسے نصیب نہیں ہے، یہاں کے کسی مشاعرے میں شرکت فرمائیے تو آپ کو غزل کے اکثر اشعار کے وہ وہ مصرعوں میں تخیل کا اعجاز نظر آئے گا، فطری جذبات کے نازک سے نازک خاکے، واردات قلبیہ کی سچی اور بے عیب تصویریں، زبان کا لوچ اور الفاظ کی موسیقیت یہ سب چیزیں کچھ اس رنگ سے پیش نظر ہوں گی کہ آپ کو حیرت ہونے لگے گی اور آپ مسرت خیز استعجاب کے اثر میں یہ سوچتے ہوئے وہاں سے آئیں گے کہ ہماری زبان میں کس قدر وسعت پیدا ہو گئی ہے کہ خیال کے نازک سے نازک پہلو کو بھی نمایاں سے نمایاں تر انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

حامد اللہ افسر

عہد بعہد اُردو زبان و شاعری کا ارتقاء

شہاب الدین غوری (سنہ ۱۱۹۳ء)　چند کوئی شاعر ۔ عربی، فارسی کے الفاظ اپنے دوہوں میں استعمال کیے ہیں
جیسے محل، پیغام، زمان، سلام وغیرہ

ناصر الدین محمود خلجی سے غیاث الدین تغلق تک (سنہ ۱۲۵۳ء ۔ سنہ ۱۳۲۵ء)
امیر خسرو (سنہ ۱۲۴۳ء ۔ سنہ ۱۳۲۵ء)

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
چو تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

بابر (سنہ ۱۵۲۶ء ۔ سنہ ۱۵۳۰ء)

بابر نے خود، روٹی، پانی، موتی، مجکا (مجھکو) کچ (کچھ) کے الفاظ استعمال کیے

سکندر لودی ۱۴۵۵ء / ۸۶۱ھ — ۱۴۹۹ء / ۹۰۶ھ　کبیر داس شاعر

دین گوایو دُنی سے اور دنی نہ آیا ہاتھ
پیر کہاڑی ماریو کا یہل اپنے ہاتھ
کبیر سر پر سراٹے ہے کیوں سوئے سکھ چین
کوچ نگارا سانس کا باجت ہو دن رین

گرو نانک شاعر

سانس ماس سب جیو تمہارا تو ہے کھرا پیارا
نانک شاعر ایو کہتا ہے سچے پروردگارا

شیر شاہ سور (۱۵۴۰ - ۱۵۴۵ء)

ملک محمد جائسی (پدماوت)

بین بھوڑ جھاڑ جو بارا
سرگ پتار بھیو اندھیارا

اکبر (۱۵۵۶ - ۱۶۰۵ء)

تلسی داس جی
مایا کو مایا ملے کر کر لبے ہاتھ
تلسی داس گریب کو کوئی نہ پوچھے بات

سور داس جی
سنت سبھی جانت ہوں تو نہ آیو باج (بار)

جہانگیر (۱۶۰۵ - ۱۶۲۷ء / ۱۰۱۴ - ۱۰۳۷ھ)

ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۷۹ - ۱۶۲۶ء)

سلطان محمد قلی (۱۵۸۰ - ۱۶۱۱ء)

پیا ہوں حضرت کے ہت آب کوثر :: تو شاہاں اپر مجھ کلس بنایا

سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۲ - ۱۶۲۶ء)

پیا سانولا من ہمارا بھلایا :: نزاکت عجب سبز رنگ میں دکھایا

خاکی ــــــ تھانی ہو اپنے من میں اتنوہی سر سجن :: تجھ پیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

نوری ــــــ ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد :: بیچارہ نوری نہ کرے ہی نہ ڈر رہے

غواصی ــــــ طوطی نامۂ نخشبی کو نظم کیا اور مثنوی سیف الملوک لکھی۔

شاہجہاں ۱۶۲۸ - ۱۶۶۶ء / ۱۰۳۷ - ۱۰۷۶ھ

سلطان عبداللہ قطب شاہی ۱۰۳۵ - ۱۰۸۳ھ
اے پری پیکر ترا مکھ آفتاب :: دیکھتا ہوں تو رہی نا مجھ میں تاب

نصرتی (عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی محمد عادل شاہ ۱۵۷۹ - ۱۶۶۰ء)
مثنوی گلشن عشق، علی نامہ

ابن نشاطی (عبداللہ قطب شاہ ۱۰۳۵ - ۱۰۸۳ء)
مثنوی پھول بن

اورنگ زیب ۱۶۵۷ - ۱۷۰۷ء
۱۰۶۸ - ۱۱۱۹ھ

ابوالحسن تاناشاہ دکنی ۱۰۸۳ - ۱۰۹۸ھ
۱۶۷۲ - ۱۶۸۷ء

کس در کموں کاں جاؤں میں مجھ دل پہ بجن بجھراٹے
اک بات کہئے ہوں گے سجن یاں جی ہی بارہ باٹے

ہاشمی بیجاپوری (انتقال ۱۱۰۹ھ)

مثنوی یوسف زلیخا، دیوان ریختی

بیچارہ دکنی

پی سے جدا ہونا نہ تھا چاہا خدا کا یوں ہوا
جز صبر کچھ چارہ نہیں بیچارہ ہور رہنا پڑا

خوشنود دکنی

سب رین جاگے سیج پر تو بھی سجن آیا نہیں
چھپ چھپ کے دیکھی باٹ میں درشن کو دکھلایا نہیں

سعدی دکنی

ہمنا تمن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
تم یہ کیا ہم وہ کیا ایسی بھلی یہ ریت ہے

عزیز اللہ دکنی

مجھ ناتواں میں کیا سکت جو بولوں لیاں کی صفت
عاجز عزیز اللہ پر دکھن کے سب پیران مرد

غوثی دکنی

تیغ بھواں سے کن کہا گھائل بکو کر د
پلکاں کے یا خنجر ستی بسمل بکو کر د

قادر دکنی ہرچند ہمن سب اٹھایا ہے اتھ　ابر بھی نزا آزاد کہاں رے بیہات
عالم منے ہر ایک یہ کہتا ہو گا　دکھن میں قادر اچھوں قید حیات

لطفی دکنی

تجھ عشق کی اگن سے شعلہ ہو جل اٹھا جی
دل موم کے نمونے گل گل پگھل گیا ہے

ملک دکنی

تن من فدا کروں اس ہشیار ساقی اوپر
یک قطرہ مے چکھا کر جن بے خبر کیا ہے

مہر علی دکنی

موتی دریا میں اپسکے تھیں کاں اگر دھوویں
کر تمن کے وہ بنا گوش کے ہمسر ہوویں

اورنگ زیب ۱۰۶۸ - ۱۱۱۹ھ / ۱۶۵۷ - ۱۷۰۷ء

ہاشم دکنی

دکھن اور ہند دلبر ہمن سوں بیجاب اتھے
کر کھڑے چاند سے پر جن کے پیچ و تاب اتھے

ہاتف دکنی

تُمری انکھیاں اور زلف سے کافر ہوا سارا جہاں
اسلام اور تقوی کہاں زہد اور مسلمانی کدھر

شاہی دکنی

(ندیم تانا شاہ)

ملنا تمہن کا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ نہ کہے
کس کس کا منہ موندوں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

مرزا دکنی

(ندیم تانا شاہ)

عارض ہیں چندر کا ترے گال سوں اچھا
سمجھیں ہمن کلف کو نہ تجھ خال سوں اچھا

فطرت موسوی

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پری ہے
در خانہ آئینہ گتا جھوم پری ہے

نامی دکنی

اوراں ترے ہیں یار ہمن ہیں ترے غلام
اوراں کے ساتھ نامی کو شامل نکو کرو

نوری دکنی (شجاع الدین) (اتالیق و وزیر زادہ تانا شاہ)

نوری اپس کے دل کی کسی سے نہ کہہ بتا
حاصل بھلا اب اس سے روانے جو تھا سو تھا

افضل دکنی

پری ہے گل میں میرے بیم پھانسی
مرن اپنا ہے اور لوگاں کو ہانسی

اوجی دکنی

درپن سیتی نگاہ کو مائل نکو کرو
یہ دکھ اپس کے واسطے حاصل نکو کرو

اورنگ زیب کا آخری عہد

بہادر شاہ	۱۷۰۷ — ۱۷۱۲ ع	۱۱۱۹ — ۱۱۲۴ ھ
جہاندار شاہ	۹ ماہ حکومت	
فرُّخ سیر	۱۷۱۳ — ۱۷۱۹ ع	۱۱۲۴ — ۱۱۳۱ ھ
محمد شاہ	۱۷۱۹ — ۱۷۴۸ ع	۱۱۳۱ — ۱۱۶۱ ھ
احمد شاہ	۱۷۴۸ — ۱۷۵۴ ع	۱۱۶۱ — ۱۱۶۷ ھ
عالمگیر ثانی	۱۷۵۴ — ۱۷۵۹ ع	۱۱۶۷ — ۱۱۷۳ ھ
شاہ عالم	۱۷۵۹ — ۱۸۰۶ ع	۱۱۷۳ — ۱۲۴۸ ھ

وَلی دکنی (۱۰۷۹ - ۱۱۵۵ھ) دربار دہلی گئے

پہلا دور

ترے بن مجھ کو اے ساجن تو گھر اور بار کیا کرنا
اگر تو نا اچھے مجھ کن تو یہ سنسار کیا کرنا

دوسرا دور

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن
باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

تیسرا دور

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اسکو
کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی

فقیر اللہ آزاد دکنی (فراقی دکنی کے ساتھ دہلی گئے)

کوئی کسی ہی فن میں مجھ سے تو بر نہ آیا
پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

احمد گجراتی

شب جھوٹے وعدوں پر جو ترے ہم بہک گئے
کوئی لاکھ بار گھر سے اُٹھے در تک گئے

سراج دکنی (شاگرد سید حمزہ علی دکنی) (انتقال ۱۱۷۷ھ)

نہیں ہے تاب مجھے تیرے سامنے جانا؛ کہاں سراج کہاں آفتاب عالمتاب

داؤد دکنی (انتقال ۱۱۶۸ھ)

اے زاہدا اُٹھاؤ جبیں کو زمین سے
جو سرنوشت ہے اسے کاں تک مٹاؤ گے

عُزلت دکنی (وفات ۱۱۸۹ھ) دہلی میں سیر کرنے گئے تھے (۱۱۶۴ھ)

بجز رفاقتِ تنہائی آسرا نہ رہا
سوائے بیکسی اب اور آشنا نہ رہا

شاہ مبارک آبرو

کریں جو بندگی ہو ویں گنہگار
بتاں کی کچھ نرالی ہے خدائی

اٹھ جیت کیوں جنوں ستی خاطر نجنت کی
آئی بہار تجھ کو خبر ہے بسنت کی

حاتم (۱۱۱۱ - ۱۱۹۶ھ)

جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک
تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک

مضمون

میرا پیغام وصل اے قاصد
کہیو سب سے اسے جدا کر کے

یکرنگ

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
میرا صبر و قرار جاتا ہے

اس قدر کیا ہے حکایت غیر کی
ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

فغاں (۱۱۸۶ وفات)

خط نہ بھیجو چھپا کے لے وہ اگر کہیں
لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

کیا حال پوچھتے ہو فغاں کا سنا نہیں
خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا

کلیم دہلوی

غرور حسن کیا ممکن کسی فریاد کو پہنچے
غرض تم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے

سودا (۱۱۲۵ - ۱۱۹۵ھ)

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

فکر معاش و عشق بتاں، یاد رفتگاں
دو دن کی زندگانی میں کیا کیا کرے کوئی

میر (۱۱۳۷ - ۱۲۲۵ھ)

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی
جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

درد (۱۱۱۹ھ)

خفا ہو گئے اے درد مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

سوز (۱۱۳۱ - ۱۲۱۳ھ)

اہل ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یارب راز دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

میں کس کے ہاتھ لکھ بھیجوں یہاں صاحب سلام اپنا
مجھے تو بھول جاتا ہے ترے دھڑکے سے نام اپنا

میرزا مظہر (۱۱۱۱ / ۱۱۹۵ھ)

لوگ کہتے ہیں موا مظہر بیکس افسوس
کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

الٰہی مت کسو کے پیش رنج انتظار آوے
ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

قائم (۱۲۱۰ھ وفات)

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائم
مرا کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

عشق تو قائم نہ ہوا آپ سے
اور رہی کچھ بیٹھ کیا چاہیے

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا آپ تجھ سے میں اور آپ من گیا

ضیا

میں نے کل پوچھا ضیا سے دل کو کیدھر کھو دیا
اس نے کوچے کو ترے بتلا کے ٹپ دے رو دیا

کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی اے ننگ خلق
اس کے کوچے میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

یقین

مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے
جی ہی لے کر چھوڑیگی آخر یہ بیماری مجھے

احسن اللہ بیان

مصلحت ترک عشق ہے ناصح
لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

تاباں

عجب احوال ہے تاباں کا تیرے
کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو ہوا سو ہوا
تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا

فراق

دل تھا منا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ
ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

حزیں

حال اے قاصد مرا جو کچھ کہ تو جاتا ہے دیکھ
اس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو

اثر

اثر کیجیے کیسا کدھر جائیے
مگر آپ ہی سے گذر جائیے

پہلے سو بار اِدھر اُدھر دیکھا
جب تجھے ڈر کے اک نظر دیکھا

ہدایت

بھلا ہتا تو مری جان کچھ ہدایت نے
تمہارے جور سے شکوہ کبھی کیا ہوگا
مگر یہی ناکہ بے اختیار ہو کے کبھی
کچھ اور بس نہ چلا ہوگا رو دیا ہوگا

حسن (۱۲۰۱ھ وفات)

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

کیا جانے اس کے جی پر کیا کچھ خیال گزرا
کچھ آپ ہی آپ اپنے دل پر ملال گزرا

افسوس

قفس سے چھٹنے کی امید ہی نہیں افسوس
حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہونچا

لطف

پاس ناموس محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع ساں سوز شب ہجراں زباں پر لائیں کیا

حسرت استاد جرأت (۱۲۱۷ھ وفات)

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اُنکا نام آیا تھا
تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا

شاہ عالم

اکبر شاہ ثانی ۱۸۰۶ - ۱۸۳۷ء / ۱۲۳۸ - ۱۲۵۳ھ

بہادر شاہ ظفر ۱۸۳۷ - ۱۸۵۷ء / ۱۲۵۳ - ۱۲۷۳ھ

رنگین (۱۱۷۱ - ۱۲۵۱ھ)

تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے
مجھ کو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے

نصیر (۱۲۵۴ھ وفات)

دیکھ لیتی جو اُٹھا کر تو ترے ٹوٹتے ہاتھ
لیلی اتنا تو نہ تھا پر وہ محمل بھاری

ممنون (۱۲۶۰ھ وفات)

دل میں کیا کیا ہوس عرض تمنا تھی مرے
تری چتون کا وہ ڈھب مانع تقریر رہا

مومن (۱۲۱۵ - ۱۲۶۸ھ)

جان نکلی وصل عدو ہیچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

ذوق (۱۲۰۴ - ۱۲۷۱ھ)

مجھ میں اس میں ربط ہے گویا بہ رنگ بوئے گل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

نسیم (۱۲۸۲ وفات)

برق نے اک طرز بیتابی مرا سیکھا تو کیا
سیکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطر ناشاد میں

غالب (۱۲۱۲ - ۱۲۸۵ھ)

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

ظہیر

بہت ظہیر کو ہم یاد کرکے داں روئے
کبھی جو ذکر حریفان بادہ خوار آیا

جرأت (۱۲۲۵ھ وفات)

ناصح میں اور ہم میں ہیں یہ طرفہ صحبتیں
ہم کچھ نہیں سمجھتے وہ سمجھائے جائے ہے

انشاء (۱۲۳۳ھ وفات)

غصہ میں ترے ہم نے عجب لطف اُٹھایا
اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

راسخ (۱۲۳۸ھ وفات)

ضبط گریہ تو ہے پر دل پہ جو اک چوٹ سی ہے
قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

رند (۱۲۴۰ھ وفات)

پھینک دوں دل کو ابھی چیر کے پہلو اپنا
تم پہ قابو نہیں اس پر تو ہے قابو اپنا

مصحفی (۱۲۴۰ھ وفات)

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

ناسخ (۱۲۵۴ھ وفات)

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

آتش (۱۲۶۳ھ وفات)

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ کر چلے گئے
میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

خواجہ وزیر (۱۲۷۰ھ وفات)

چلا ہے اے دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

صبا (۱۲۷۱ھ وفات)

دل میں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

آغا حجو شرف (۱۲۷۱ھ وفات)

ٹھہر گیا ہے لا کے جو منزل میں عشق کی
کیا جانے رہنما تھا کہ رہزن تھا، کون تھا؟

برق (۱۲۷۳ھ وفات)

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم، موسم گل آنے دو

رشک (۱۲۸۴ھ وفات)

محفل میں شمع چاند فلک پر چمن میں پھول
تصویر روئے انور جاناں کہاں نہیں

تسکین (۱۲۶۹ھ وفات)

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

شیفتہ (۱۲۲۱ھ - ۱۲۸۶ھ)

ایسی رغبت سے کیا قتل۔ گماں کا ہے کو تھا
شیفتہ اس کو تو لو۔ تم سے محبت نکلی

آزاد (۱۲۰۴ھ - ۱۲۸۵ھ)

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

ذکی (پیدائش ۱۸۳۹ء)

کس نے حیا سے نیچی نظر کی کہ ہو گیا
آساں نہ دیکھنا مجھے دشوار دیکھنا

امیر مینائی (۱۲۴۴ھ - ۱۳۱۸ھ)

مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے
آج بجلی گری کہیں نہ کہیں

حالی (۱۲۵۳ھ - ۱۳۳۳ھ)

عشق سنتے تھے جسے ہم یہ وہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

داغ (۱۲۴۶ھ - ۱۳۲۲ھ)

جھکی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود حیا سے وہ آنکھ
گری ہی پڑتی ہے بیمار ناتواں کی طرح

انور (زمانہ نامعلوم)

بدمستیوں کا رنگ ہے جوش شباب میں
گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں

ہر دور کے قابل ذکر شعراء

متقدمین		متوسطین		متاخرین		دور حاضر
دور اول	دور ثانی	دور اول	دور دوم	دور اول	دور ثانی	
ابراہیم عادل شاہ ثانی	ولی	سودا ۔ میر	مصحفی	شاہ نصیر	اسیر	مضطر خیرآبادی (مرحوم)
سلطان محمد قلی	آزاد	درد ۔ سوز	انشا	ناسخ	امیر	حسرت موہانی
سلطان محمد قطب شاہ	احمد گجراتی	قایم ضیا	راسخ	آتش	داغ	جلیل مانکپوری
عبداللہ قطب شاہ	سراج	یقین بیان	جرأت	ذوق	تسلیم	حفیظ جونپوری
خاکی ۔ نوری	داؤد	حزیں تاباں	حسن	مومن	جلال	آرزو ۔ صفی
غواصی ۔ نصرتی	عزلت	اثر فراق	رنگین	غالب	منیر	عزیز، اثر، ثاقب،
ابن نشاطی ۔ تانا شاہ	شاہ مبارک آبرو	ہدایت ۔ حسرت	ہوس	رشک	ظہیر	محشر، آسی، افسر،
بیجارہ ۔ سعدی ۔ خوشنود	ممنون		لطف	تسلیم	سالک	سیماب، سائل
عزیز اللہ ۔ غوثی	یکرنگ		افسوس	نظام رامپوری	ریاض	نوح، آغا شاعر
قادر ۔ لطفی ۔ ملک	کلیم		شہیدی	برق ۔ بحر	شاد	اصغر، جگر، فانی
مہر علی ۔ ہاشمی ۔ ہاتف	حاتم			شرف ۔ خلیل ۔ رند	نظم	آشفتہ، سراج
شاہی ۔ مرزا ۔ فطرت	فغاں			صبا ۔ وزیر ۔ شیفتہ	دبیر	ریاض (مرحوم)
نامی ۔ نوری (شجاع الدین)	میرزا مظہر			آزاد ۔ تسکین	انیس	امید امیٹھوی وغیرہ
افضل ۔ اوجی				ذکی ۔ حالی		

ہر دور کے مشہور یا بہترین شاعر

متقدمین		متوسطین		متاخرین	
دور اول	دور دوم	دور اول	دور دوم	دور اول	دور دوم
غواصی	ولی	سودا	مصحفی	ناسخ	امیر ۔ اسیر
ابن نشاطی	سراج	میر	جرأت	آتش	داغ
شاہی	ممنون	درد	حسرت	ذوق	تسلیم
بیچارہ	یکرنگ ۔ حاتم	سوز ۔ قائم	انشار ۔ ہوس	مومن ۔ غالب	جلال، ظہیر، سالک
	فغاں	یقین ۔ تاباں	راسخ ۔ رنگین	نسیم شیفتہ ۔ تسکین ۔ حالی	شاد عظیم آبادی
	میرزا مظہر	اثر ۔ حسرت	حسن ۔ افسوس	نظام رامپوری	

دور حاضر

حسرت موہانی ۔ مضطر خیرآبادی (مرحوم) جلیل مانکپوری ۔ ریاض خیرآبادی (مرحوم) ۔ آرزو ۔ صفی ۔ عزیز ۔ اثر ۔ آسی ۔ سیماب ۔ اصغر ۔ جگر ۔ فانی

ہر دور میں چوٹی کا ایک ایک غزلگو شاعر

متقدمین		متوسطین		متاخرین	
دور اول	دور دوم	دور اول	دور دوم	دور اول	دور دوم
غواصی	ولی	میر	مصحفی	مومن	داغ

دور حاضر

حسرت موہانی

نگار

جلد ۲۷ | فہرست مضامین جنوری سنہ ۱۹۳۵ء | شمارہ ۱

اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ	نیاز فتحپوری	۲
اُردو کی مشہور مثنویاں	امیر احمد علوی بی۔اے کاکوروی	۵۷
لکھنؤ کا نہایت مشہور شاعر جس نے صرف گیارہ شعر کہے	نیاز فتحپوری	۱۰۲
رنگ ناسخ کا منسوخ کرنے والا پہلا لکھنوی شاعر	نیاز فتحپوری	۱۰۳
شعراء دہلی پر لکھنؤ کا اثر	مرزا جعفر علی خاں اثر بی۔اے لکھنوی	۱۰۵
بہاری اسکول اور اُردو شاعری	عبد المالک آروی	۱۱۴
دکن اور اُردو شاعری	نصیر الدین ہاشمی بی۔اے	۱۲۵
تخلیق اردو (نظم)	ابو العلاء ناطق لکھنوی	۱۳۲
لکھنؤ کا پہلا جذبات نگار شاعر	نیاز فتحپوری	۱۳۷
لکھنؤ کے موجودہ لکھنوی شعراء	ع ۔ ا	۱۵۱
لکھنؤ کے موجودہ غیر لکھنوی شعراء	ع ۔ ا	۱۵۲
غزلگوئی پر عہد بعہد تبصرہ	نیاز فتحپوری	۱۵۳
لکھنؤ اور اصناف سخن	مشیر احمد علوی بی۔اے کاکوروی	۱۷۵
دہلی و لکھنؤ کے مشہور شعراء جو رامپور گئے	نیاز فتحپوری	۱۹۰
دہلی کے وہ شعراء جو لکھنؤ یا جوار لکھنؤ کی طرف گئے	نیاز فتحپوری	۱۹۲
اصلاح زبان اُردو اور لکھنؤ کی خدمات	نور الحسن نیر بی۔اے کاکوروی	۱۹۳
آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق	سید عاشق حسین سیماب اکبرآبادی	۲۰۳
مشہور شعراء جو اودھ یا لکھنؤ میں پیدا ہوئے یا یہاں انکا نشو و نما ہوا	نیاز فتحپوری	۲۰۷
لکھنؤ اور دہلی اسکول کے ریختی کہنے والے شاعر	سید تمکین کاظمی	۲۰۹
لکھنؤ کی شاعری	حامد اللہ افسر بی۔اے	۲۱۹
زبان و شاعری کا عہد بعہد ارتقار	نیاز فتحپوری	۲۲۵
ہر دور کے قابل ذکر شعراء	نیاز فتحپوری	۲۳۲
ہر دور کے بہترین یا مشہور شعراء اور ہر دور میں چوٹی کا ایک ایک غزلگو شاعر	نیاز فتحپوری	۲۳۵